وادیِ خیال
آزادی کے بعد اردو غزل اور نظم

سبز آتش

غلام گردش

مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

سہ ماہی

ترتیب • زبیر رضوی

ZEHNE JADID
C-2, AB Complex,
179/8, Zakir Nagar,
New Delhi - 110025 INDIA
Ph. 0091-11-26983804
e-mail: zehnejadid@gmail.com
Editor: Jamshed Jahan

PRICE: Rs. 40/= 5$ US
Sep. to Nov. 07
ISSUE 49 Vol XVII
Four Issues: Rs. 160/- 20$ US
Library Edition:Rs. 200/-
(For Four Issues)
R N 50779/90

مدیر • جمشید جہاں
جلد: ۱۷ شمارہ: ۴۹
ستمبر تا نومبر ۲۰۰۷ء
• قیمت
فی پرچہ • ۴۰/روپے
چار شمارے • ۱۶۰/روپے
لائبریریوں سے • ۲۰۰/روپے
(مجلد چار شمارے)
• بیرونی ممالک سے
فی پرچہ • پانچ ڈالر امریکی
چار شمارے • بیس ڈالر امریکی

• قانونی مشیر: سیّد کامران رضوی ایڈوکیٹ

• 'ذہنِ جدید' کے لیے بیرونِ ہند ترسیل زر اور رابطے:
• Dr. Bedar Bakht
21-Whiteleaf cresecent
Scarborough, ONTARIO
Canada MIV 3G1
e-mail:bbakht@rogers.com
• Dr. Khalid Razvi
11610 Peach Wood Lake,
Sugar Land, TEXAS 77478-7021
U.S.A
e-mail:razvi3@aol.com
• Dr. Fareha Razvi
535 Apt. No. 17, N23 street
Lincoln 68503 NE U.S.A.
e-mail: rfareha@yahoo.com

• کمپوزنگ و ڈیزائنگ • ذہنِ جدید
• ترسیل زر اور رجسٹرڈ ڈاک کے لیے پتہ:
C-2, AB Complex, 179/8, Zakir Nagar, New Delhi- 110025
• سادہ ڈاک کے لیے: پوسٹ بکس 9783، نیو فرینڈس کالونی نئی دہلی-۲۵

اڈیٹر پرنٹر، پبلشر جمشید جہاں نے جے کے آفسیٹ پریس جامع مسجد، دہلی-۶ میں چھپوا کر ذاکر نگر نئی دہلی-۲۵ سے شائع کیا

فہرست

سرورق پر ۲۰۰۷ء میں شائع ہونیوالی کچھ کتابوں کی ٹائٹل دئے گیے ہیں آپ کو بتانا ہے کہ ان کتابوں کے مصنف کون کون ہیں اور کس صنف ادب کی ہیں صحیح جواب پر ذہن جدید کے اگلے چار شمارے اعزازی دئے جائیں گے

اَلِف

● اردو زبان و ادب کے سلسلے میں جب بھی کوئی عوامی بحث یا مذاکرہ ہوتا ہے تو سب کا نزلہ سیاست دانوں پر گرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے اپنا یہ وطیرہ بنالیا ہے کہ جب بھی الیکشن قریب آتے ہیں تو 'غریبی' کی طرح 'اردو' کو بھی اپنے سیاسی ایجنڈے اور منشور کا وہ ایک حل طلب مسئلہ بنالیتی ہیں کہ اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں اردو بولنے والوں کے ووٹ کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں خاص طور سے ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے لیکن اقتدار میں آجانے کے بعد اپنے بہت سے 'ووٹ بنک' والے وعدوں کے ساتھ 'اردو' کو بھی سرد خانے میں ڈال دیتی ہیں لیکن اب مباحثوں اور مذاکروں میں وزیر اور حکام یہ کہنے لگے ہیں کہ اردو والوں کو صرف حکومت سے 'اردو' کے تحفظ اور بقا کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنی زبان کی بقا کے لیے آگے آکر خود بھی اپنی ذمہ داری نبا ہنی چاہیے یو پی اے کے ایک سینئر وزیر نے حکومت کے اس نقطہ نظر کی کہ اردو والے اپنی ذمہ داری بھی نباہیں ہم سے ایک گفتگو کے دوران یہ وضاحت کی "دیکھیے مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاریں کئی سطحوں پر اردو اداروں کی تشکیل کر کے اور ان کو بھرپور مالی فنڈ فراہم کر کے اردو زبان اور اس کے ادب کو ترقی اور فروغ دینے کے منصوبے بنانے اور انھیں عملی شکل دینے کا کام آزادانہ طور پر اردو والوں پر ہی چھوڑتی رہی ہیں" وزیر کا کہنا تھا "اپنی ذمہ داری نہ نبھا کر اور محض میٹنگوں میں اپنی خاموش حاضری درج کرا کے میٹنگوں میں شرکت کا بھتہ اور کرایہ جیب میں ڈال کر جو ممبران اپنی Term پوری کر کے منظر نامے سے غائب ہو جاتے ہیں اردو والے ان سے باز پرس کیوں نہیں کرتے؟" ہم نے کہا کہ ممبروں کی نامزدگی تو سرکار ہی کرتی ہے، جواب تھا "یہ سب کچھ بھی اردو کے ممتاز لوگوں سے پوچھ ہی کے کیا جاتا ہے متعلقہ وزیر تو تین چار نام ہی بڑھا پاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ حکومت ملک میں تسلیم شدہ 22 سے زائد زبانوں کے بہی خواہوں کا بائیو ڈیٹا کہاں تک رکھ سکتی ہے؟" ہمارے خیال میں وزیر مذکور نے ہم سب کے اردو کی تئیں نام نہاد اخلاص اور فکر مندی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے ہم اپنے شخصی تجربے اور مختلف اردو اداروں سے اپنی عملی وابستگی کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان سے تعلق رکھنے والے ہر ادارے میں ایسے نامزد ہونے والے اردو ممبروں، عہدہ داروں اور سربراہوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی ہے جو ہمہ وقت ملازمتوں کے بعد ان اداروں کو صرف اور صرف اپنے ذاتی فائدے اور ان کے بھرپور مالی وسائل کی چمک دمک کو للچائی نظروں ہی سے دیکھتے ہیں قارئین! ہماری بات یہیں ختم نہیں ہوئی تفصیلات کے لیے پچاسویں شمارے کے 'الف' کا انتظار کیجیے۔

● مرتب

لال قلعے کے مشاعرے میں تخلیقی شاعری کا قتل: زبیر رضوی

نئی دہلی، 3 فروری (پریس ریلیز)

لال قلعے کا مشاعرہ جمہوریت کے قیام کے سلسلے میں ہر سال منائی جانے والی قومی تقریبات کا حصہ رہا ہے اس سلسلے میں معروف ناقد و شاعر زبیر رضوی نے کہا کہ یہ مشاعرہ چار دہائیوں تک زیادہ تر تخلیقی شاعری کا نمونہ بنا رہا وجہ یہ تھی کہ جوش سے سلام تک سب نے اس کے ادبی معیار کو کسی سطحیت کی گرفت میں آنے نہیں دیا لیکن ادھر کے 10 برسوں میں یہ مشاعرہ بتدریج تخلیقی شاعری کی نمائندگی سے خالی ہوتا چلا گیا۔ لال قلعے کا تازہ مشاعرہ اس زوال کی تازہ مثال ہے۔ اس مشاعرے میں گنتی کے تخلیقی شاعروں کے سوا اکثریت ان شاعروں کی تھی جو مشاعروں کو ایک 'دھندہ' مانتے ہیں۔ اس وقت مشاعروں میں بے حد پسند کیے جانے والے تشاعروں کی فی مشاعرہ شرکت فیس 20 ہزار سے 30 ہزار روپے تک ہے اس بار کے لال قلعہ کے مشاعرے میں ان کی شرکت نے اسے زوال اور سطحیت کی انتہا کو چھونے والا مشاعرہ بنا دیا۔ اردو اکادمی نے حال ہی میں مشاعروں کے زوال پر ایک سیمنار کیا تھا۔ جس میں مشاعروں پر تشاعروں کی گھس پیٹھ پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد دو درجن سے زائد عورتوں اور لڑکیوں کو شاعرہ ہونے کی سند دے کر اکادمی کے اسٹیج پر لا کے بٹھا دیا گیا۔ لال قلعے کے مشاعرے میں بھی 50 مدعو شاعروں کے ہجوم میں اکثریت انہی کی تھی جو اردو بولنے والے مسلم معاشرے کے سامعین کو اپنا مخاطب بنا کر انہیں بنیاد پرستی کے جذبات میں بہا کر اور مذہبی تنگ نظری کو مرکزی تھیم بنا کر فلک شگاف داد و تحسین بٹور کر خود کو مشاعروں کی لازمی ضرورت بنائے رکھنے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت سے ان کی اردو دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ وہ لال قلعے کے مشاعرے کو اس کا حقیقی اور تخلیقی چہرہ واپس دلائیں۔ زبیر رضوی نے اردو زبان و ادب کے باشعور پرستاروں سے اپیل کی کہ وہ قومی مشاعروں میں جس کی ساری فنڈنگ دلی سرکار کرتی ہے زوال اور سطحیت سے بچانے کے لئے آواز اٹھائیں۔

(اردو اخباروں میں شائع ایک بیان)

لال قلعہ کے مشاعرے میں تخلیقی شاعری کا قتل: زبیر رضوی

ہندوستان ایکسپریس نیوز بیورو

نئی دہلی، 3 فروری: لال قلعے کا مشاعرہ جمہوریت کے قیام کے سلسلے میں ہر سال منائی جانے والی قومی تقریبات کا حصہ رہا ہے۔ یہ مشاعرہ چار دہائیوں تک زیادہ تر تخلیقی شاعری کا نمونہ بنا رہا، وجہ یہ تھی کہ جوش سے سلام تک سب نے اس کے ادبی معیار کو کسی سطحیت کی گرفت میں آنے نہیں دیا لیکن ادھر کے دس برسوں میں یہ مشاعرہ بتدریج تخلیقی شاعری کی نمائندگی سے خالی ہوتا چلا گیا۔ لال قلعے کا تازہ مشاعرہ اس زوال کی تازہ مثال ہے۔ یہ بات آج یہاں اپنے ایک بیان میں معروف شاعر زبیر رضوی نے کہی۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس مشاعرے میں گنتی کے تخلیقی شاعروں کے سوا اکثریت ان شاعروں کی تھی جو مشاعروں کو ایک 'دھندہ' مانتے ہیں۔ آپ کو شاید حیرت ہو کہ مشاعروں کے انعقاد پر سالانہ خرچ کی جانے والی کروڑ کی رقم کا اسی فیصد انہی تشاعروں اور شاعرات کی جیبوں میں چلا جاتا ہے اور غیر ملکی مشاعروں میں بھی بار بار یہی تشاعر اور تشاعرات مدعو ہو رہی ہیں۔ اس وقت مشاعروں میں بے حد پسند کئے جانے والے تشاعروں کی فی مشاعرہ شرکت کی فیس 20 ہزار سے 30 ہزار روپے تک ہے۔ اس بار کے لال قلعہ کے مشاعرے میں ان کی شرکت نے اسے زوال اور سطحیت کی انتہا کو چھونے والا مشاعرہ بنا دیا۔ جناب زبیر رضوی کہتے ہیں کہ اردو زبان و ادب سے نابلد اچھی صورت اور آواز کی حامل ایسی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد مشاعروں میں روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جنہیں ڈانس باروں میں کام کرنے کے مقابلے مشاعرے کا دولت اور شہرت دلانے والا "دھندہ" کرنے میں زیادہ عافیت نظر آتی ہے اردو اکادمی نے حال ہی میں مشاعروں کے زوال پر ایک سیمنار کیا تھا۔ سیمنار میں مشاعروں پر تشاعروں کی گھس پیٹھ پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد دو درجن سے زائد عورتوں اور لڑکیوں کو شاعرہ ہونے کی سند دے کر اکادمی کے اسٹیج پر لا کے بٹھا دیا گیا۔ لال قلعے کے مشاعرے میں بھی پچاس مدعو شاعروں کے ہجوم میں اکثریت انہی کی تھی جو اردو بولنے والے مسلم معاشرے کے سامعین کو اپنا مخاطب بنا کر انہیں بنیاد پرستی کے جذبات میں بہا کر اور مذہبی تنگ نظری کو مرکزی تھیم بنا کر فلک شگاف داد و تحسین بٹور کر خود کو مشاعروں کی لازمی ضرورت بنائے رکھنے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے تحریری بیان میں وزیر اعلیٰ شیلا دکشت سے ان کی اردو دوستی کا حوالہ دے کر مطالبہ کیا ہے کہ وہ لال قلعے کے مشاعرے کو اس کا حقیقی اور تخلیقی چہرہ واپس دلائیں۔ اسی کے ساتھ اردو زبان و ادب کے باشعور پرستاروں سے بھی اپیل کیا ہے کہ وہ ان قومی مشاعروں کو جس کی ساری فنڈنگ دلی سرکار کرتی ہے زوال اور سطحیت سے بچانے کے لئے آواز اٹھائیں۔

کچھ الگ سے جنسی افسانے

● ذہن جدید کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اس میں "باز خواں" کے خیال سے کبھی کبھی ہم ایسا پچھلا ادب بھی شائع کرتے رہتے ہیں جس کا کسی نہ کسی پہلو سے آج کے قارئین کے حافظوں میں چمکانا ضروری ہوجاتا ہے ناریل کی چٹائیوں پر بیٹھے ہم اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں تو ماسٹر صاحب یاد آتے ہیں جو اگلا سبق پڑھانے سے پہلے پچھلے سبق کو دہرانے کی ہدایت بھی دیتے تھے یوں پچھلا اور اگلا سبق امتحان آنے تک ہونٹوں پر ازبر ہونے کے لیے دمکتا چمکتا رہتا تھا منٹو نمبر کی ترتیب کے دنوں میں ہمیں یاد آیا کہ منٹو نے جس بدنام گلی سے اپنے بہت سے افسانوں کا خمار اور خمیر حاصل کیا تھا اسے تو ہمارے افسانہ نگار نہ جانے کب سے کسی چٹخارے کے بغیر ایک جداگانہ ذائقے کے طور پر اپنے قاری کے سامنے خاموشی سے پیش کرتے رہتے ہیں اس بار ہم نے کچھ ایسی ہی کہانیاں آپ کے مطالعے کے لیے چنی ہیں جو منٹو کے افسانوں کی دنیا سے مختلف ماحول اور فضا کی زائیدہ ہیں ان کہانیوں نے کبھی لاہور کی ہیرا منڈی، حیدر آباد کی محبوب کی مہندی اور بنارس کی دال منڈی اور لکھنو کے چوک کے کوٹھوں پر آنکھ کھولی تو کبھی یہ ارباب نشاط کے ان معروف کوٹھوں سے کہیں دور کسی آباد بستی میں رفیقوں اور دلداروں کے درمیان رقابتی معرکہ آرائیوں کے درمیان ہنستی بولتی اور لہولہان ہوتی رہی تھیں یہ دنیا بدن فروشی سے کہیں زیادہ ایک ایسی مصلحت اور باہمی مصالحت کی دنیا تھی کہ کبھی اس میں کوئی دراڑ نہ پڑتی اور کبھی اسے کوئی موجِ رقابت غرقاب بھی کرجاتی یہ افسانے اپنے تھیم اور برتاؤ میں ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں ہر افسانے کے کردار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور واقعات کا تانا بانا بھی معاشرتی سطح پر نئے انسانی رشتوں کی پرتیں کھولتا ہے آپ یہ افسانے پڑھتے ہوئے محسوس کرینگے کہ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کی آنچ زیادہ ہے آج یوروپ کو جن جنسی مسائل اور ان کی مختلف صورتوں کا سامنا ہے۔ بہت پہلے ہندوستان اس کے کئی ماڈل اپنے فیوڈل معاشرے میں دیکھ چکا تھا ان افسانوں کا زیادہ تر لوکیشن پاکستان کے وہ علاقے ہیں جہاں ہم جنسی اپنی کئی صورتوں میں پنپتی رہی تھی اس سے مختلف فضا کے افسانے جتک اور کلیانی ہم نے یہاں شامل نہیں کیے کہ یہ سارے افسانے ایک الگ دنیا کے افسانے ہیں افسانے کی بُنت اور اس کی زبان پر افسانہ نگار کی گرفت غضب کی ہے ان افسانوں کے یہ پہلو ایسی خوبی والے ہیں جو اس قبیل کے نئے افسانوی ادب میں بڑی حد تک مفقود ہیں۔

کچھ الگ سے ان جنسی افسانوں میں ہمارے آج کے اُن افسانہ نگاروں کے لیے بہت کچھ ایسا ہے، جو جنسی رشتوں اور روابط کو لذتیت کی بھٹی میں جھونک کر اپنی انگلیاں جلاتے رہتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان افسانوں پر نئے لوگ تجزیاتی مضمون لکھیں، بہترین مضمون پر ذہن جدید چھ سو روپے پیش کرے گا اور ذہن جدید کے اگلے چار شمارے اعزازی دیے جائینگے ہمیں مضمون کا انتظار رہے گا۔

● مرتب

گلاب دین چٹھی رساں

آغا بابر

• پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدل گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا "گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے۔؟"

"بھئی اس کی بدلی ہیرا منڈی ہو گئی ہے۔"

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا "سوں رب دی؟"

اکرم بولا "سوں رب دی" اور اس نے بھانڈ کی چپڑ اس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔" گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمہ ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اس کے ایماء سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلاد النبی کے موقعے پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دین دار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا، طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا، بی بی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کا خط دے، جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہوں گے، جن کا مضمون صرف بدکاری ہو گا۔ کسی خط میں ماں کی ممتا نہ ہو گی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہو گا، ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہو گا اور باپ کی نگاہوں میں بے غیرتی، بے شرمی، بے حیائی۔۔۔۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا "گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟"

سپروائزر بولا "آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا، کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے، داڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ وہ شاید تازہ وضو کر کے دعا مانگ کر آیا تھا۔

"کیا بات ہے، گلاب دین؟"

"جی، میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے۔۔۔۔"

"تو پھر"

"جی، ذرا خیال فرمائیے میں پانچ وقت کا نمازی پرہیزگار آدمی ہوں۔ میری بڑی بے عزتی ہو گی۔"

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خاکی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا "حضور، جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کے خط کو تقسیم کرے گا؟ استغفر اللہ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ جناب! میری گذارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ کو ہاتھ سے گھماتے ہوئے کہا "تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟"

"آپ کے بچے جیتے رہیں۔ یہی کمترین کا مطلب تھا۔"

"سردست یہ مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھے لیتے ہیں مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔"

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین دونوں چھٹی رساں، پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا "مولوی گلاب دین آ۔ ادھر سے شروع کریں" وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا۔ "یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ ادھر سب گانے والیاں رہتی ہیں۔"

پھاٹک کے سامنے چارپائی پر بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مکان کے پختہ تجاوز پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔ دوپٹہ نہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ۔۔۔۔۔ اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا۔

"کل سے میری جگہ یہ چھٹیاں تقسیم کیا کریں گے۔"

"ہیں! نیا چٹھی رساں لگ گیا؟"۔۔۔۔۔ "جی ہاں"

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو پٹاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا، پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی۔ دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چڈوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا۔ اس کی

پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا۔

''منشی ہوراں کا نام کیا ہے؟'' نوجوان چھوکرے نے پوچھا۔

سراج نے جواب دیا'' گلاب دین''

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا'' رانجھا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا۔''

''وے شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا۔'' تجاوز پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کٹہرے پر اٹھا کر رکھا تھا، جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔

''ادب بی بی، اپنی شلوار جا کے سیو پہلے۔''

اس نے اپنا پاؤں کٹہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی'' فٹے منھ، بے شرما''

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا'' سگریٹ پیو، مولبی جی۔''

گلاب دین بولا'' جی نہیں۔ مہربانی۔''

سراج نے سگریٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

''یہ مونچھوں والا کون ہے؟''

''اس گلی کا چودھری۔''

''اور لچر سا چھوکرا؟''

''یہ بلو کے چاچے کا لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی۔ ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے اور اوپر چوبارے میں گگ رہتی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا، جس کے سرنامے پر لکھا تھا، زمرد سلطانہ عرف گگ۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آپہنچے۔ بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا'' چٹھی لے لو جی۔'' ایک ٹھگنی سی عورت نے آکر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا'' بی بی جی، کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔''

''اچھا منشی'' اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی ''گگ جی، چٹھی آئی ہے۔''

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تا کہ وہ لچر سا لڑکا پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا ہی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا 'یہ نکا پان والا ہے۔ شہابے کی دکان ہے۔ شہابے کی پان ساری ہیرا منڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے، دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سویا ہوا ہوگا۔ شام کو بیٹھے گا۔ پان سگریٹ کی دکانیں دلالی کے

اڈے ہیں۔ مولوی جی۔"

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

"بازار میں یہ لوگ جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں، یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوں کو پھر چھانٹا "اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑنے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا "اس گلی جانا ضروری ہے؟"

"صرف ایک خط ہے"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"کس کا؟"

"کنجروں کے چودھری حاقو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی داڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

"کدھر ماشٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھریو! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کئے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو، چوری کھانی ہے؟"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی "منشی جی ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟"

دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے، سینہ اکڑائے، ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی "یاراں پٹنی، اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماش بین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماش بین، جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے، اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا، پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماش بینوں کے ریلے میں ایک داڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس کے ماتھے پر ہار لپٹا ہوا تھا اور پھر

کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں داڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش! اس کی نون تیل کی دکان ہوتی، آرام سے بیٹھ کر دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''کیوں منشی جی، تھک گئے؟''

''نہیں تو'' ۔۔۔۔۔۔ ''بس یہ دو چٹھیاں اور بانٹنی ہیں۔'' یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے، کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سامنے لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ زمین پر چوکی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لہسن چھیل رہی تھی۔ سراج نے دین کے کان میں کہا 'یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدرالنساء کا نام لکھا تھا نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا ''خط آیا جی۔''

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لئے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔

بدرالنساء خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں دو بھاری بھر کم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا ''لو استاد ہوری بھی آ گئے۔ منشی جی! استاد نورالدین کی چٹھی دیکھنا۔''

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدرالنساء خوشی سے چلائی ''آپا کے کاکی ہوئی''۔ دونوں لڑکیاں بدرالنساء کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نورالدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''او جیوانو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔''

برآمدے میں لگی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی ''استاد جی! قمر کے کاکی ہوئی ہے۔''

''نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں! اماں جی۔''

''آپ کو بھی ہوں۔ اری لڑکیو چٹھی رساں کا منہ میٹھا کرو۔''

استاد بولا ''ایک چٹھی رساں نہیں دو ہیں۔''

سراج مسکرا کر بولا ''استاد جی! آپ بڑے جگتی ہیں۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں؟''

گلاب دین نے نورالدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دوسرا بھاری بھر

کم آدمی بولا ''آج آپ۔۔۔۔''

سراج نے کہا ''آج میرا آخری دن ہے۔کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔''

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آ کر دو روپے دیے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی ''بڑی قسمتوں والے ہو۔کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بوہنی کر چلے ہو۔''

بدرو بولی ''مسخریاں چھوڑو۔ استاد جی۔ باہر جا کے ابے ہوروں کو دیکھو اور کہو' گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔''

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان بھکو کا ہے۔ اس کے پیچھے وہ بیٹھک نظر آتی ہے وہ استاد نورالدین کی ہے۔ اسے بدرنگے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی مشتری کی بھی تھی۔''

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا ''ہاں''

''یہ گھر زہرہ و مشتری کا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لیے لیٹی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیض ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا' جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا ''چٹھی رساں آیا''

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی ''آ'' ۔۔۔۔۔۔۔ اسی طرح پھر کہے جا رہی تھی۔۔۔۔ ''جا'' ۔۔۔۔۔

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا ''بزرگو یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں' کل دوسرے کی جیب میں' پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔''

گلاب دین کو وہ نتھنی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلے سبق یہی دیا جا رہا تھا ۔۔۔ آ ۔۔۔۔۔ جا ۔۔۔۔۔ پھر' آ ۔۔۔۔۔۔۔ پھر' جا ۔۔۔۔۔۔۔ ''یہ اب کدھر کو؟'' گلاب دین سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں کس بھڑوے کا ڈر ہے۔ منشی جی؟ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر پائے۔؟''

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندھ آرہی تھی' جیسی بیف مارکیٹ سے آتی ہے۔ دورویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بیباکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کررہی تھیں۔

سراج بولا ''یہاں سب درڑ مال ہے۔ نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا ''منشی جی' فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔''

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا۔ جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے سے تماش بین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کررہے تھے۔ جس نے تہبند باندھ رکھا تھا' کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کر علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ ''یہ خانگی' ذات کی مسلن ہے۔''

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے بڑبڑا کر پوچھا ''ان خانگیوں کی کتنی تعداد ہوگی؟۔''

''کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انھیں' مولوی جی۔ یہ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔؟''۔۔۔۔۔۔۔''خوک'' گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔

ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے۔ ایک دوپہر، ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہیں دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس کردے گا۔ مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جس دن آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگالیا تھا۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھی۔ گاؤ تکیے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کے، باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی ''چٹھی رساں آیا۔''

گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اسے پکڑا دیے۔ اس کا باپ بولا ''آؤ منشی جی، آیاں نوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں، چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں۔ کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔''

گلاب دین بولا ''جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔''

''میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدرالنساء اور قدرالنساء ہے۔ تیسری قمرالنساء کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔''

قدر النساء چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی۔ ''ابا تو اس روز کا کی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے''

''بڑے مبارک قدم ہیں آپ منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر لکھ دیں۔'' اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا، بیٹھنے کے لئے جگہ خالی کر دی اور حقہ کی طرف موڑ کر نوکر سے کہنے لگا ''اوئے، منشی جی کے لیے لسی لا۔''

''جی نہیں تکلیف نہ کریں۔''

''تکلیف کس بات کی، بھئی۔ گھر کی لسی ہے۔''

''کوئی لویرا ہے؟''

''بھینس ہے، منشی جی۔''

بدر النساء بولی ''ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔''

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا ''ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔ بڑے خاندانی کنجر ہیں۔'' پھر اس نے قمر النساء کے نام منی آرڈر لکھنا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا ''یہ دو سو روپیہ تمہیں کا کی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمہاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں، جوں ہی، اچھی ہوئی، تمہیں ملنے آجائے گی۔''

لسی کے شکریے کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا ''کیا تکلیف ہے گھر میں''؟ چکر آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا، منشی جی۔''

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا ''منشی جی، جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہا کرے، بلا تکلف چلے آیا کریں۔''

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں، ان کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہر النساء کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہر النساء کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے نتھنی پہنے ہوئے مومی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا، اچھا کھاتا، اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ و مشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے، جسے افیون کھانے کی علت ہے، اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے، دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔

جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں، رات کو انہیں مکانوں کے دروازے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پر اسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دم تھکا ہوا تھا، پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی "جانی تجھے چٹھی رساں......"

"جانی کشتیے، تجھے چٹھی رساں......" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا "خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا "دیکھو، منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نہ کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو تچکریں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی "نی تیرا خصم غلاب دین آیا ئی"۔ مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کو پہلے ہی بڑا خیال ہے، منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے، وہ یہ کہ گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزارا کریں، کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا اسٹرانگل ہو کر رہنا چاہیے۔"

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا "میرا خیال ہے، رانا ہوری آئے ہیں۔"

بیٹھک میں خستہ صوفے پر، جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا، رانا صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا، گنجے سے کہو، منشی کو لسی پلائے''۔

بدرو بولی ''بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا، پھر پر اسرار طریقے سے آہستہ سے بولی۔

''آپ ابھی جائیں مت۔''

''وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ناپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آ کر رانا سے بولی ''اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔''

پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ''منشی جی کہتے ہیں، بھینس کا مالک کہتا ہے، لینا ہے دو دن میں آ کر اپنا مال لے جائیں۔''

باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا ''یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی، اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھیں ابا، نئی لے دو۔''

رانا مہین سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا ''تو لے لونا۔ کتنے میں دیتا ہے؟۔

''کیوں ابا جی، آٹھ سو مانگتا ہے؟''

''ہاں پتر''

''کل مجھ سے چیک لے لینا'' رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔

بدرو نے چونچلاپن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا ''اچھا منشی جی، آپ اب جائیں ڈوگر سے کہہ دیں، ابا جی آ کر بھینس لے جائیں گے۔''

بھینس؟ کیسی بھینس؟ وہ سوچنے لگا۔

اس نے باہر نکلتے ہی پٹواری سے پوچھا ''یہ رانا ہوری کون ہیں۔''

''جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا، اس کا منشی ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔ بھولے نہ بنو منشی جی، مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوگئی ہے۔ بڑا استر اگل آدمی ہے۔''

استر اگل کیا ہوتا ہے؟ سوچتا ہوا نوگزے کی قبر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی جبر کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرا اور مہرو گاؤ تکیوں پر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔

''چودھری ہوری ہیں گھر''؟

''نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟'' مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔

”تیری چٹھی کہاں سے آئے گی کشتیئے“ قدرو نے جھوٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی ”منشی جی کوئٹے کی سوغات لیتے جایئے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔“

بدرو نے ایک پھٹو میں سے چھ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیے، جو اس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں اڑس لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھی رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا ”منشی جی، دیگ چڑھی ہے ان کے گھر؟“ زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں نے نہیں دیکھی“ گلاب دین نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے توبڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چھٹی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا ہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن سے چہلیں کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے، ادھر بھینس کے چٹکی لے رہا ہے رانا استرا نگل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا، پٹواری کی دکان اس کے سامنے ہے، اسی سے تصدیق کرنی چاہیے۔

پٹواری بولا ”جو تم نے سنا ہے، ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لئے تیار تھا مگر بدرو کی ماں نہیں مانی۔“

گلاب دین نے پوچھا ”عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟“

”قیم تو سردائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا“ پٹواری مسکرا کر بولا ”جس کا مال اس کا گال، منشی جی۔“

خوبصورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جو [illegible] بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو اور قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا ”کسی روز آنا ہمارے

گھر جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لئے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ حق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی "شکر ہے آپ بھی آئے منشی جی۔"

"کوئی خط ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔"

"خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ ابا ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

"اب منشی جی، آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھالا۔"

مہرو نے حقہ لا کر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا "ہم قمرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ یتیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویز پیش کرتی تھیں۔ مہرو پکے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

"اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟"

قدرو نے کہا "ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی "ہم دن بھر کیا کام کریں اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لئے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا نا" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہرو تینوں بہنیں بجی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی "ابا جی ہم تو بلاوے دے آئے ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ چلی اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہرو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے اس کے ہمرکاب اس طرح تھی،

جیسے دھلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کا گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا "منشی جی، آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے، قدرو پتر؟"

قدرو نے کہا "بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید۔ کیوں ابا جی"

"کچھ نہیں پتر، منشی جی کو سگریٹ دو۔"

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی کے آگے کردی جس میں گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی۔ [illegible] آپ [illegible] ایک بانٹ کر رسید سے ادھر آ جائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑھ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کام سنبھال لیا۔ جاوتری، لونگ، دارچینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نور الدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔

بدرو اور سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ تکیے بچھا دیے۔ پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا "آپا بدرو، ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا "ہاں جیتے رہو، ٹھیک ہے۔"

"آپا سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی، یہ قدرو کو لے آیا اور بولا "بی بی، ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا "ٹھیک ہے۔"

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگریٹ لیے ہوئے، چھالیہ چباتیں، سرگوشیاں کرتیں، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گورے چہرے، سنولائے چہرے، بھرے سینے، پتلی کمریں، دلبری کی تمام ادائیں اور غمزدے، ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے کچھ جوان، کچھ سرشار، کچھ ادھیڑ والان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ شیرمال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے، اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگریٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور مجولے سنبھالنے لگا "پتا نہیں، اپنے چٹھی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نور الدین بولا "بی بی نے چاول دیے تھے۔"
برآمدے میں سے بدرو بولی "میں نے دیے تھے ابا جی۔"
"ہمارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔"
رات کو جب گلاب دین پہنچا، مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ گگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیردار قمیص پہن رکھی تھی، جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیض کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین چکی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈیلے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آجا کا سبق لے رہی تھی۔ آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلۂ جوالہ بنی ادھر سے ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دوپٹا نے باندھ رکھے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی، انار، پوپٹ، گولہ۔ لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آگئی تھیں جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدر رو ہونٹ میچ کر باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔
مہرو، مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کی دنبالہ دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آگئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی سی نتھنی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سرو قد لڑکی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو توس بنا کر سب کو آداب کیا۔
دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا "قیم جی یہ لڑکی کون ہے؟"
وہ اینڈتے ہوئے بولا "شمو، میری پھوپھی کی لڑکی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔"
گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔
سرِراہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگارنگ، ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے پھولوں کا گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خار، گل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے

سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آ بیٹھے، سب سے پہلے آئے ہوئے رم خوردہ مشتر کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا ''بدرو، بدرو''۔

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا، مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائچے سنبھالتی بیچ میں آ بیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا الہی! بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم۔ جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا ''کتنے کا ہے؟''

''دس کا''

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرو کے اعضا میں یہ لچکیلا پن کہاں سے اتر آ رہا ہے۔ اس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی۔ ایک نوٹ، دو نوٹ، تین، چار، پانچ......''

''یہ کون لوگ ہیں؟''

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا، پھر شمو نے، پھر خواجہ نے، پھر شمو نے۔ سب ہنسنے لگے۔

بدرو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھی بیٹھی۔ اب گگ جی سے فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنگالا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش میں آ کر گھنگرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتاوے دے دے کر کس کس حسن ادائیگی سے زاہد و محتسب کے چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے کمر کو لچکا دے دے کر میکدے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ بدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی ''گگ جی زندہ باد!''

ایک کونے سے آواز آئی ''ڈھولک'' بلو نے چونکتے ہو کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا کر بتایا، تیرا نیاز مند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی۔ مہرو نے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی، وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے، تھاپ دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے، پھر کمر پر ہاتھ رکھ ناچنے لگے۔ چک پھریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا ''شاباش'' !ٹھیک ہے۔'' ان صاحب نے قدرو کے گھنگرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ پڑا تھا۔ قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو بھینچ کر کلائی پر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھمکی۔ آنکھوں میں رس۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آ گئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پڑی سانس باقی نہ تھی۔ وہ مجسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی! یہ قدر وتھی۔ اس کے پاؤں تھے یا خط چھانٹنے کی خودکار مشین۔ بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا ، ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا۔ کہ عبدالکریم اس کے پاس گزرتے گزرتے کہہ گیا ''ابھی جانا مت۔''

رات بہت بیت چکی تھی۔ اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں، مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ کیا۔ وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نور کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سبکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ واہ ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر ایک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کی جھملاہٹ۔ ناک میں فیروزی کیل، ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کے بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی۔ ''پنجابی''۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور گگ نے کہا ''آپا فیروزاں۔''

فیروزاں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلیں پر زبان پھیر کر خنجر خونچکاں کو آب دی اور سڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے نگاہ پر ایک خاص تمکنت، وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہوگی۔

کسی نے کہا ''مرزا صاحباں'' اس نے اس کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا ''اچھا''

رات کے سناٹے میں اس کی کھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی اڑانے لگی جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں۔ صاحباں کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ نوٹ سمیٹتی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک نکہت بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے وسیع وعریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو گیا۔

اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دو پہر کو بانٹ دی، دو چٹھیاں جو اس طرف کی تھیں ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

''آؤ منشی جی، کیا حال ہے؟''

''میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔''

''برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں، اچھی رونق رہی منشی جی؟'' عبدالکریم نے کہا۔

''او جی رونق! کمال ہو گیا۔ گگ جی نے تو حد کر دی۔''

''ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا ہے اسے۔ لڑکیوں کے اپنے ہاتھ ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔

''پھر''؟

''پھر یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔''

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی ''جو اللہ کو منظور۔''

پندرہ روز تک تینوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا۔ منجھو کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استادوں نے بقچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے کی نے منہ میں سے نکال کر بولا ''تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سنا دو۔''

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں۔ جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرہ مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسے جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں۔ کچھ ابھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط آپ کی بیٹی بدرو۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں۔ صوفوں کے سپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں، وہ بھی ٹھیک کرا لیں بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوا لیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہرو پر ایک پٹھان عاشق ہو گیا ہے۔ آپ نتھ اتروائی اس سے جو مانگیں گے دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا یہ پردیس ہے آپ لاہور آ کر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے گا پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں۔ بولا، استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلا دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شربت وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے، غوطے

کھلائیں گے۔ مہرو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہر ابھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دیں تھیں۔

عبدالکریم نے چار ہزار کے بنک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیچی چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اجالا ہو گیا۔

لڑکیاں انیس کی صبح کو آ رہی تھیں اور انیس کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لیے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھیں۔

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا" گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے۔۔یہ ہر سال؟۔۔۔۔۔۔ بلا" پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا" یہ تمھاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو"

"حضور، میری اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے۔۔۔۔۔"

پوسٹ ماسٹر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا" کیا کہا؟"

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی، لمبی سی ٹھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا

●●●

کنجری

احمد ندیم قاسمی

● سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، گلے کی رگیں پھول رہی تھیں، جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن میں خارج ہو سکتا تھا۔ ''اماں'' وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا ''وہ برساتی نالے سے پرے محلے میں جو لڑکی رہتی تھی نا؟ بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے''۔ ''ہاں ہاں، ہاں ہاں'' بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ ''وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہو بہو ملتی ہے''۔ اس نے کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولھے کے پاس اُپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پر کیا۔۔۔۔ ''ہو بہو کہاں کہا تھا میں نے؟ ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت، چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے، پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ سبھاؤ کہاں اس میں''۔۔۔۔ بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔ ''بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے پردادے وا، لعنت اس کے باپ پر جو اسکول کے سوکھے سڑے، ٹوٹے، جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگ گئی؟۔۔۔۔'' بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولھے میں برابر پھونکیں مارے جا رہی تھی اور کڑوا رلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا سرور بولا ''اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑخ جائے''۔ اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی ''معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیگماں نے بھئی سرو، بیٹے ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے، ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں۔۔۔۔ ہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرور، کیسی تھمی میں تر تراتی خبر لائے تم۔۔۔ کیوں کمالاں بیٹی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟''

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولہے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا اور سرور نے مسکرا کر کہا "کچی ہے ابھی"۔۔۔۔ کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی "دال نا؟" اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے کھنکنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا "ہاں" وہ بولی "آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا"

یہ تراتی ہوئی خبر کمالاں کے لئے نئی نہیں تھی، اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اس قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انہیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی "پھر کیا ہوا بابا؟" اور سرور جواب میں کہتا "پھر کمال خاتون بیٹا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی، بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا۔ اماں کی قسم"۔۔۔۔ کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی، پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولہا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خاں گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکاندار تھا کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خاں نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنوئیں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خاں صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جنے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خاں صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے دیکھتے ہیں کہ خاں صاحب سہراب خاں پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوا اڑا دی۔ یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خاں کی نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔ "میں نے تاجی کو نواب زن مست خاں کی حویلی میں ناچتے ہوئے دیکھا ہے لوگو!" دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ "اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خاں صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری"۔

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا۔ "کنجری۔ کنجری" سہراب خاں کی دکان اجڑ گئی وہ دکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پانی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خاں صاحب سہراب خاں اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر اب برسوں

سے توبہ کر چکی ہے، اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں انھیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے، گاؤں میں تاجی نے کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پر امن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان یاریوں اور دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لئے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی، بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ لٹا لٹا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لئے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے، ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا، گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لئے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی اس کے ہتھے نہ چڑھی، آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ بولی "سرور بیٹے! وہ ہماری کمال خاتون زندہ ہوئی تو اب کے برس ہو گی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو۔۔۔۔" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی، تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلے بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک گنگناتے رہے اور کہتے رہے "پیڑ کا رخ غلط ہے تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑ سے ٹوٹ جاتا پیڑ کا رخ معین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ دیکھ سرور بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو قد کیسا سرو سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے، ہونٹ دیکھو لگتا ہے اللہ

نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں اور آنکھیں یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا اس میں اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی اور تمہارے سر کی قسم میں سمجھی کلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہو گئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔''

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا' اگر چہ مصلے پھٹ جانے کے بعد دوسرا مصلے مہیا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا ''تم نہیں جانتیں بیٹا۔ جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤ گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی پر اب تو نہیں کھیلتی نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنویں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھی۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی لاتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں میں ہی تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی، جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور اندھیرے میں تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی، سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔''

''بس اب چند مہینوں کی بات ہے!'' بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا ''یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس چند ہی مہینوں کی بات ہے تم بھی کمال کرتی ہو اماں ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں افیم بیچتا ہوں وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے۔ مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں اور اوڑھیں پہنیں۔ ویسے بھی دل کچھ ہولا یا سا رہتا ہے، سوچتا ہوں کمالو چکلے کے لائق نہیں، اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نو بہار میں۔''

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی ''ارے پگلے کہیں تو بھی تو مولوی نہیں بنا جا رہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی، ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کر یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہو گا۔ پگلا، آج کی افیم لا۔''

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کی چولہے پر رکھ کر پانی ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور یہ پانی اس روز ابلا جب کنویں پر جاتی ہوں کمالاں کو ایک کسان قادر نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا ''حسبی اللہ حسبی اللہ'' کمالاں

بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی ''اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ'' نوجوان مسکرا کر بولا ''میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربان'' کمالاں نے کڑک کر کہا ''تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا'' نوجوان ہنس کر بولا ''وہ تو مر چکی ہے پیارو'' کمالاں آپے سے باہر ہوگئی۔ قادر کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنویں کی جگت خالی ہوگئی۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں۔ قادر ایک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا ''آخر کنجری ہوناکنجری''۔۔۔۔۔وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہوگئی تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، گنگنکیں اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی۔ پہلے تو دیر تلک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی، حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ملتے ہی کافور ہوگیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا ''چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے سرور بیٹے'' تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی، کنویں پر جا کر گھر میں سنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نوعمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں ''آخر کنجری ہے ناکنجری'' یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی، بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ''ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا'' بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی ''اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بیٹا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے'' وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آ کر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی ''ذرا ادھر تو آنا سرور بیٹے، دیکھنا تو اپنے بیٹی کو، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی'' پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادر نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ ''تیرے نام پر لڑائی ہوگئی۔ قادر تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو نا؟ اری یہی ابرو فوجی۔ تو کمالاں کو گھمری سی آگئی اور اس کے بعد وہ

احساس جمال اور احساس محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کے اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی، افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہوگئی اور جمائیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت وشکل کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی تو کمی میں ترتراتی خبریں سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہوکر گھر آگئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انہوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو "رگی" میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا "چوٹ لگی ہے، تمہاری ہی قسم بیٹا، چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا یہ اتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آپاتا ہے آہاہا، لطف آگیا!" امیدوں کے پھول جنہوں نے اب تک سر نیہوڑا لیا تھا تروتازہ ہوکر سر بلند ہوگئے اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوگئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی، دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینک میں گم رہتی تھی یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی اور سرور موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں پر بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کی اسرار و رموز پر مغززنی کرتے سو جاتے۔ لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہ راست اور دوٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لئے کہتے، بس جال بچھاتے دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی، بعض وقت سرور تنگ آکر کہتا "اماں اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں، ایک بار شمشاد اور نوبہار اور امیر وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہوجائیں گے؟ مگر بڑھیا تاجی دوراندیشی سے کہتی "نہیں بیٹا! وہاں جاکر خود ہرن ہوگئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا، پک جانے دو، آپی ٹپکنے دو اور پھر تم پولس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودے کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی، آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ لے جائیں۔ بیٹھے بیٹھے نہ بیٹھے بیٹھے یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال، ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا

’’کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا۔‘‘

بڑھیا بولی ’’میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرور بیٹا خالی خالی سا آرہا ہے۔‘‘

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا ’’گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا، میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے، کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کر چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کر چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کر چلو، پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے، نظریں اٹھا کر چلا کرو، سو آج میں کلے جولاہے کے ہاں ایم پچ کر آرہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جو کھنڈر کی دیوار سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا ’’کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟‘‘ پر اماں! جھینپ چھپائے سے چھپتی تو نہ پیر بدنام ہوتی نہ سوتی۔ خیر جب میں نے واپس آکر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب مجھے جھوٹا قرار دیا میں نے پیرو دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو اکھٹے دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دکان پر الو بول گیا۔ سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے ’’اسے کل تک مرمت کر دو بھائی‘‘ اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوئی اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں، بڑے آئے یہی یاری لگانے والے چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور...... حرامزادے!‘‘

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کے ملنے سے کیا تکلیف ہوئی، وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے تا کہ گھر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا اور پھر۔۔۔۔۔۔۔

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا ’’جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں۔ ماں کی لاڈلے، دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا، دنیا بھر کے سامنے، مزا آیا نا عشق کرنے کا۔‘‘

’’دادی‘‘ کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور بابا دونوں ’’جی جی‘‘ کرتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی ’’آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟‘‘

بڑھیا اسے راہ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی ’’دیکھ بیٹی رانی۔۔۔ سن بات یہ۔۔۔‘‘

مگر سرور نے بات کاٹ دی ’’ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال

خاتون بیٹا کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟''

''کس سے؟'' کمالاں نے پوچھا۔

''کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو، ملوگی؟ سرور نے تن کر کہا۔

''خدا بھلا کرے!'' بڑھیا نے سرور کو داد دی ''کیا اسی سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات ہاں تو بتاؤ بیٹی جواب دو ملوگی!''

کمالاں تو جیسے طوفاں میں گھر گئی تھی چکرا گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی ''پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا!''

''ہاں ہاں۔ جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا'' بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

''بالکل۔۔۔۔۔۔ اچھا تو کون ہے وہ؟'' سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جاسکتی صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔ بولی ''اب ایسا تو کوئی نہیں۔''

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی ''حرامزادی''۔

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک دونوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی، آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرز عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا ''کیا بات ہے دادی؟''

''ارے بیٹا! کوئی خاص بات نہیں'' بڑھیا بولی ''جوانی کمبخت یاد آرہی ہے۔ ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر انہیں سرمہ بنا کر رکھ دوں۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی، تمہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آگئیں اسی لیے ذرا اداس ہو رہی ہوں۔''

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا تو ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا ''کیا بات ہے بابا؟''۔

''آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹا'' وہ بولا ''ذرا سی افیم تھی اسے ادھر ادھر کیا ہے۔ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے، افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں فاقوں مر جائیں گے بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ

تو نہیں پڑ گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی نیچ سمجھتے ہیں ہمیں، اس لئے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خوانخواہ"۔

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس کا بھی نہیں ہوا پر کیسا نچڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے کلے، کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنویں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا۔ نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی عبادت سے نصیب بدلتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارا میرا بابا!۔۔۔۔۔ وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی۔ اور شام کو کھانا کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا "اماں، اماں"

"دادی، دادی" کمالاں چلائی

"بیٹی، بیٹی بڑھیا کراہی درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کرو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی۔ قلنج لگتی ہے اے کسی سیانے کو بلواؤ۔ بیٹا کسی سیانے کو بلاؤ۔"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا "قلنج ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی بجاتے میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے۔۔۔۔۔ جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے پر جانے کہاں دیکھی ہے۔"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں۔"

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنوار ہے، میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے "جلدی سے یاد کر ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی۔"

اچانک بڑھیا بولی "سلطانے کے کھنڈر میں۔"

اور سرور نے تالی بجا دی "جیو اماں، کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لئے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کر دی۔

بڑھیا کراہی "تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی" "میں چلی جاؤں گی بابا" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا "دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے

کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اُگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی اگ رہی ہے۔ ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے"۔

"اچھا بابا میں بس پلک جھپکنے میں آئی"۔ کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی مگر صرف "ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آ رہی تھی۔ کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھسٹتے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے، خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکا یک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی "آ گئیں میری جان" چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ "میں جانتا تھا کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی اور آخر آج۔۔۔" کمالاں اتنی قوت سے جست سی لگا کر کوٹھری کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے، وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لحظہ بہ لحظہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آ جانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی اور کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا! اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور۔۔۔ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے، قادرے کے بس میں آ گئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چکی ہیں۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو مجبورات ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آ گئی جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالوے نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں

گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی، پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کمبخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی۔“

”پر بیٹا“ دادی نے کہا ”تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔“

کواڑوں کو جیسے کسی نے بھینچ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انہوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا ”بوٹی لائیں بیٹا؟“ ۔۔۔ کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی اور سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور باپ کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بیوقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب ادھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگ آتی۔ سونے کی کوشش کرتی، پھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی اور جب سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا ”سچ مچ کہ جھوٹ موٹ۔۔۔؟“

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولی ”تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا؟“

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا ”نہیں ماں! معاف کر دو تو کیا سچ مچ بیمار ہو؟“

بڑھیا نے کہا ”پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں چل رہی ہیں۔“

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا ”میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔“

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی، کافی دیر کے بعد وہ پکاری ”بیٹا کمال خاتون“۔

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

”بیٹا“ بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

”ایک پیالی چائے مل جائے گی؟ اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں ”اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟“ وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر

بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا" یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکہ نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے کہتا ہے دوا تم منگوا لو ٹیکہ میں لگا دوں گا تیس چالیس لگتے ہیں۔"

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکہ لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے، مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا، مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پٹخ پٹخ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو، اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا، خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال ادھر اُدھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ لگا دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لئے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی"۔۔۔۔ اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے، پگڑی بھدے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا، اور بھیڑا جیسے اسے مردے کے جاگ میں اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور پپوٹے ذرا سے اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورہ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں۔ "دادی" وہ چیخ کی حد تک چلائی "بابا" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز رہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی

پڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آ کر بیٹھ گیا۔ یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے جیسے پگھلی جارہی ہے۔ لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی۔۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا کہ دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں ''دادی'' وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا ''اٹھو میری بیٹی جاگو، آنکھیں کھولو اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟''

''میں ڈر گئی تھی بابا'' اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یاسین پڑھ رہے تھے، کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مودبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کی انگلیوں کو پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لیے کہا اور وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورہ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں موچیوں، جلاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں چپکے سے کوٹھری میں چلا گیا، خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھری میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''بابا''۔ ۔۔اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی، لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ ''بابا'' وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول ادھر ادھر دیکھا۔

''میں تو ڈر گئی تھی بابا'' کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئی بولی۔

''تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟'' سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی ''بابا''

سرور بے اختیار رونے لگا اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں میں گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''بیٹی! دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں!'' اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ ''میں بڑا ذلیل ہوں، کتا خبیث، کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ۔۔۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔'' پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ ''میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں کتنا کمینہ سچ مچ کا کنجر۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا بہلا کر تھپکتی تو کیا اب وہ یہ کیا کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی "تمھیں تو بخار ہے بابا!"

"ہاں بیٹی!" وہ بولا "ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔"

کمالاں سناٹے میں آگئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی گھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی "نہیں بابا تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمھیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں!" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا "نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں بچوں گا۔ پھر جینے پر حق ہوگا میرا۔"

کمالاں کے سوجے سوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انھیں بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

"بخش دو بیٹا" سرور نے چادر میں ہاتھ نکالے اور انھیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا، اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا سادہ سفوف تو لیتی آؤ۔۔۔ کہنا پسلی کا درد ہے، دونوں طرف ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب آدمی ہیں۔ جاؤ میری بیٹی!۔۔۔ پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ کر تو مسکرا کر۔"

کمالاں پھر مسکرائی "یوں" اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا "الٰہی تیرا شکر ہے۔"

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں پر جو مریض ٹیکا لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کرو سمجھیں؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس میں۔" ڈاکٹر بولا "پنسلین نام ہے۔ قصبے میں مل جائے گا۔"

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر بابا کے پاس بیٹھی رہی، سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے، سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر چارپائی پر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے تیسری خوراک لینے گئی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی، سرخ سرخ آنکھیں، اجڑے بال، خشک ہونٹ جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا۔ ''تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے'' وہ بڑے غصے سے بولا ''ٹیکا لاؤ ٹیکا سمجھیں؟ اب کے ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا'' اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا!'' وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی وہ پھر اس طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

''ٹیکا!'' سرور پھر سے ہنسا ''کہتا ہے ٹیکا لاؤ'' ڈاکٹر بنا پھرتا ہے، ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی دیکھو، میری طرف دیکھو میں مرنے والوں میں تھا نہیں۔''

''میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا'' کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا اور یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ ''تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو، ملتے ہی نہیں!''

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا ''تمہارے حکم کا انتظار تھا۔''

''تو پھر آج ملو'' وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

''کہاں''؟

''میرے گھر ہی میں'' پھر ذرا سا رک کر بولی ''دادی تو مر گئی ہے نا۔''

"کب آؤں؟"

"بس لوگ سوتے آجاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے بے دھڑک آنا، بابا بیمار ہے، بے ہوش پڑا ہے۔"

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے، ادھر کمالاں بھی اڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کر و بیٹی، ڈر لگتا ہے۔"

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دابنے لگی اور جب اس پر غنودگی سے چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھری میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کرلی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی اور لوگ سوتے تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آکر اس نے آہستہ سے کہا "کمالی" "ایں" !وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی "ارے تم آگئے" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"پانی" !سرور دوسرے کوٹھری میں رویا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا "اب چلیں پیاری!"

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی" سرور ادھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ "کل پھر ملیں گے میری جان!"

اور آخر کمالاں بولی "کل تو خیر ملیں گے پر آج کی اجرت کہاں ہے؟"

"اجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اجرت مانگتی ہے؟ عاشق کی اجرت مانگتی ہے شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا، کنجری!"

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

●●●

پُتلی جان

رحمان مذنب

● تالیوں کی گونج میں ایک گھر آباد ہوا دوسرا برباد ہوا۔

پتلی جان کا آنا تھا کہ جانی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ ذرا کشائش پیدا ہونے کو آئی تھی کہ پٹ بند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کہ آفت کا نیا پہاڑ سر پر آن گرا، غریب نے جو سنہرے خواب دیکھے کھنڈر ہوئے، جو سوچا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس کے چوبارے کا حال خستہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھوئیں کی کالونچ سے اتنی بھیانک ہو رہی تھیں جیسے چڑیلوں نے اپنی ننگی بانہیں پھیلا رکھی ہوں، دوسرے جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھیں۔ ان کے کڑاکے بول رہے تھے۔ پوری چھت سن رسیدگی کے باعث دم توڑ رہی تھی اور وہ جوانی ہی میں دم توڑنے لگا تھا لیکن امید کب اسے دم توڑنے دیتی تھی۔

جو حال چھت کا سو دیواروں اور فرش کا۔ ہر روز کنستر بھر پلستر جھڑتا۔ فرش کی ٹیپ تو ٹیپ اینٹیں تک اکھڑ چکی تھیں۔ اور اب جانی کی چولیں اکھڑ رہی تھیں۔ کمرا اچھا خاصا جو بچہ بن گیا تھا اور اسے دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی سوچتا کہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مروں، اس کے چوبارے کی مرمت ہونی والی تھی مستری مزدور سے بات کر لی تھی کچ کارے کا حساب لگا لیا تھا اینٹوں کا سودا کر لیا تھا کہ ہوا کا رخ پلٹ گیا۔ امید ہی نہ رہی کہ اس کے چوبارے کی بھی سنی جائے گی۔ پھر بھی جانی کی ہڈی کری تھی۔ ہمت ہارنے والا آسامی نہ تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پتلی جان کی شکل دیکھتے ہی زہر پھانک لیتا۔

جانی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے بکھرے بالوں میں اطمینان سے کنگھی پھیری اور پھر وہیں بیٹھ گیا اور ''سجن گھر آجا'' والا مخصوص گیت گانے لگ گیا۔ نیچے بازار میں چائے والے نے ریڈیو اونچا کر کے جانی کی آواز دبا دی لیکن جانی نے پروا نہ کی، وہ کسی کو سنانے کے لئے تھوڑی گا رہا تھا یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی جو دل سے دل تک تھی۔

حاجی تنکا بر کے بھرے رہنے سے جانی کا سہارا ٹوٹ ہی گیا۔ اس خود غرضی کی کوئی حد تھی؟ پتلی جان کا برابر کے چوبارے میں آنا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے نئے کپڑے پہن اور لپ سٹک لگا کر آرسی میں چھب دیکھی۔ چہرے پر گلاب کی ہلکی ہلکی رنگت تھی، لانبا قد، لانبا چہرہ، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس کا چوبارہ میلا اور خستہ نہ تھا۔ یہاں نئی دری بچھی تھی اس پر اجلی چاندنی تھی، پورے کمرے میں چمک دمک تھی، اجلاہٹ تھی اور وہ لمحہ کتنا فرحت انگیز تھا اور انمول تھا جب حاجی تنکا نے اچانک آ کر اس زور سے بھینچا کہ وہ چیخ کر رہ گیا، اس دن

حاجی تنکا نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا" جانی پیارے بیڑے کو کنگنی دی ہے۔ جی توڑ کر لڑے گا۔ تیری قسم! سب کو بھگل کر دے گا، ہمارے بٹیرے کی دنیا عاشق ہے بتا! تیری رضا کیا ہے؟"

پھر وہ بٹیر کو تو بھول گیا اور شراب کے گرد ہو گیا۔ دیسی کی پوری بوتل چڑھا گیا اس نے نشے میں آ کر جانی کا برا حال کر دیا۔ جیسے کسی نے نئی روئی دھنک کر رکھ دی ہو۔

جوانی میں تیز تیز سوئیاں چبھیں، دیر تک جانی کے بدن میں میٹھی میٹھی ٹیسیں اٹھتی رہیں، کوئی اسے تند اور جلادانہ وحشت سے نوچ لے تو وہ اف نہ کرے۔ اسے تو مزا ہی تب آئے، جب نرم نرم رگوں میں بیٹھے بیٹھے مگر تیکھے تیکھے کانٹے رینگنے لگیں لیکن کوئی اس کا اپنا ہے تبھی تو حاجی تنکا کا بٹیر بڑا جی دار نکلا، اس نے سب بٹیروں کو میدان سے بھگا دیا، جانی اس کا ہو گیا، فتح یابی کی خوشی میں چوبارے پر تمام رات گانا بجانا ہوتا اور شراب کا دور چلتا رہا، پھر نہایت وسیع پیمانے پر حرب وضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا، نہ دری رہی، نہ چاندنی رہی نہ چوبارے کا اجلاپن وہ شب بیداری، وہ گرم بازاری جاتی رہی، یہ سب کچھ ہوا تو جانی کی جان پر ہوا، اجڑا تو اس کا چوبارہ اجڑا۔ برابر والا چوبارہ رشک جنت بن گیا۔ اس سے جانی کے سینے پر سانپ نہ لوٹتے تو کیا ہوتا؟

برابر والے چوبارے کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ جب سے موتی شاہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڈہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا پڑا تھا۔ یوں تو جانی کا چوبارہ بھی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا تاہم یہ آس تھی کہ ایک نہ ایک دن مولا مشکل کشا کے یہاں اس کی سنی جائے گی بلکہ قریب قریب سنی ہو گئی تھی پھر جانے کس کی دعا کا الٹا اثر ہوا کہ جانی کا چوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا اور برابر والے چوبارے پر دھن برس پڑا۔ صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روز ہی ننگے پاؤں جاتا لیکن شاہ جی کی نظر چوک گئی اور دھوکے میں ہمسائے پر جا پڑی۔

موتی شاہ کا بوسیدہ چوبارہ پھر سے آباد ہو گیا۔ پنکی جان کے آنے سے جانی کا پتا تو کٹا لیکن اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا چڑھتے سورج کی پوجا نہ کرو پر اس کی نندا بھی نہ کرو! جانی کم از کم اس اصول کا قائل تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے چھاتی پر وہ پتھر رکھ لیا جس نے اس کا مکان ڈھایا تھا، اسے ڈھایا تھا۔ پنکی جان نے اس کے دن، اس کی راتیں چھین لیں۔

پنکی جان کے لیے تین دن کے اندر اندر پرانا چوبارہ نیا ہو گیا۔ بوسیدہ چھت ادھیڑ کر نئی چھت ڈالی گئی۔ پلستر ہوا ٹیپ ہوئی، سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ جانی نے جی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی مصالحہ جسے جانی کے چوبارے میں کھپنا تھا پنکی جان کے چوبارے میں لگا۔

ایک بار تو مستری بھولے سے تگاری تیشہ لیے جانی کے چوبارے پر ہی چڑھ آیا۔ پر جانی نے کولھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔" ہائے ہائے صابر سائیں ہمارا نہیں پنکی کا ہے۔ اس نے ہوا کا رخ پھیر دیا تو ادھر کیوں آیا ہے؟ مسالہ میرے ہی چوبارے کا ہے پر لگے گا برابر کے چوبارے میں۔ مستری تیرا بھلا ہو جہاں کی مٹی ہے اسے وہیں لگا! اب یہ اپنے یہاں نہیں لگے گی۔" اس نے ترتالے میں تالیاں مارتے مارتے کہا۔

مستری ہنس کر نیچے اتر آیا لیکن جانی دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ غم نہ تھا کہ اس کا چوبارہ مرمت سے رہ گیا اور پنکی جان کے چوبارے کی سنی گئی۔ اسے تو یہی غم کھانے لگا کہ پنکی جان نے اس کے چوبارے کی گہما گہمی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھر اجڑتا دیکھ سکتا تھا؟ جسے قہقہوں کی برکھا میں رہنے کا چسکا پڑا ہو وہ تنہائی میں کیسے رہے؟

حاجی تنکا نے یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے جانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا ہو حالانکہ دونوں کا نکاح پڑھا گیا تھا اور پھوپھی کرم بخش مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی بانٹی تھی۔ خلیفہ جی ابھی زندہ تھے۔ انہی کے ایما پر نکاح ہوا تھا لیکن حاجی تنکا اب کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو صاف صاف کہتا۔۔۔۔ ''نکاہ وکاہ کوئی چیز نہیں یونہی ڈھکوسلاہ ہے۔ من کا سودا ہے۔ وہار بیوپار ہے۔ جب تک موج آئی جانی سے یارانہ رکھ اور جب موج میری یارانہ توڑ دیا۔ کسی کا ٹھیکہ تو نہیں کہ یارانہ توڑ ہی نہیں۔

جانی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ حاجی تنکا نکاح کر کے مکر گیا۔ اس میں جانی کی بڑی بدنامی تھی کون اپنی بدنامی کو گوارا کرتا؟ اس کی تو ناک ہی کٹ گئی۔ برادری میں باتیں ہوئیں۔ ہستی مٹ گئی اس کی دو کوڑی کا نہ رہا۔ اب وہ لوگوں کی نظروں میں جچتا ہی نہ تھا۔ نیا یارانہ ہوتا اور ٹوٹ جاتا تو وہ اتنا اثر نہ لیتا، سبکی بھی نہ ہوتی ۔ پنکی جان نے جانی کے یار کو نہیں اس کے خصم کو ہتھیایا تھا اور اسے سب کی نظروں سے گرا کر خاک میں ملا دیا تھا جانی خلیفہ جی کے پاس جا کر رو بیٹھا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے محض اتنا کہا۔۔۔۔ '' جانی صبر کر! مولا مشکل کشا تیری سنے گا اور تجھ پر اپنا فضل کرے گے۔ تو راستی پر ہے۔ مولا مشکل کشا سچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔''

جانی نے صبر تو کر لیا پر وہ کبھی کبھی یہ ضرور سوچتا کہ خلیفہ جی پنکی جان کو منع کیوں نہیں کرتے کہ کسی کو رسوا اور ذلیل نہ کرے۔ قصور آخر پنکی جان کا بھی تو تھا لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ پنکی جان کو یہاں آئے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو وہ خلیفہ جی کی بڑائی کا قائل بھی نہ ہوا ہوگا۔ خلیفہ جی کا حکم تو اسی پر چل سکتا جو ان سے عقیدت رکھتا۔

جانی کا چوبارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ چوبارے کا سارا پلستر اور ملبہ اس کے اوپر آ گرا۔ سانس لینا اور جینا دوبھر ہو گیا۔ برابر والے چوبارے سے جب قہقہوں کا دھشتناک شور اٹھتا تو اسے بھالے لگتے اور سینہ چھلنی چھلنی ہو جاتا۔ اسکا چوبارہ دوزخ کا ایسا ٹکڑا بن گیا جہاں سب سے بڑا عذاب نازل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور جیتا رہا تو یہ اس کے حوصلے کی خوبی تھی۔

رزق خدا دیتا ہے۔ چنانچہ جانی بھی بھوکا نہیں رہا۔ سینے کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگی۔ خلیفہ جی سے مشورہ لیا اور باوفا منکوح کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوبارہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سے دکان پر جا بیٹھا۔ عذاب جہنم قدرے کم ہوا۔ پنکی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے آسمان پر جا پہنچا۔

عجیب اتفاق تھا۔ بازار کے جس حصے میں پتلی جان کا چوبارہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا ممکن ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں کبھی کوئی لیڈر پیدا نہ ہوا ہو البتہ لیڈروں کا ادھر گزر ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لیڈر اور مودی ممبر تو وہاں رات گذارنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے عارضی لیڈروں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لیڈر تھے سو انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت پر کبھی توجہ نہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے حالانکہ الیکشن کے دنوں میں ان کی توجہ ایک ایک اینٹ، ایک ایک کواڑ، ایک ایک کھڑکی، ایک ایک دکان، مکان اور چوبارے پر رہی۔ ووٹ کے سلسلے میں وہ نوٹ لیے لیے پھرے، بیسیوں بار خلیفہ جی اور پتلی جان سے ملے بلکہ ایک لیڈر نے تو ایسے سنہری موقع پر بیٹے کی ولادت کو غنیمت جانا اور بازار بھر کو پتلی جان کے ناچ گانے سے نوازا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نورے پہلوان کے اکھاڑے کو نکل جاتی اور دوسری طرف رنڈی بازار تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ درمیان میں فرلانگ بھر کا یہ بے نام ٹکڑا تھا جسے لوگ رفتہ رفتہ پتلی بازار کہنے لگے۔

جانی کو بجا طور پر رنج تھا وہ یہاں کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔ اسے تو حاجی تنکا نے گھر میں ڈال کر برباد کیا۔

پتلی بازار بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس نام ہی میں جادو کا اثر تھا۔ اگر اسے شیخ شریف کے نام سے موسوم کرتے جس کا علاقے کی تین چوتھائی جائداد پر قبضہ تھا صابر سائیں کے نام سے فائدہ اٹھاتے تب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند نہ لگتے جیسے اب لگے تھے۔ بازار آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ نہ کسی وزیر نے رسم افتتاح ادا کی نہ بورڈ چسپاں ہوا۔ نہ اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہو گئی۔

جو شوقین مزاج رنڈی بازار کی سیر کو آتے وہ پتلی بازار سے ہو کر جاتے، بڑے غور سے بازار کی جان کو دیکھتے اور قدرت کے ہنر کی داد دیتے۔ بعض تماش بین کچے بھی ہوتے جو ایسے گم ہوتے کہ پتلی بازار ہی ہو رہتے۔

ایک حاجی تنکا ہی نہیں پتلی جان پر سارا جہاں مرنے لگا۔ کون تھا جو ادھر سے گزرتا اور پتلی جان کا دیدار کئے بغیر چل دیتا۔ لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے جیسے وہ عالم بالا سے اتری ہوئی نعمت ہو اور اسے دیکھنے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہوں۔

پتلی جان کی رنگت ایسی تھی جیسے گورے پن اور سانولے پن نے بیاہ رچایا ہو جیسے صندل کے شربت میں مالٹے کا رس ملایا ہو۔ سارا بدن بے داغ تھا۔ پنڈلیاں اور بانہیں لادتی کانچ کی طرح صاف اور چکنی تھیں۔ ان پر ہاتھ یوں پھسلتے جیسے ریشمی کپڑوں پر گرم گرم استری۔ آنکھیں یوں مٹکتیں جیسے نور بھرے تالاب میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی ہوں، لمبی لمبی پلکیں بڑی بڑی آنکھوں پر سایہ ڈالے رہتیں۔ مکھڑا تھا کہ چاند پر شفق نکھری تھی۔ کلائی پر زنانہ گھڑی چمکتی رہتی۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگ جگمگ کرتیں۔ کانوں میں ٹاپس چمکتے۔ عید بقر عید پر وہ گلے میں سونے کا ہار ڈال لیتا۔

مولسری کے پھول اس کی جان تھے۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا اور سورج چتنے بانس چاہے اور چلا جائے وہ مولسری کے پھول چننے ضرور باغ میں جاتا۔ مولسری کے پیڑوں میں ایسی جاذبیت نہ تھی اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہ تھے لیکن خوشبو دلپذیر تھی۔ مٹھی میں سمیٹ کر انہیں سونگھتا تو یوں آنکھیں میچ لیتا جیسے جیسے بیٹھے بیٹھے، سنہری سنہری خواب اس کی سوچ میں گھل مل رہے ہوں، وہ ایسے انمول دیس میں کھو جاتا جہاں صرف کیف ہو، صرف لذت ہو، صرف مہک ہو۔

ملگجے ملگجے پھول اپنے اندر امنگوں کا طوفان سمیٹے رہتے چکی جان کے ہاتھ لگاتے ہی یہ بکھر جاتا۔

مولسری کے پھول کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ پھلیرے نے موتیا اور چنبیلی کے ساتھ مولسری کے پھول اور ہار بھی رکھنے شروع کر دیے۔ چکی جان حاجی تنکا کی دکان پر آکر بیٹھتا تو پھلیرا بھی آکر کھڑا ہو جاتا اور وہیں کھڑے کھڑے مولسری کے ہار بک جاتے۔ چکی بازار میں صرف مولسری کے ہار بکتے۔ انہیں ٹھکانے لگا کر پھلیرے کو رنڈی بازار کا رخ کرنا پڑتا۔ جہاں موتیے اور چنبیلی کے چٹی چاندنی جیسے ہار بکتے۔

جب کوئی قدر دان مولسری کا ہار خرید کر چکی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی تنکا کو بڑا تاؤ آتا لیکن وہ کیا کرتا؟ چکی جان نہ تو اس کی منکوح تھا اور نہ ہی وہ چکی جان کا بوجھ اٹھا سکتا جو دن میں دو دو بار کپڑے بدلتا اور ہر ہفتے ریشمی سوٹ سلواتا۔ پیرس سوپ کی ٹکیہ سے چھترے کو نہلاتا۔ تکیوں کے غلاف اور بستر پوش روز بدلواتا، نئی نئی قمیصیں، شلواریں اور دوپٹے اس بے تکلفی سے مہترانی کے حوالے کر دیتا جیسے دادا جی کی فاتحہ کے لیے، بہت بڑے حلوائی کی دکان مل گئی ہو۔۔۔۔ اسے حاجی تنکا کیونکر اپنے کھاتے میں ڈالتا۔ ادھر چکی جان ایک کے ہو جانے کی قباحتوں سے آگاہ تھا۔ جانی کا حال اسے معلوم تھا۔

جانی کا گزارہ بھی صبر و قناعت پر تھا اور حاجی تنکا کا بھی۔ دونوں کا مرض ایک نہ تھا لیکن علاج ایک ہی تھا۔ صبر و قناعت امرت دھارا ثابت ہوا۔

چکی جان جونہی بازار میں آتا سب کی نظریں اس کا خیر مقدم کرتیں۔ گاموں کی دکان کے پھلوں سے لدے پھندے چھپے اسے اپنی طرف بلاتے۔ ریڈ بلڈ مالٹے، سنگترے، سیب اور انار گاموں کی جانب سے خیر سگالی کا پیغام دیتے۔ سردیوں کے ایام میں انہی سے دکان کی بہار ہوتی۔ منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تو گاموں کی دکان پر چلا جاتا اور مالٹے سنگترے اٹھا کر چھیلنے لگتا۔ کبھی کبھی چھیلتے چھیلتے باریک سی پھوار اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور ایک دم آنکھیں میچ لیتا۔ گاموں جھٹ دھوتی کا پلو اٹھا کر آنکھیں پونچھ دیتا۔ چکی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور مالٹے سنگترے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔۔۔۔ چکی جان منہ کا ذائقہ بدل کر جانے لگتا تو گاموں اپنے ذائقہ بدلنے کی غرض سے اسے ٹھہرالیتا، پکڑ لیتا، اور تالی بجا بجا کر "یاری لائیں تے نبھائیں بجنا" گاتا۔

گاموں ہر موسم کا پھل لاتا۔ جب مالٹے سنگترے کم یابی کی وجہ سے صرف بیماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتا تب بھی وہ چکی جان کی خاطر ضرور لاتا۔ کبھی کیلے لاتا اور چکی جان انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے پھل کی

جانب ہاتھ بڑھاتا تو گاموں اس کی کلائی تھام کر بول اٹھتا۔ "سوہنیا! ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! مولا جانے بڑا شیریں ہے"۔۔۔۔۔ پھر بن پوچھے چھلکا اتارتا اور کیلا اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا کر کہتا۔۔۔
"شہزادیا! دکان تیری ہے، جو من میں آئے کھا لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔"

یہ درست ہے کہ کیلے لذیذ ہوتے، گھلے ہوئے، میٹھے اور خوشبودار لیکن پتلی جان ہمیشہ ان سے کتراتا مگر جتنا کتراتا گاموں اتنا ہی ستاتا آخر کیلے کھا کر ہی پتلی جان کی خلاصی ہوتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی جی میں کڑھتا ہے۔ کیلے کھانے کو اس کا بھی جی چاہتا لیکن گاموں اسے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھتا۔ تنہائی کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے ہولے ہولے تالی بجاتا اور گنگناتا۔

حاجی تنکا بھی جلتا۔ جانی کو دھتکار کر اس نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیوں نہ لگاتا؟ پتلی جان چیز ہی ایسی اونچی تھا۔

حاجی تنکا نے دکان کا جائزہ لیا۔ اس کی دکان پر تو پان سگریٹ ہی ملتے اور پتلی جان کا صرف انہی پر گزارہ نہ تھا۔ اسے گاموں کے مسکراتے، جگمگاتے، ہنستے بولتے پھلوں کے تازہ انبار اپنی طرف کھینچ لیتے۔ حاجی مجبور تھا۔ وہ پھل پھلاری کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا۔ ہاں پتلی جان کو خوش کرنے اور گاموں سے اس کا پیچھا چھڑوانے کی نیت سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ منڈی جا کر سستے داموں تھوڑا تھوڑا پھل لانے لگا۔ تھڑے پر جگہ بنا کر ٹوکرا جما دیتا۔ لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ تجربہ چنداں کامیاب نہ ہوا۔ گاموں کی دکان پر جو بہار تھی وہ یہاں کہاں؟ اور پھر پتلی جان کے انگ انگ میں دن بھر جوانی انگڑائیاں لیتی رہتی یہ مستیاں کب کل پڑنے دیتیں۔ انگڑائیاں ٹوٹتی ہی بھلی لگتیں۔ وہ انگڑائیاں لیے گاموں کی دکان پر گئے بغیر نہ رہتا۔

گاہک تو گاہک پتلی جان نے بھی حاجی تنکا کے پھلوں پر توجہ نہ دی۔ وہ مالٹے لائے تو پتلی جان سیب کھانے گاموں کی دکان پر جا پہنچے۔ وہ سیب لائے تو پتلی جان سردہ کھانے گاموں کے پاس چلا جائے۔

حاجی تنکا سمجھ گیا کہ پتلی جان کو صرف پھل ہی سے نہیں گاموں سے بھی رغبت ہے۔ جہاں تک اڈے کا تعلق تھا حاجی تنکا کی دکان سے بہتر بازار میں کوئی اڈہ نہ تھا۔ تھڑے کے ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ پتلی جان کی چوکی بچھ جائے۔ سر پر ایک تختے کے اوپر ریڈیو جما رکھا تھا۔ برابر میں نامی گرامی پہلوانوں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی تھیں۔ دکان کے وسط میں بجلی کا بلب آویزاں تھا۔ چوبارے سے اتر کر آتا۔ بیٹھنے کو جی چاہتا تو پتلی جان یہیں آ بیٹھتا۔ ایک تو یہاں نمائش ٹھیک سے ہوتی، دوسرے سب شوقین مزاج سہولت سے جمع ہو جاتے۔ کوئی تھڑے پر بیٹھ جاتا اور کوئی سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پان سگریٹ کا دور چلتا۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی لطیفے چلتے ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتیں اور گاہک پھنستے۔ گاہکوں کا موڈ بنانے میں یہ اڈہ اہم کردار ادا کرتا۔۔۔ اور کہیں یہ بات نہ تھی۔

گاموں کی دکان پتلی جان کا اڈہ بن سکتی تھی۔۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ اس روانی اور بے تکلفی سے تحول کرتا کہ اچھے اچھے کے منہ پھیر دیتا۔ پتلی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھتا تو گاہک بدک جاتے کسی کو اس

سے بالمشافہ گفتگو کرنے ہی نہ دیتا اور کسی کی پروا کیے بغیر اسے کھڑے کھڑے دوہرا کر کے اس کے آدھے بدن کو تھڑے پر ہی چت کر دیتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے بدن میں مچلتی ہوئی انگڑائیوں کو توڑ رہا ہو۔ بے چارے کے کپڑوں میں سلوٹ پڑ جاتے اور انہیں دھول لگ جاتی۔۔۔ پکی جان کو اس کا یہ جارحانہ انداز بھلا لگتا۔ لیکن وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرتا۔ تھوڑا سا پھل کھایا ذرا کی ذرا کے لیے گاموں کے پیار کا تختہ مشق بنا اور وہاں سے چل دیا۔

گاموں کی زبان گندی تھی اور طبیعت میں درندگی تھی۔ اس کی نسبت حاجی تنکا کی زبان میں مٹھاس اور شائستگی تھی وہ آدمی بھی نرم طبع تھا نہ تو مخول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ پکی جان کے گاہکوں کو بھگاتا۔ سچ پوچھو تو اس کی دکانداری پکی جان کی وجہ سے چمک اٹھی جسے پان سگریٹ کی عادت نہ تھی اسے بھی ان کا چسکا پڑ گیا۔ کوئی خود پیے نہ پیے۔ پکی جان کو تو پان کھلانے اور سگریٹ پلانے میں اپنی نجات ضرور سمجھتا۔ حاجی تنکا پکی جان کا احسان مند تھا اور اسی لیے اسے گاموں کی دکان پر جانے سے نہ روکتا۔ پکی جان کو کس کی محتاجی اور کس بات کی کمی تھی؟ حاجی تنکا ماتھے پر تیوری ڈالے تو وہ اٹھ کر جیجے کے قہوہ خانے میں چلا جائے اور پھر گاہک بھی وہاں پہنچ جائیں۔۔۔ ویسے بھی حاجی تنکا کا حساب آدھی رات کے بعد شروع ہوتا جب تماش بین اور استاد صاحبان رنڈیوں کے کوٹھوں پر سے اٹھ کر آتے اور نشے کی ٹوٹ میں اس سے رجوع کرتے تو وہ انہیں نمٹا کر ہی دکان بڑھاتا۔ یہی اس کے آخری گاہک ہوتے اس کے بعد وہ چوبارے پر جاتا اور پکی جان سے رجوع کرتا۔ پکی جان اس آخری اور مستقل گاہک کو نمٹانے میں بخل سے کام نہ لیتا۔

سورج نکلنے سے پہلے ابھی سارا پکی بازار بند ہوتا کہ جیجے کا قہوہ خانہ کھل جاتا لال لال کوئلوں کی گود میں دھری ہوئی کیتلیوں کی ٹونٹیوں سے بھاپ ناچتی ناچتی نکلتی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتلیوں کے اندر گدگدیاں اٹھتیں اور چائے کا تیز تیز فلیور پکی جان کو پاس بلاتا۔

جیجا چائے بناتا اور خوش الحانی کے ساتھ کبھی "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" کا ورد کرتا اور کبھی "پتلی کمریا، ترچھی نظریا" کی رٹ لگاتا۔

دن چڑھے پکی جان کی آنکھ کھلتی تو وہ انگڑائیاں لیتا لیتا کھڑکی میں آبیٹھتا۔ جیجا اسے دیکھتے ہی زور سے سیٹی بجاتا۔ پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے بلاتا۔ کچھ دیر تو پکی جان متوجہ ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لیے جاتا اور اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے حسن کی کمانیں چلہ چڑھا رہی ہوں کسی آتش فشاں سے قوس قزح ابھر رہی ہو۔ اس کے ساتھ اردگرد پھیلی ہوئی کائنات انگڑائیاں لینے لگتی۔ جوں جوں انگڑائیاں لیتا، نیند کا نشہ ٹوٹتا۔ ذرا ہوش آتا جیجے کی طرف دھیان دیتا۔ جیجا بند ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے لگاتے یا چائے بناتے بناتے مسکراتا اور کہتا۔۔۔۔ "میری جان! چوبارے کا کھیڑا چھوڑ ذرا ہمارے پاس آ! ہماری خاطر چائے کی ایک پیالی ہی پی لے!"

پکی جان کی بڑی بڑی آنکھیں دور سے نیم خوابیدہ ستارے کی طرح مستی میں کھوئی ہوئی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراحی دار گردن ہلا کر کہتا۔۔۔ "ہونہہ، جسے کلیجے میں آگ لگانی ہو وہ چائے ہے۔"

ادھر دولا حرامی بھی چپ نہ رہتا۔ پرانے سنیما کی سیڑھیوں پر جیجے کی چائے خانے کے عین سامنے
پتلی جان کے چوبارے سے ذرا دور اس کا سری پائے کا دیگچہ کھلا رہتا۔ پتلی جان کو دعوت دیتا۔ آنکھ مار کر
کہتا۔۔۔"پیارے ذرا ہم پر بھی نظر سوتی ہو گرما گرم مال ہے۔ مغز اور مکھن ملا دوں گا۔ آتو سہی۔ داتا جانے
جلوہ آجائے گا۔"

پھجا پھاڈی اپنے تھڑے پر کھڑا ہو کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی جیجے کے قہوہ خانے کو اور کبھی
دولے حرامی کے دیگچے کو دیکھتا۔ پھر دھوتی کے پلو اٹھا اٹھا کر پنکھا جھلنے لگتا۔ ساتھ ساتھ پتلی جان کی طرف دیکھ کر
ہنستا جاتا۔ پتلی جان منہ پھیر لیتا تو وہ تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔

صبح صبح پھجے پھاڈی کو کون خاطر میں لاتا؟ ہاں دوپہر آتی ہے۔ اس کے یہاں کونڈی ڈانڈا کھڑکتا تو
پتلی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت حاجی تنکا، گاموں، جیجا، دولا حرامی اور خلیفہ جی بھی آجاتے۔ کبھی کبھی جانی
بھی کچھ دیر کے لئے آجاتا۔ پیالہ بھی کدورتیں اور رقابتیں دور کر دیتا۔

پتلی جان کی ریشمی اور سرمئی آنکھوں کی پیالیاں مستی سے لبریز ہو جاتیں۔ ہونٹوں پر ہنسی رقص
کرنے لگتی اور بہار نکھر آتی۔ گاموں کھڑا سنبھال لیتا اور ترنگ میں آکر گانے لگتا۔ دیر تک محفل جمی رہتی، گرمی
کٹ جاتی اور پتلی جان نہانے کے لیے اٹھتا ادھر محفل بکھر جاتی۔

جسے سب چاہیں اسے ایک آدمی کیسے بس میں لائے؟ حاجی تنکا یہی غنیمت سمجھتا کہ پتلی جان اس کی
دکان پر آبیٹھتا اور اس کی دکانداری کو چار چاند لگا دیتا۔

اسی دکان، اسی تھڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب پتلی جان بیٹھتا کبھی جانی بیٹھتا تھا اور اس سے کہیں
زیادہ دیر تک مسلسل بیٹھتا لیکن اتنی بکری کبھی نہ ہوئی۔ پتلی جان تھوڑی دیر بیٹھتا اور جب قدردان ہجوم کر آئے
اور اسے زیادہ ستاتے تو اٹھ کر ادھر ادھر کھسک جاتا اس پر بھی حاجی تنکا کی بن جاتی۔ پانوں کی ڈھولی دو دن میں
غائب اور کم از کم سگریٹ کا ایک بڑا ڈبہ بھی لیمن کے ادھے الگ درجنوں کے حساب سے اٹھتے۔

گرمی سردی سے خاص اثر نہ پڑتا۔ البتہ پھل نہیں بکے۔

پتلی جان کا مزاج درویشانہ تھا۔ اس میں پیسے کا لالچ تو رتی بھر نہ تھا۔ بازار والوں سے یوں پیش آتا
جیسے اس کے اپنے ہوں۔ جیجے کی چائے، گاموں کے پھل اور دولے حرامی کے سری پائے رایگان نہ جاتے۔ وہ
ان سب کا حق پہچانتا اور فرض جان کر ادا کرتا۔ یار لوگ خالی ہاتھ چوبارے پر آتے لیکن جو چاہے پا لیتے۔ پھجے
پھاڈی کا قرض اس کی دکان پر ہی چکا دیتا۔ رہا حاجی تنکا کا معاملہ سو وہ گھر کی بات تھی۔ پتلی جان کی آدھی رات
اس کے گروی پڑی تھی۔ مندا ہوتا تو حاجی تنکا بوریت ٹالنے کے لیے ہیر یا ماہیا گانے لگتا۔ کوٹھوں سے آنے
والے آخری گاہکوں کو نمٹانے کے بعد ہی پتلی جان کے پاس جاتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد نیند بڑی پیاری لگتی
لیکن زندگی فقط نیند نہیں۔ زندگی کا ایک ضروری مقام پتلی جان تھا۔ یہیں وہ رات کو قیام کرتا۔ شب خون میں
نیند حرام ہو جاتی۔ ایسے میں چوبارے پر صرف تین چیزیں ہوتیں ایک چیز وہ خود تھا دوسری چیز پتلی جان تھا اور

تیسری چیز شراب تھی۔ شراب کی اس کے یہاں کمی نہ تھی کیونکہ وہ اس کی بلیک کرتا تھا۔

چکی جان کو حاجی تنکا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ تھا ہاں اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غمخواری کو ساتھی میسر تھا۔ وقت بے وقت آڑے آتا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے کتنے ہی ایسے قدر دان تھے جو اس کے اشارہ پر ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے لیکن وہ دکھڑا ہر کسی کو کیسے کہہ سنا سکتا تھا؟

چکی جان کو کوئی لمبا چوڑا غم نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکیلا اکیلا سا محسوس کرنے لگتا۔۔۔ جیسے اس کا کوئی دردمند نہ ہو، جیسے وہ سمندر کے اس پار کھڑا ہو جدھر جہازوں کا گزر نہ ہو۔ جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا، کوئی آفت نہ آجائے جو اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دے، اسے اس ہنستے کھیلتے، ناچتے گاتے بازار سے دور کر دے۔ گاہے گاہے اسے فکر بھی دامنگیر ہوتا کہ چند سال بعد جب چہرے کے بالوں میں سختی آجائے گی اور ان کی کھونٹیاں نکالنے میں دشواری پیش آئے گی پھر کیا بنے گا؟ ابھی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ موچنا لے کر بیٹھ جاتا تو چند منٹ میں انہیں صاف کر لیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چودھویں کی چاندنی میں نکھرے ہوئے گلاب کی ملائم ملائم پتیاں۔ جیجا اسے تازہ ڈبل روٹی کی طرح ملائم خیال کرتا اور گاموں اناس کے گودے کی طرح نرم ولذیذ۔ ایسی اداسی کے عالم میں چکی جان گم سم حاجی تنکا کی دکان پر جا بیٹھتا اور ہولے ہولے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ حاجی تنکا مزاج آشنا تھے۔ وہ تو یہی چاہتا کہ چکی جان یونہی اداس اور شوخیوں شرارتوں سے باز رہے۔ اسے دیکھ کر حاجی تنکا بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے یہ دونوں مجسمے ایک دوسرے کے مچالی ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت بڑی چیز سہی لیکن چکی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا پھر اسے وہ ہاتھ کا میل سمجھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کرایہ لینے آتا تو نہایت بے پروائی سے نوٹ پھینک دیتا جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان کا کوئی اعتبار نہ ہو، جیسے انہیں پیسے لگے ہوں۔ چکی جان کے ہاتھ کا میل اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھا۔ یہی میل ہر سال گچ گارے میں تبدیل ہو کر دکانوں، چوباروں اور کوٹھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ان کی بدولت نیا میل اکٹھا ہونے لگتا۔ اسی میل کے طفیل اس نے موٹر خریدی جسے وہ تب استعمال کرتا جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا اور نہ اپنی کٹڑی میں تو وہ یوں رہتا جیسے یہ بھی دوسروں کی طرح کوئی کرایہ دار ہو۔ وہ بالکل بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ لگتا۔۔۔ چکی جان کے یہاں بڑا میل تھا۔ جانے یہ میل کہاں کہاں سے بہنے کو آتا۔ کوئی اس چوبچے کا کیمیائی تجزیہ کرتا جو چوبارے کے پرنالے کے عین نیچے واقع تھا اور جسے منگو دن میں تین چار بار صاف کرتا تو شاید کچھ پتہ چلتا۔

شروع شروع میں چکی جان نے پیسے کی ضرور پروا کی اور اس سلسلے میں حاجی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا، چوبارے کی مرمت بھی اسی نے کروائی لیکن بہت جلد اس کے یہاں ہن برسنے لگا اور غنی ہو گیا۔ جیبوں میں، طاق میں، تکیے کے نیچے، پلنگ کی نواڑ میں، فرش پر ادھر ادھر نوٹ پڑے رہتے۔ اب حاجی تنکا کا روپوں

والا صندوقچہ پڑا رہتا اور پتلی جان اسے ہاتھ تک نہ لگاتا۔ روپے کے بل پر حاجی تنکا اسے زیر نہ کر سکتا تھا۔ ہاں پیسے کے بغیر اسے جیت لیتا تو اور بات تھی۔ پیار بڑی چیز ٹھہری۔

پہلے تو اس نے پتلی جان کو چوبارہ لے کر دیا۔ پھر اسے اپنا اڈہ دیا، چوبارے میں اس کے سنگ ڈیرے ڈالے، دکان میں دھری ہوئی چارپائی سونی کی، دکان اسے سونپ دی جس دن وہ سگریٹ کا کوٹہ لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا پتلی جان کو دکان پر بٹھا جاتا۔ پتلی جان بے تکلفی سے پیسے نکال کر فقیروں اور بندر نچانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی سارا پان ٹھکانے لگا دیتا۔ حاجی تنکا کچھ نہ کہتا۔

حاجی تنکا کھانے پکانے کا بندوبست بھی چوبارے ہی پر کرلیا کرتا۔ وہ اس کام میں طاق تھا۔ جانی بھی بڑا کاریگر تھا لیکن حاجی تنکا کا لوہا مانتا۔ جب بھی جانی بیمار پڑا تو اسی نے چولھا سنبھالا۔

ادھر قصائی نے ریپڑے سے گوشت اتارا اور ادھر حاجی تنکا سر پر سوار ہوا۔ سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لاتا۔ دوپہر کی ہانڈی تیار کر کے پتلی جان کے سامنے لا دھرتا۔ دونوں مل کر کھاتے۔

جانی بڑے صبر والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان ہلکان کر بیٹھتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا تماشا دیکھتا اور اف تک نہ کرتا۔ حاجی تنکا تو پتلی جان کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ جیسے وہ فلمی ہیروئن کا ہیرو ہو۔ جانی وفادار، جاں نثار اور تابعدار تھا لیکن حاجی تنکا نے کبھی اس پر یوں جان نہ چھڑکی۔

ضبط کرنے کو تو کرلیا جاتا لیکن انسان پھر انسان ٹھہرا پتھر نہیں جس دن پتلی جان ریشمی شلوار سلوانے کی نیت سے جانی کے یہاں گیا تو اسے دیکھتے ہی جانی بھڑک اٹھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ساٹن کا جھلملاتا ہوا ٹکڑا شعلہ بن کر اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔ غصے کا طوفان اٹھا اور پتلی جان پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے تو اس نے بے تحاشا گالیاں فرمائیں اور پھر کمر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا سینے پر چڑھ بیٹھا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اسے لہولہان کر دیا۔

شلوار اور قمیض کی دھجیاں ہوا کے جھونکے اڑا کر لے گئے۔

ساٹن کی چندیاں گلے میں لپٹائے اور دھول میں سن کر جب پتلی جان آیا تو حاجی تنکا کے سامنے رو دیا اور بولا "۔۔۔۔ مجھے داتا کوڑھی کر دے جو میں جھوٹ بولوں۔ مولا جانے میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ شلوار سینے کو ضرور کہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدلہ لینا تھا۔ کسی اور سے شلوار سلوا لیتی۔ جانی کا ٹھیکہ تھوڑی تھا۔"

جانی کا نام سنتے ہی حاجی تنکا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ مجال کہ اس کے یار پر ہاتھ اٹھائے۔ اس نے برف توڑنے کا سوا لیا اور چھلانگ لگا کر دکان سے اترا۔ لپک کر جانی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جانی آنے والے طوفان سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دور سے حاجی تنکا کو آتے دیکھا تو مضبوطی سے کواڑ بند کرلیا۔ حاجی تنکا کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے پورے زور سے لات ماری لیکن کواڑ ڈھیٹ نکلا۔ نہ کھلا۔ ہاں پاؤں میں چوٹ آگئی۔ حاجی نے طیش آلود لہجے میں چلا کر کہا۔۔۔۔ "رانی خاں کے سالے! آج میں تیرا پیٹ پھاڑ کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو بھولو پہلوان سمجھتا ہے میں یخنی بنا دوں گا۔ تیرے حمایتوں کی ماں۔۔۔۔ میں نے تیری

بوٹی بوٹی نہ کی تو مجھے حاجی تنکا نہ کہنا حرام کا جنا ہوا کہنا"۔۔۔۔دوبارہ آنے کی نیت کر کے لوٹ آیا۔

شیخ شریف کا خدا بھلا کرے جس نے مضبوط کواڑ لگوا رکھے تھے ورنہ آج جانی کا کام تمام ہو جاتا۔ دیر تک گود ڑ گرم کر کر کے چکی جان حاجی تنکا کے پاؤں کی ٹکوڑ کرتا رہا۔ اس وقت تو غصے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے بے چین کر دیا۔ جب رات بھر ٹکور کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو حاجی نے بسے گوجر کو پاؤں دکھایا۔ بسے گوجر نے پاؤں کو بے طرح جھٹکا دیا اور زور زور سے مالش کی تو حاجی کی چیخیں نکل نکل گئیں۔ معاملہ لمبا پڑ گیا۔

جیجے کو جانی کی حرکت اتنی اچھی تو نہ لگی لیکن وہ اسے اتنا خطاوار بھی نہ سمجھتا۔ ایک لحاظ سے تو جانی حق پر تھا۔ چکی جان لاکھ بے خطا سہی لیکن جانی کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے بدلہ لیا تو کیا برا کیا؟ اسے حق پہنچتا تھا۔ پھر حاجی تنکا کہاں سے چکی جان کا خیر خواہ تھا چکی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاجی تنکا ہی رہ گیا تھا؟ جیجا بھی تو بدلہ لے سکتا تھا اور اچھی طرح لے سکتا تھا۔ حاجی تو بالکل پاجی تھا۔ ایک جھانپڑ سے تو جانی کی جان نکل جاتی اور یہ ماں کا پہلوان سوا لے کے چلا گیا تھا جیسے بس یہی تو بازار میں ایک غنڈہ رہ گیا تھا، باقی سب نے تو جیسے چوڑیاں پہنی تھیں۔

چکی جان چائے خانے میں آیا تو جیجے نے حسرت آلود لہجے میں شکایتاً کہا۔ "پیارے! ہم بھی تیرے یجن ہیں۔ حاجی ہم سے بڑا غنڈہ تو نہیں۔ ہمیں کہنا تھا۔ ہم جانی سے بدلہ لے کر دکھاتے۔ اس ماں کے نام بشک نے تو ٹانگ بھی تڑوائی اور بدلہ بھی نہ لیا۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے؟ اس کی کیا ہستی ہے کہ تیری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے؟ کلیر والے کی سوں! میں اس کا لہو پی جاؤں۔"

چکی جان کی آنکھوں میں خوف جھلکا اور دل میں رحم کی لہر دوڑ گئی۔ بولا "جس کا گھر اجڑا ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا؟ جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اسے تو حاجی پر رنج تھا غصہ مجھ پر نکالا۔"

"تیری خیر ہو! صابر پیر کی قسم! جانی بے قصور ہے۔ کوئی مرد ہوتا تو حاجی کا اندر پیٹا باہر کر کے چھوڑتا۔"

حاجی تنکا کا روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بسا گوجر بڑا استاد تھا۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑ اسی سے چڑھواتے لیکن قسمت کی بات ہے، حاجی تنکا کی ٹانگ ٹھیک نہ ہوتی۔ اب نہ تو وہ پابندی سے قصائی کی دکان پر جاتا اور نہ گرم جوشی سے چکی چولھا کرتا۔ گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا۔

حاجی تنکا کے ٹخنے پر ہر وقت پٹیاں بندھی رہتیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے پینترے بدلتا اور پاؤں دباتا سہلاتا رہتا۔

وہی چکی جان تھا۔ وہی چوبارہ وہی فرصت شب تھی لیکن ٹخنے کے درد نے نظام زندگی درہم برہم کر دیا۔ دکان پر سکون نہ رہا۔ بیمار گھر کا ماحول پیدا ہو گیا۔ چکی جان کا دل کمزور تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا اٹھ کر گھومنے لگتا۔ حاجی تنکا کے پاس بہت کم ٹک کر بیٹھتا۔ ویسے بھی اب گھر کی ہانڈی کی لذت سے محروم ہو گیا تھا۔

جانی ہر تغیر کو بڑے اشتیاق سے دیکھتا، نئے نئے تانے بانے بنتا اور خوبصورت خوابوں سے مستقبل کو سجاتا۔ بڑی باقاعدگی سے خلیفہ جی کے پاس جاتا، ان کی خدمت کرتا۔

جب تک دکان پر ٹھٹھا مخول کرنے والے جمع رہتے۔ محفل لگی رہتی۔ چکی جان مزے سے بیٹھا رہتا۔ محفل ٹوٹتی تو وہ بھی ادھر ادھر کھسک جاتا۔ حاجی تنکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا لیکن کچھ نہ کر پاتا۔ وہ اب ایک لمحے کے لئے بھی چکی جان سے الگ نہ رہنا چاہتا۔ چکی جان پر سو جان سے فدا تھا۔ اس کی خاطر اس نے گھر اجاڑا تھا۔

حاجی تنکا کے دل میں ایسی ایسی ٹیسیں اٹھتیں جیسے اسے کوئی بار بار سولی پر چڑھا رہا ہو۔ برف کا وہی سوا جو اس نے جانی کا مغز چھیدنے کو اٹھایا تھا۔ آنکس بن کر اس کی کھوپڑی میں چبھتا رہتا۔ اسے ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نشتر لے کر نہایت بے دردی سے اس کا سینہ کھرچ رہا ہو۔ پاؤں کا درد جو اسے رات رات بھر سونے نہ دیتا اب اس میں ایک نیا درد مل گیا نئی ٹیس اور نئی تڑپ پیدا ہو گئی۔

چکی جان کی زندگی بھی جمی جمائی نہ رہی۔ پہلے گھر کا کھانا میسر تھا۔ اب وہ میسر نہ رہا۔ کھانے پینے کے پروگرام میں گڑبڑ آ گئی۔ کبھی دولے حرامی کی دکان پر ناشتہ کرتا کبھی ججے کے چائے خانے میں جا کر رات اور دوپہر کا کھانا کھاتا، کبھی گاموں کے ساتھ کھاتا، کبھی اکیلا کھاتا، ججے کا لونڈا اسے ہر چیز لا دیتا۔ پہلی سی بات نہ رہی۔ ایک وہ زمانہ کہ تنہائی محسوس ہوتی تو حاجی تنکا کی صحبت میں سکون مل جاتا اور ایک زمانہ کہ ہر شے گرد و غبار کی طرح بکھر کر رہ گئی۔۔۔ حاجی تنکا کی زندگی میں جو بد مزگی آئی تھی اس کا اثر چکی جان پر بھی پڑا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے۔ علاج معلوم نہ ہو تو آوارہ گردی ہی تکلیف رفع کرتی ہے چنانچہ اس نے آواری گردی بڑھالی۔ گاموں کی دکان، ججے کے ہوٹل اور بیجے پھاڑی کے اڈے کے دن بھر چکر کاٹتا لیکن طبیعت سیر ہوتی نہ چین ملتا۔ ہاں جان کو ضرور چین ملا۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا کہ چکی جان اب حاجی تنکا کی دکان پر برائے نام بیٹھتا اور ججے کی چائے خانے میں منڈولی جماتا ہے دوپہر لونمنڈی اٹھ کر بیجے پھاڑی کے یہاں جمتی وہی روز کا سماں بندھتا۔۔۔ بھنگ گھٹتی دور چلتے گھڑا بجتا تانیں اڑتیں اور۔۔۔ اس کے بعد چکی جان نہانے کی غرض سے اٹھ آتا تو محفل تتر بتر ہو جاتی۔

حاجی تنکا کی دکان کے بعد ججے کا چائے خانہ غنیمت ثابت ہوا اور چکی جان نے وہاں سکون محسوس کیا۔ گپ باز آ جاتے اور وقت کٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ بیکلی کم ہوئی۔

حاجی تنکا کے پاس بیٹھتا تو جھٹ بیزار ہو جاتا۔ ایک تو حاجی کراہتا رہتا۔ دوسرے شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے کبھی اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا اور اب وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگا تھا۔ وہ گاموں، دولے حرامی، بیجے پھاڑی اور ججے کے خلاف زہر اگلتا رہتا بلکہ چکی جان کی بے وفائی کا بھی گلہ کرتا۔

جانی کے ڈوبے ہوئے دل میں امید کی ہلکی ہلکی لہریں زور پکڑنے لگیں اور وہ سمجھنے لگا کہ مرجھائے

ہوئے پھولوں میں جان پڑنے کی رت آگئی ہے۔ ایک دن آنکھوں میں آنسو لیے خلیفہ جی کے پاس پہنچا اور ان کے پاؤں پکڑ کو بولا۔۔۔۔ آپ میرے پیر خانہ ہیں۔ دین دنیا میں مجھے آپ کا آسرا ہے۔ میں تھک ہار چکی ہوں۔ جیسے بھی بنے آپ میری مدد کریں۔ حاجی کو سمجھائیں۔ خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا ہے۔ مجھے اپنے برے دنوں کی لونڈی بنا لے۔"

پہلے تو خلیفہ جی نے سوچا معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہے لیکن پھر جب جانی کے ٹپ ٹپ کرتے آنسو دیکھے اور چیخیں سنیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور مداخلت کریں گے۔

رات گئے حاجی تنکا اداسیوں کی گھنیری گھٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے گھمبیر تنہائی میں مرا جا رہا ہو۔ خلیفہ جی نے اسے اونچ نیچ سے واقف کرنا چاہا لیکن وہ تمام اونچ نیچ سمندر کی لہروں کے حوالے کیے بیٹھا تھا۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی تھی۔ وہ کسی قیمت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے پتلی جان سے پیار تھا۔

خلیفہ جی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار رموز سے کما حقہ آگاہ تھے۔ انہوں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔۔۔ "حاجی تنکا! بن کا پنچھی پنجرے میں قید نہیں رہتا۔ پتلی جان کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ آزاد طبیعت کی بندی ہے۔ اسے کسی سے پیار نہیں اور سب سے ہے اسے پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک کی صفت الگ ہوتی ہے۔ پتلی جان کو مولا نے نرالی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو خوش رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری مانو جانی سے صلح کر لو! کہو تو پاؤں پکڑوا دوں معافی منگوا دوں۔ وہ تمہارے پاؤں دھو دھو پئے۔ مولا دستگیر جانتے میں نے کبھی کسی کو غلط صلاح نہیں دی۔ مجھے پتلی جان سے بیر نہیں لیکن جو سچی بات ہے وہ سچی ہی ہے اور میں نے کہہ دی ہے۔

اس گفتگو نے حاجی کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہے گا ہی نہیں، جیسے وہ بولنے کی تاب ہی نہیں رکھتا لیکن تھوڑی دیر بعد بولا۔ "جانی کا نام نہ لو خلیفہ! اس نے مجھے برباد کیا ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے پتلی جان سے پیار ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پا لوں گا۔ مجھے پتہ ہے لوگ اس بہکا رہے ہیں لیکن اسے ضرور ٹھوکر لگے گی۔ جو لوگ اسے بہکا رہے ہیں اسے دھوکا دیں گے پھر پتلی میرے پاس آئے گی۔"

خلیفہ جی نہ آتے تو اچھا تھا۔ انہوں نے آکر تو اور بھالے مار دیئے۔ وہ تو کب سے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اب یہ کانٹے اس کی روح کو بھی ڈسنے لگے۔ وہ اور زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں سوچتا پتلی جان کا پیار تیکھا ہوجاتا اور کانٹے زیادہ شدت سے ڈسنے لگتے۔ وہ تو جیسے آندھی کا پیچھا کر رہا تھا۔ خلیفہ جی نے رہی سہی امید بھی توڑ دی۔ اسے جتا دیا کہ پتلی جان کی بے وفائی اٹل ہے۔

دل کی دنیا سونی ہوئی تو وہ کان بھی سونی ہوگئی۔ جس کے دم قدم سے رونق تھی اسے حاجی تنکا کی پروا نہ تھی۔ گاہکوں کی آمد کم ہوگئی اب تو وہی آتے جو پرانی وضعداری کے پابند تھے۔ سودا باقاعدگی سے نہ آتا۔

کبھی پان ہے تو کتھا چونا نہیں۔ قینچی کا سگریٹ ہے تو کیوںڈر کا نہیں۔ بڑھتی ہوئی اداسی کے ساتھ ساتھ حاجی تنکا کا دل بیٹھتا جاتا۔ ڈوبا ہوا دل ابھرنا چاہتا لیکن رہ جاتا۔

ایک دن تو وہ اتنا غمزدہ ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پر چلا گیا۔ یہاں آ کر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور کشتی بھنور سے نکل کر کنارے آ لگی۔ اس نے درگاہ کے کنویں سے پانی نکالا اور وضو کیا۔ نہایت خشوع و خضوع سے درگاہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال ادھر جب وہ حج کرنے گیا تھا تب بھی اس کے دل میں اس طرح عقیدت کا طوفان اٹھا تھا۔ اس نے قدموں کی طرف تعویذ کی جڑ میں سر رکھ دیا۔ اپنے پیار کی کامیابی کی لیے دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ شیر شاہ اس کی سنیں گے اور مراد پوری کر کے رہیں گے۔ اس نے سر اٹھایا اور بیٹھ کر وہ دو چار آیتیں پڑھیں جو اس نے حج پر جاتے ہوئے حفظ کی تھیں۔ اس نے ساری رات درگاہ پر گزاری۔ کبھی سجدے میں جاتا اور کبھی بیٹھ کر آیتیں پڑھتا۔ ساتھ ساتھ آنسو بہاتا۔

فجر کی اذان ہوئی تو اسے نیند آ گئی۔ دن چڑھتے تک آنکھ نہ کھلی۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ ایک زائرے نے اسے جگا دیا۔ زائر کا خیال تھا کہ درگاہ کی حدود میں دعا مانگی جا سکتی تھی، سویا نہیں جا سکتا تھا۔ ٹانگ کی چوٹ کے بعد آج پہلی بار اسے نیند آئی کہ اسے جگا دیا گیا۔

رَت جگے کی وجہ سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ دکان پر جانے کی بجائے وہیں درگاہ میں بغل والے تکیے میں چلا گیا اور چرس کا سوٹا لگا کر ایک طرف میلی چٹائی پر سو رہا۔ دوپہر کے وقت اٹھا اور دوکان پر آیا۔

نیچے کے چائے خانے میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے قدرے ہلکی ہوئی تھی۔ قہقہوں کا شور بن کر بھر گئی۔ ایک کڑا بوجھ سینے پر آ گرا۔ پتلی جان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پتلی جان نے حد کر دی۔ حاجی تنکا رات بھر غائب رہا، اس نے خبر تک نہ لی۔ حاجی تنکا نے دل میں کہا۔۔۔ ''ظالم کو لگن ہوتی تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالتا اور شیر شاہ کی درگاہ پر پہنچتا۔'' یہ کون دور جگہ تھی؟ شاہی مسجد کے مقابل قلعے کے پیچھے ہی تو تھی۔ بہت ہو گا تو دس منٹ کا راستہ ہو گا۔ پتلی جان کو معلوم تھا کہ حاجی تنکا دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین جگہ جاتا۔۔۔ سودا سلف لینے بازار جاتا۔ سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیے میں اور دعا مانگنے شیر شاہ کی درگاہ پر جاتا۔

حاجی تنکا کو شیر شاہ سے بلا کی عقیدت تھی۔ زندگی میں کئی بار ان کے کمالات دیکھ چکا تھا۔ ایک دفعہ جب گنجا ٹھوٹھی جھانسہ دے کر جانی کو بھگا کر لے گیا تو شیر شاہ کی مہربانی سے جانی صحیح سلامت لوٹ آیا۔ چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور پکڑا گیا۔ مال برآمد ہو گیا۔ پھر پتلی جان بھی تو انہیں کی عنایت سے اسے ملا تھا۔

اس کے دل میں حسرت ہی رہی جب وہ درگاہ پر آنسو بہا رہا اور دعا مانگ رہا تھا اگر اس وقت شیر شاہ کرشمہ دکھاتے اور پتلی جان کو کھینچ لاتے تو کتنا مزہ آتا؟

حاجی تنکا چپ چاپ دکان پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیجا پتلی جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے

چائے خانے سے باہر نکلا۔ اگر گاموں پیچھے سے آ کر گھونسہ رسید نہ کرتا تو ہاتھ اپنی جگہ سے الگ نہ ہوتے۔

جیجا اور پکی جان بھیجے پھاڈی کے اڈے پر چلے گئے۔ حاجی ننکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے امید تھی کہ پکی جان آئے گا اور حال پوچھے گا۔ لیکن کہاں؟ وہ ایسا غائب ہوا کہ جب بھیجے پھاڈی کے اڈے سے اٹھ کر چوبارے پر گیا تو حاجی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔۔۔۔ حاجی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اگلے دن چراغوں کا میلہ تھا۔ چراغوں کے میلے سے حاجی ننکا کو بڑا عشق تھا۔ اس نے کبھی میلہ نہ چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں میں لگ جاتا۔ ججے، گاموں، بھیجی، دولے اور سب دوستوں کو بلاتا۔ جانی کو شریک اجلاس کرتا اور پروگرام تیار کرتا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے پارٹی اس کی قیادت میں شالامار پہنچ جاتی۔ یہ لوگ اچھی سے اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ گاڑتے اور ڈیرے جماتے، گانے کی محفل لگتی۔ چائے پانی کے دور چلتے، مرغ بھنتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوش و خروش تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے سابقہ قائد کو بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کیسی طوطا چشم تھی۔ گو اس میں جانے کی ہمت نہ تھی لیکن پکی جان دعوت دیتا تو وہ چلنے کے لیے تیار ہو جاتا اور پاؤں کا درد بھول جاتا۔

وہ جان گیا کہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔

زوال کے بعد پکی بازار میں شور و غل ہونے لگا۔ گاموں نے ججے کو اور ججے نے پکی جان کو آواز دی تھوڑی دیر کے بعد بھیجے پھاڈی نے تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دولا حرامی خوانچہ سنبھال کر گھر جا رہا تھا۔ بھیجے پھاڈی نے کہا۔ ''اوئے دولے حرام دے! اب تو نے دکان بڑھائی ہے، تیار کب ہو گا، میلے کو کب جائے گا؟''

دولے حرامی نے نہایت بے پروائی سے کہا ''ماں کے یار! تجھے بڑی جلدی ہے تو بے شک چلا جا! میں تو اب جا کر تیاری کروں گا مجھے ساتھ لے لیا تو خیر صلا۔ نہیں تو میں اکیلا شالامار پہنچ جاؤں گا۔ مجھے راستہ آتا ہے۔''

''تیری خوشی پیارے! ہم تو تیار۔ تیار ہیں۔

دولا حرامی خوانچہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور بھیجا پھاڈی تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ گاموں ہرے رنگ اور لال دھاریوں والی ملتانی دھوتی، اس پر دو گھوڑا بوسکی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندیل پہن کر نکلا۔ گامے شاہی نئی سرخ جوتی چمک رہی تھی۔ گلے میں سونے کا کنٹھا بہار دکھا رہا تھا۔ مونچھیں سروں تک خوب بٹی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پر ڈٹ رہے ہوں۔ پکی جان نے چوبارے میں بیٹھے بیٹھے دولہا کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔ گاموں نے زبان میں دو انگلیاں اڑا کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ پورا پکی بازار گونج اٹھا۔ جیجا سیٹی سنتے ہی دکان سے باہر نکل آیا۔ اس کی ترچھی لمبے شملے والی لنگی اور ڈھیلی ڈھالی شلوار فراغت اور چھٹی کا اعلان کر رہی تھی۔ کالر والی قمیض کی ایک جیب میں اصلی ریشم کا مہین گلناری رومال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گاموں نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوئے یار! میلے کب چلے گا؟'' ججے نے پکی جان کے چوبارے کے طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ''جب ہمارا دلبر پکی جان چلے گا۔''

حاجی تنکا کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا میلے سے رہ جانا ہی کم قیامت نہ تھا۔ پھر پتلی جان کا ان سب کے ہجوم میں ہل کر جانا تو اور بھی غضب تھا۔ کوئی کہاں تک صبر کرتا؟ حاجی کو تو کسی نے انگاروں پر لٹا دیا۔

پتلی جان ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھر رہے تھے جیسے رات سایہ ڈال رہی ہو۔ کھلے گریبان میں سے بدن کا بے داغ، چمکتا دمکتا حصہ نظر آرہا تھا جس نے شاید سحری سویرے بھیک مانگ لی تھی۔ بھنگ پینے کے بعد سستی سی آگئی تھی اور اس کا باسی مکھڑا پھیکی مسکراہٹ کے بوجھ تلے دب رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں بازار پر اس انداز سے پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب کرنیں نچھاور کر رہا ہو۔ وہ کبھی گاموں کو اور کبھی بجے کو دیکھتا۔

بھجے پھاڈی نے سب کو مات کر دیا۔ ساجی درزی نے اپنے خاص الخاص مشورے اور اپنی مرضی سے میلے کے لیے اسے بش شرٹ سی دی جو اس نے شلوار پر ہی پہن لی حالانکہ ساجی نے پتلون بھی تیار کر دی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال کر گلفام بن گیا۔

حاجی سب کے ٹھاٹ دیکھ کر جل بھن گیا۔ وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ پتلی جان ان کے ساتھ جائے وہ چاہتا تھا کہ میلے کا دن پتلی جان اس کے ساتھ گزارے۔ اس کے پہلو میں بیٹھے اسے مدت بھی ہو گئی تھی۔ آج پتلی جان کی اسے بڑی آرزو ہوئی۔ تصور کی زبردست لہر اٹھی اور اس میں بہہ گیا۔

دکان رہی نہ لنگڑا پاؤں اور نہ ہی اس کی غمگین زندگی۔ وہ خوبصورت محل سرا میں جا پہنچا جہاں پتلی جان اس کے انتظار میں بے قرار تھا۔ نظروں سے نظریں ٹکرائیں بھرپور مستی ڈھیرے ڈھیرے آنکھوں میں سے ہو کر حاجی تنکا کے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس نے قریب جا کر پتلی جان کو بغلگیر کیا۔ ہلکی ہلکی آنچ جذبات کو دم پخت کرنے لگی۔ قریب ہی سنہری پلنگ پر ریشمی بچھونا لگا تھا۔ بچھونا بالکل بجرا تھا اور اس پر نام کو سلوٹ نہ تھے لیکن دیکھتے دیکھتے اس پر سلوٹ پڑنے لگے جو سلوٹ دلوں میں پڑ رہے تھے وہی سلوٹ پلنگ پر نمودار ہونے لگے۔ دو زندگیوں میں بڑی بے تابی سے سلوٹ پڑنے لگے۔ پھر یہ سلوٹ دو بے تاب زندگیوں کا دلفریب تصور اور محل سرائے غائب ہوئے۔۔۔۔ صرف غسل خانہ سامنے رہ گیا۔

نل کھلا تھا اور پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ جیسے استاد انترے کے بول گا رہا ہو کبھی نل کی دھار ہلکی پڑ جاتی اور بول انترے سے اتر کر استائی پر آجاتے۔ غسل خانے کا کواڑ نیچے سے شکستہ تھا۔ اس لئے اندر سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر باہر فرش پر پڑ رہے تھے۔

پلنگ پر گہرے نیلے رنگ کا ریشمی غرارہ دھرا تھا۔ اس میں آزار بند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا اگر سرے سنہرے تاروں سے گندھے نہ ہوتے تو ازار کا بند ہی پتہ ہی نہ چلتا۔ اس پر ہلکے نیلے رنگ کی لنن کی قمیض رکھی تھی اور برابر میں گہرے نیلے رنگ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ ایک طرف سرخ پرس رکھا تھا۔ پلنگ کے نیچے بچے تلے کی جوتی دھری تھی۔ گاموں، بھجا، ذولا حرامی، بودی سائیں، گنجا ٹھوٹھی، ساجی درزی اور جیجا سب چائے خانے میں بیٹھے بے قراری سے پتلی جان کے چوبارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دولا حرامی۔۔۔۔۔ ''یار تِلی نے تو بڑی دیر لگا دی۔''

بھیجے پہاڑی نے جواباً کہا۔۔۔ ''معشوق کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔''

پھر میلے کے پروگرام پر گفتگو ہونے لگی۔ سڑک پر حشو تانگے پر بیٹھا سوٹا لگا رہا تھا اور اس کا گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ ساتھ ہی کرمو اپنے ریہڑے پر ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔

حسو جماہی لیتے ہوئے مایوسانہ انداز میں بولا۔۔۔ ''استاد جیجا! کتنی دیر اور ہے؟'' کرمو نے کان کھڑے کئے۔

جیجے نے بڑی تکلفی سے دو تین چالو قسم کی گالیاں فرمائیں اور پھر کہا۔۔ ''تجھے تو دیہاڑی پوری ملے گی۔ تجھے دیر سویر سے کیا؟''

''ہاں، ٹھیک ہے۔ مجھے دیہاڑی چاہیے۔ دیر سویر سے کیا؟ اور تنا کہہ کر وہ سوٹا لگانے لگا۔ کرمو بھی سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

ادھر نل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ رک گئی۔ کواڑ کھلا۔ تِلی جان مسکراتا مسکراتا باہر نکلا اور اس کا ننگا بدن یوں چمکا جیسے چاند دھل کر طلوع ہوا ہو۔ ایک دم زور کی چیخ نکلی اور تیز چھری اس کی نرم نازک پسلیوں میں دھنس گئی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن حاجی تنکا نے اس دہشت زدہ گائے کو لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی ٹانگ کے نیچے دبالیا جو لنگڑی تھی اور اب اس میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھر گئی تھی۔ تِلی جان فریادی گائے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کھایا بلکہ تیز چھری نرخرے پر رکھ کر حلق میں اتار دی۔ خون کی دھار نکلی اور حاجی تنکا کے کپڑے لال کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

ایک پھول دھول میں مل گیا۔

تِلی جان کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی اور پھر بازار یوں سونا ہوا جیسے دلی اجڑی ہو۔ ●●●

متھی پالش

عصمت چغتائی

• پولنگ بوتھ پر بڑی بھیڑتھی جیسے کسی فلم کا پریمیر ہو۔ یہ لمبا کیو لگا تھا۔ پانچ سال پہلے بھی اسطرح ہم نے لبے لبے کیو لگائے تھے، جیسے ووٹ دینے نہیں سستا اناج لینے جار ہے ہوں۔ چہروں پر اس کی پرچھائیں تھیں۔ کیو لمبا سہی، پر کبھی تو اپنی باری آئے گی۔ پھر کیا ہے، وارے نیارے سمجھو اپنے بھروسے کے آدمی ہیں۔ قسمت کی باگ ڈور اپنوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔

''بائی اے بائی اچھے تو ہو؟'' میلی سی کاشتہ باندھے ایک عورت نے پہلے پہلے دانت نکال کر میرا ہاتھ پکڑلیا۔

''ادھو، گنگا بائی..........۔''

''رتی بائی، او گنگا بائی دوسری تھی، مرگئی بے چاری۔''

''ارے......رے بے چاری......'' زن سے میرا ذہن پانچ سال پیچھے قلابازی کھا گیا۔

''مالش کہ متھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مالش۔ رتی بائی نے آنکھ ماری۔'' سالی کو بہت منع بولا پر سُنیں نا۔ تم کس کو دیں گا ووٹ بائی۔''

''تم کس کو دوگی'' ہم نے ایک دوسرے سے رسماً پوچھا۔

''ہمارا جات والا کو۔ اپن کے گاؤں کا ہے۔''

''پانچ سال ہوئے تب بھی تو تم نے اپنی جات والا کو دیا تھا ووٹ۔''

''ہاں بائی، پن وہ سالا کنڈم نکلا، کچھ نہیں کیا۔'' رتی بائی نے منہ بسور کر کہا۔

''اور یہ بھی تمہارا جات والا ہے۔''

ہاں، پن یہ ایک دم فرسٹ کلاس۔ ہاں، بائی دیکھنا اپن کا کھیت چھوٹ جائے گا۔''

''پھر تم گاؤں جا کر دھان کوٹا کروگی۔''

''ہاں بائی۔'' رتی بائی نے اپنی چندھی آنکھیں پٹ پٹائیں۔

پانچ سال ہوئے ہسپتال میں جب میری منی پیدا ہوئی تو رتی بائی نے کہا تھا وہ اپنی جات والے کو ووٹ دینے جارہی ہیں۔ چوپاٹی پہ اس نے ان سے ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں وعدہ کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں طاقت آتے ہی کایا پلٹ جائے گی، دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی، زندگی میں سے شہد ٹپکنے لگے گا۔

آج، پانچ سال بعد، رتی بائی کی ساڑھی پہلے سے بوسیدہ تھی، بالوں پر سفیدی بڑھ گئی تھی، آنکھوں کی وحشت

دو چند ہو گئی تھی۔ آج پھر چوپاٹی پر کیے ہوئے وعدوں کا سہارا لے کر وہ اپنا ووٹ دینے آئی تھی۔

''بائی تم اس چھنال سے کائیکو اتنا بات کرتا''۔ رتی بائی نے بیڈ پین سرکاتے ہوئے اپنی نصیحتوں کا دفتر کھول دیا۔

''کیوں؟ کیا برائی ہے؟'' میں نے بن کر پوچھا۔

''ہم تمہارے کو بولا نا اوچھوکری ایک دم کھراب ہے۔ سالی پکی بدماس۔'' رتی بائی کی ڈیوٹی لگنے سے پہلے گنگا بائی نے بھی اپنی ڈیوٹی کے درمیان مجھے یہی رائے دی تھی کہ رتی بائی ایک دم لوفر ہے۔ اسپتال کی یہ دونوں آیائیں ہر وقت کچر کچر لڑا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی جھوٹم جھوٹا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ مجھے ان سے باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔

''کیا وہ سالہ سنکر بھائی تھوڑی ہے، اس کا یار ہے۔ سنگ سوتی ہے۔'' گنگا بائی نے بتایا تھا رتی بائی کا میاں شولہ پور کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ بس اسی سے چمٹا وہا ہے۔ ساری فصل بیاج میں اٹھ جاتی ہے۔ تھوڑے سے روپے اور رہ گئے جو چند سالوں میں چک جائیں گے۔ پھر وہ اپنے بال بچوں کے پاس چلی جائے گی اور وہاں مزے سے دھان کو کاٹا کرے گی۔ گھر میں مزے سے دھان کوٹنے کے خواب دونوں ایسے دیکھا کرتی تھیں جیسے کوئی پیرس کے خواب دیکھتا ہو۔

''مگر رتی بائی تم بمبئی میں پیسہ کمانے کیوں آ گئیں؟ تمہارا میاں آ جاتا تو ایک بات بھی تھی۔''

''ارے بائی وہ کیسے آتا؟ کھیت جو چلا جاتا۔ میرے سے کھتی باڑی نہ سنبھلتی۔''

''اور بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔''

''ہے ایک رانڈ مری۔'' رتی بائی نے دو چار گالیاں لڑھکائیں۔

''دوسری شادی کر لی ہے تمہارے میاں نے''؟

''اینہ! سالا دوسری شادی کیا کرے گا، رکھیلی ہے۔''

''اور جو تمہارے پیچھے مالکن بن بیٹھی تو؟''

''کیسے بنے گی؟ مار مار بھوسانہ بھر دیں گے! بیاج نمٹ جائے پیچھے چلے جائیں گے ہم۔''

معلوم ہوا رتی بائی خود اپنی پسند کی ایک لاوارث عورت میاں اور بچوں کی خبر گیری پر چھوڑ آئی ہیں۔ جب کھیت چھوٹ جائے گا تو پھر گھر ہستن بن کر دھان کوٹنے چلی جائیں گی۔ رکھیلی کا کیا ہوگا؟ اسے کوئی دوسرا میاں مل جائے گا جس کی بیوی بمبئی میں پیسہ کمانے آئی ہوئی ہے اور بال بچے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

''اس عورت کا میاں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے نہیں تو۔''

''تو وہ اس کے پاس نہیں رہتی۔''

''اس کے کھیت خورد برد ہو گئے۔ اس کا میاں کسان مزدور ہے، مگر سال میں آٹھ مہینے چوری

چکاری کرتا ہے یا بڑے شہروں کی طرف نکل جاتا ہے، بھیک مانگ کر گردن بتا دیتا ہے۔"

"اور بچے؟"

"ہیں نہیں تو۔ چار بچے ہیں یا تھے۔ ایک تو بمبئی میں ہی کھیل رل گیا، کچھ پتا نہیں کہاں گیا، چھوکریاں بھاگ گئیں، چھوٹا بچہ ساتھ رہتا ہے۔"

"تم کتنا روپیہ گاؤں بھیجتی ہو رتی بائی؟"

"اکھا چالیس"۔

"تمہاری گزر کیسے ہوتی ہے پھر"۔

"ہمارا بھائی سنبھالتا ہے۔" وہی بھائی جس کے بارے میں گنگا بائی کہہ رہی تھیں کہ ان کا فرینڈ ہے۔"

"تمہارے بھائی کے بال بچے۔"

"ہیں نہیں تو۔"

"ہاں؟ گاؤں میں؟"

"ہاں، پونا کے پاس ایک جگہ ہے۔ اس کا بڑا بھائی کھیتی سنبھالتا ہے۔"

"یعنی تمہارا بڑا بھائی۔" میں نے چڑانے کو پوچھا۔

"دھت۔ او ہمارا، بھائی کاہے کو ہوتا۔ کیا بائی تم ہمارے کو سالا چھنال سمجھتا ہے۔ ہم گنگا بائی سری نہیں ہے۔ معلوم مہینے میں چار دن سے جاستی کسی کے ساتھ نہیں بنی۔ ہاں کوئی پھٹا پرانا کپڑا ہو تو اس بدماس کو مت دینا، میرے کو دینا، ہاں!"

"رتی بائی"۔

"ہاں بائی"

"تمہارا "بھائی" تم کو مارتا ہے؟"

"سالا گنگا بائی بولا ہوئیں گا۔ نہیں بائی جاستی سنیں مارتا۔ کبھی کبھی پیے لا ہوتا تو مارتا۔ سو بائی لاڈ بھی کرتا نا۔"

"لاڈ بھی کرتا ہے؟"

"کرتا نہیں تو۔"

"مگر رتی بائی تم اسے بھائی کیوں کہتی ہو کمبخت کو؟" رتی بائی ہنسنے لگیں۔ "بائی ہمارے میں ایسا ہچ بولتے"۔

"مگر رتی بائی چالیس روپیہ بگار ملتی ہے تو پھر دھندا کاہے کو کرتی ہو؟"

"بن کیسے پورا پڑے۔ پانچ روپیہ کھولی کا بھاڑا لے تین روپیہ لالہ کے۔"

''یہ لالہ کو کا ہے۔ کے دیتی ہے؟''

''اکھا چالی کا عورت لوگ دیتا ہے، نہیں تو نکال دیوے۔''

''دھندا جو کرتی ہو اس لیے؟''

''ہاں بائی'' ۔رتی بائی کچھ جھینپ گئیں۔

''اور تمہارا بھائی کیا کرتا ہے؟''

''بائی بولنے کا بات سنیں، ہاں۔ دارو کا دھندا بڑا اکھوٹا دھندا ہے۔ جو پولیس کو پیسہ بنیں بھرے سوتڑی پار۔''

''یعنی بمبئی سے شہر بدر''۔

''ہاں بائی''۔

اتنے میں نرس نے آکر رتی بائی کو ڈانٹا ''کیا بیٹھی باتیں مٹھار رہی ہے۔ چل جا نمبر 10 میں بیڈ پین پڑا ہے۔'' رتی بائی اپنے میلے دانت نکوستی بھاگیں۔

''آپ کیا ان لوفر عورتوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے ورنہ پھر بلیڈنگ شروع ہو جائے گی۔'' نرس نے بچی کو پنگھوڑے سے نکال لیا اور چلی گئی۔

شام کو گنگا بائی کی ڈیوٹی تھی۔ بغیر گھنٹی بجائے خود ہی آن دھمکیں۔

''بیڈ پین مانگتا بائی۔''

''نہیں گنگا بائی، بیٹھو۔''

''رانڈ شسٹر بوم مارے گی۔ کیا بولتی تھی تمہارے کو؟''

''کون سسٹر؟ بولت تھی آرام کرو''۔

''شسٹر سنیں اور رتی بائی''۔

''کہتی تھی پوپٹ لال گنگا بائی کو خوب مارتا ہے'' میں نے چھیڑا۔

''ارے او سالا ہمارے کو کیا مارے گا''۔ گنگا بائی میرے پاؤں پر ہولے ہولے مکیاں مارنے لگیں۔

''بائی میرے کو جوتا چپل دینا کو بولا تھا، دیوتا''۔

''لے جاؤ۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہارے میاں کی چٹھی آئی؟''

''آئی نہیں تو''۔ گنگا بائی نے فوراً چپل پر ہاتھ مارا۔ ''سالا شسٹر نے دیکھ لیا تو بوما بوم کرے گی۔ بوت کھٹ کھٹ کرتی ہے۔''

''گنگا بائی''۔

''ہاں بائی''۔

''تم اپنے گاؤں کب واپس جاؤ گی؟''

گنگا کی چمکیلی سیاہ آنکھیں دور کھیتوں کی ہریالی میں کھو گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی

دھیمی آواز میں بولی "رام کرے اب کے فصل دھڑلے کی ہو جاوے۔ بس بائی پھر اپن چلا جائے گا۔ گئے سال باڑھ آ گئی سارا دھان کچرا ہو گیا"۔

"گنگا بائی تمہارے میاں کو تمہارے دوستوں کے بارے میں پتا ہے؟" میں نے کریدا۔

"کیا بات کرتا تم بائی"۔ گنگا بائی گم سم سی ہو گئی۔ اسے کچھ جھینپ سی معلوم ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً بات پلٹی۔

"بائی تمارے کو دو چھوکری ہو گیا، سیٹھ گسا کرے گا نا؟"

"کون سیٹھ؟" میں نے چکرا کر پوچھا۔

"تمہارا اپنی دوسری سادی بنا لے گا تو؟"

"وہ دوسرا شادی بنائے گا تو ہم بھی دوسرا شادی بنے لے گا"۔

"تمہارے لوگ میں ایسا ہوتا؟ ارے بائی ہم سمجھا تم کوئی اونچا جات کا ہے"۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گنگا بائی اونچا۔ جات والا کا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ گنگا بائی سمجھ جائیں مگر ان کا خیال تھا کہ دوسری لڑکی کی پیدائش پر ضرور میری شامت آئے گی۔ اگر سیٹھ میری ٹھکائی نہ کرے تو سخت تھرڈ کلاس سیٹھ ہے۔

اسپتال میں پڑے رہنا قید تنہائی سے کچھ کم نہیں۔ دو گھنٹے شام کو ملنے جلنے والے آ جاتے، اگر اسپتال میں یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید دم ٹوٹ جاتا۔ دونوں معمولی سی رشوت لے کر ایک دوسرے کے بارے میں الٹی سیدھی بتیا کرتیں۔ ایک دن میں نے رتی بائی سے پوچھا۔

"اے رتی بائی تم مل میں کام کرتی تھیں، کیوں چھوڑ دیا؟"

"ارے بائی سالا مل میں بڑا لفڑا تھا"۔

"کا ہے کا لفڑا؟"

"اے بائی ایک تو کام ایک دم بھاری، یہ بھی چلتا، پر بائی دو مہینہ کے بعد چھٹی کر دیتے"۔

"کیوں؟"

"دوسرا بائی لوگ کو رکھتے"۔

"بھئی وہ کیوں"۔

"کارن یہ کہ اگر پکا چھ مہینہ ہو جاتے تو فیکٹری لا جوالا گو ہو جاوے"۔

"اوہو سمجھی۔ یعنی ہر دوسرے تیسرے مہینے نیا اسٹاف بدلتا رہتا ہے۔ اگر مستقل ہو جائے ایک کاریگر تو فیکٹری لا کے مطابق اسے بیماری کی چھٹی، زچگی کی چھٹی لینے کا حق مل جاتا ہے۔ اس لیے ہر دو مہینے کے بعد ادل بدل کر دی جاتی ہے۔ سال میں ایک مزدور کی مشکل سے چار مہینے آمدنی ہوتی۔ باقی کے دن گاؤں واپس لوٹ جاتی ہیں۔ جن کی اتنی حیثیت نہیں وہ دوسری ملوں کے چکر کاٹتی ہیں۔ بعض سڑی گلی بھاجی ترکاری کی

ڈھیریاں لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ فٹ پاتھ پہ اپنی اپنی جگہ کے لئے خوب گالی گلوچ ہوتی ہے۔ بغیر لائسنس کے بیچتی ہیں۔ اس لیے کچھ ٹکڑ کے سپاہی کو کھلانا پڑتا ہے اس پر بھی کبھی کوئی انجانا افسر آجاتا ہے تو بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کچھ دکان جھولیوں میں سمیٹ کسی گلی میں سٹک جاتی ہیں، کچھ پکڑی جاتی ہیں اور واویلا کرتی ہیں۔ پولیس تھانہ لیجائی جاتی ہیں۔ مطلع صاف ہوتے ہی پھر چیتھڑا بچھا کر دکان سجالیتی ہیں۔ کچھ اور بھی چالاک ہوتی ہیں۔ جھولی میں چار چھ نیبو، دو چار بھٹے بکوڑے بازار میں ایسے گھومتی ہیں جیسے خود خریدار ہیں، مگر پاس گزرنے والے سے چپکے سے کہتی ہیں۔

''لو بھائی بھٹا لیو، ایک ایک آنہ''۔ اور بکری ہو جاتی ہے۔

ان سے ترکاری خریدنا گویا پھنے کی پڑیاں خریدنا ہے۔ جو ذرا کم خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بھیک مانگنے لگتی ہیں۔ دوڑتے بھاگتے دھندا بھی کرتی جاتی ہیں۔ اپنی دانست میں سولہ سنگھار کیے منہ میں بیڑا دبائے یہ لوگ نیم تاریک ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ٹہلا کرتی ہیں۔ گاہک آتا ہے، کچھ اشارے کنائے ہوتے ہیں، سودا پٹ جاتا ہے۔ یہ گاہک عموماً اتر پردیش کے گھر چھوڑ کر آئے ہوئے دودھ والے یا بے گھر بے در مزدور ہوتے ہیں جن کی بیویاں گاؤں میں ہوتی ہیں، یا ازلی کنوارے جن کا گھر بار یہی گندی نالیاں اور فٹ پاتھ ہیں۔

صبح گنگا بائی اور رتی بائی میں باقاعدہ برآمدے میں فری اسٹائل کشتی ٹھن گئی۔ رتی بائی نے گنگا بائی کا جوڑا کھسوٹ ڈالا اور اس کے جواب میں گنگا بائی نے رتی بائی کا منگل سوتر توڑ ڈالا۔ منگل سوتر، کالی پوتھ کا باریک سا کنٹھا رتی بائی کے سہاگ کی نشانی۔ رتی بائی ایسے بھوں بھوں کر کے روئیں جیسے انہیں بیوہ کر دیا ہو۔ لڑائی کی بنیاد روئی کے وہ ٹکڑے تھے جو مریضوں کے زخموں کی رطوبت پونچھ کر پھینکے جاتے ہیں۔ یا زچاؤں کے استعمال کی روئی۔ میونسپلٹی کا حکم ہے کہ یہ روئی احتیاط سے جلادی جائے مگر معلوم ہوا رتی بائی اور گنگا بائی چپکے سے یہ روئی نکال کر، دھو کر، پوٹلی باندھ کر لے جایا کرتی تھیں۔ چونکہ آج کل تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ تھے گنگا بائی نے ہیڈ سے شکایت کر دی۔ رتی بائی نے گالیاں دیں جو ہاتھا پائی میں تبدیل ہو گئیں۔ دونوں نکال دی جاتیں مگر ہاتھ پاؤں جوڑے تو ہیڈ نے بات دبادی۔

رتی بائی ذرا عمر اور پھسپھسی سی تھی۔ گنگا بائی نے ان کی خوب ٹھکائی کی۔ دوپہر کی سوجی ہوئی ناک لیے بیڈ پین رکھنے آئیں تو میں نے پوچھا۔

''رتی بائی اس گندی روئی کا کیا کرتی ہو؟''

دھو کر سکھا لیتے ہیں۔ ایک دم صاف ہو جاتی ہے۔''

''پھر؟''

''پھر روئی والے کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں''۔

''کون لیتا ہے یہ جراثیم بھری روئی؟''

''میٹرس والا جو صاب لوگ کا فرنیچر کا گدا بناتا ہے۔''

اف! میرے جسم پر سوئیاں کھڑی ہوگئیں۔ ایک دفعہ میں نے بیڈ کے صوفے کی روئی دھنکوانے کو نکلوائی تو کالی سیاہ۔ تو وہ یہی زخموں کی روئی تھی۔ اللہ! میری بچی کا گدا بھی ایسی روئی کا ہے۔ میری پھول سی بچی اور یہ جراثیم کے ڈھیر۔ ہائے گنگا بائی، رتی بائی تمہیں خدا سمجھے!

آج چونکہ جوتا چلا تھا۔ رتی بائی بھری بیٹھی تھیں۔ گنگا بائی چونکہ ذرا نسبتاً جوان تھیں۔ رتی بائی انہیں اپنے سے زیادہ گناہگار سمجھتی تھیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے رتی بائی کا خاصہ مستقل گاہک بھی توڑ لیا تھا۔ وہ تمام پیٹ جو گنگا بائی وقتاً فوقتاً ضائع کراتی رہتی تھیں، نالے میں جو جیتا جاگتا بچہ چھوڑ آئی تھیں، جو آنول نال منہ پر ڈھال دینے کے بعد سسکتا رہا۔ صبح نالے کے پاس ایک خلقت جمع تھی۔ اگر رتی بائی چاہتی تو صاف پکڑا دیتی گنگا کو، مگر اس نے راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور گنگا بائی کا دیدہ دیکھو فٹ پاتھ پر بیٹھی کچی بیر اور امرود کی ڈھیریاں بیچتی رہی۔

"رتی بائی کو کوئی گڑبڑ سڑبڑ ہو جاتی ہے اس دوستی میں تو تم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

"کاہے کو جاوے اسپتال؟ ہمارے میں بہت بائی لوگ ہے" ڈاکٹر کا مافک ایک دم فرسٹ کلاس"۔

"اور کیا، فسٹ کلاس دوائی دیتی۔ مٹھی بھی چلتی ہے پن مالش ایک دم اچھی۔"

"یہ "مٹھی اور "مالش" کیا بلا ہوتی ہے؟"۔

"بائی تم نہیں سمجھے گا"۔ رتی بائی ذرا شرما کر ہنسنے لگیں۔ میرے ڈسٹنگ پاؤڈر کے ڈبے پر وہ کئی دن سے منڈلا رہی تھیں۔ جب میرے لگاتیں ذرا سا ہتھیلی پر ڈال کر اپنے کلوں پر رگڑ لیتیں۔ میں نے سوچا ان کا منہ کھلوانے کے لیے یہ ڈبہ کافی ہوگا۔ میں نے ڈبہ پیش کیا تو بو کھلا گئیں۔

"نہیں بائی شسٹر مار ڈالے گی۔"

"نہیں مارے گی۔ میں اس سے کہہ دوں گی مجھے اس کی بو پسند نہیں۔"

"چہ۔ ارے کیا ایک دم فسٹ کلاس باس بولتا۔ ارے بائی تمہارا تو مستک پھریلا ہے۔"

بڑے اصرار کے بعد رتی بائی نے مجھے مالش اور مٹھی کی تفصیل بتائی ابتدائی دنوں میں تو مالش کارگر ہوتی ہے۔ فسٹ کلاس ڈاکٹر کا مافک بائی مریضہ کو زمین پر لٹا کر چھت سے لٹکی ہوئی رسی یا کسی لاٹھی کے سہارے اس کے پیٹ پر کھڑی ہو کر خوب کھوندتی ہے۔ یہاں تک آپریشن ہو جاتا ہے۔ یا اسے دیوار کے سہارے کھڑا کر کے بائی پہلے اپنے سر میں خوب کنگھی کر کے کس کے جوڑہ باندھ لیتی ہے۔ پھر چلو بھر کڑوا تیل سر پر ڈال کر مریضہ کے پیروں کو مینڈھے کی طرح ٹکراتی ہے۔ سخت جان محنت مزدوری کرنے والی بعض نوجوان عورتوں پر اس کا بھی کبھی کبھی کچھ اثر نہیں ہوتا، تب مٹھی کی نوبت آتی ہے۔ بے دھلے گندے میل بھرے ناخن والے ہاتھ کو تیل میں ڈبو کر جسم میں سے دھڑکتی ہوئی جان کو توڑ نکال لیا جاتا ہے!

عموماً آپریشن پہلے وار میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بائی اناڑی ہو تو کبھی صرف ایک ہاتھ ٹوٹ کر آجاتا ہے، کبھی گردن بچ جاتی ہے اور کبھی جسم کا وہ حصہ بھی گھسٹتا چلا آتا ہے جسے اندر ہی رہنا تھا۔

مالش سے بہت زیادہ موتیں نہیں ہوتیں۔ہاں عموماً مریضہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔جسم جگہ بے جگہ سے سوج جاتا ہے۔مستقل گھاؤ بن جاتے ہیں جو رِستے رہتے ہیں۔بخار رہنے لگتا ہے اور پھر اللہ کی دی موت بھی آنے والے کو آ ہی جاتی ہے۔مٹھی سخت نازک موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔جان پر کھیل کر اور عموماً بائی لوگ جان پر کھیل جاتی ہیں۔جو بچ رہتی ہیں کچھ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں، کچھ چند سال گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔اور رتی بائی نے کہا یہی سزا ہے ان بدقماش عورتوں کی۔مرنا تو چاہئے ان کو۔

مجھے بڑے زور سے قے ہوئی اور رتی بائی جو چٹخارے لے لے کر سنا رہی تھیں بوکھلا کر بھاگیں۔ سنسان خاموش اسپتال میں مجھے وحشت ہونے لگی۔یا خدا انسان کو جنم دینے کی اتنی بھیانک سزا۔میں نے غنودگی میں ڈوبتے ہوئے سوچا۔

خوف سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔رتی بائی کی کھینچی ہوئی تصویروں میں تخیل نے رنگ بھرا، پھر جان ڈال دی۔کھڑکی کے پردے کا سایہ دیوار پر ہل رہا تھا۔دیکھتے دیکھتے سایہ گنگا بائی کی مالش زدہ، خون میں نہائی ہوئی لاش کی طرح تڑپنے لگا۔ایک بھیانک میلے ناخنوں والا آہنی شکنجہ دماغ میں مٹھی بن کر اتر گیا۔ ایک وار میں ننھی ننھی انگلیاں، ڈھلکی ہوئی گردن خون میں غلطاں و پیچاں۔میرا دل و دماغ میں نے چیخنا پایا کسی کو پکارنا چاہا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔میں نے گھنٹی کا سوئچ دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر جنبش نہ ہوئی۔خاموش چیخیں میرے سینے میں گھٹتی رہیں

اسپتال کی خاموش فضا میں جیسے کسی مقتول کی چیخیں یکایک گونج اٹھیں۔یہ چیخیں میرے کمرے سے آتی تھیں جنہیں میں نے سنا۔میں نے وہ بھی نہیں سنا جو میری زبان سے انجانے میں نکل رہا تھا۔

”کوئی برا خواب دیکھا ہوگا“۔نرس نے مجھے مارفیا کا انجکشن دے دیا۔میں نے بہت کہنا چاہا ”نرس مجھے مارفیا نہ دو۔وہ دیکھو سامنے گنگا بائی کی مالش زدہ، خون میں نہائی لاش صلیب پر چڑھی تڑپ رہی ہے۔اس کی چیخیں میرے دماغ میں پیچ کس کی طرح دھنستی جا رہی ہیں۔دور کہیں نالے میں دم توڑتے ہوئے بچے کی سسکیاں ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح میرے دل پر پڑ رہی ہیں۔مرے اعصاب پر مارفیا کا پردہ نہ ڈالو۔رتی بائی کو پولنگ بوتھ جاتا ہے۔نئے منسٹر اس کے جات والے ہیں۔اب بیاج چک جائے گا اور گنگا بائی مزے سے دھان کوٹے گی۔یہ نیند کی چادر میرے دماغ پر سے سرکا دو۔مجھے جاگنے دو۔گنگا بائی کے جیتے جیتے خون کے دھبے سفید چادر پر پھیلتے جا رہے ہیں۔مجھے جاگنے دو۔“

میز کے سامنے بیٹھے ہوئے کلرک نما شخص نے میرے بائیں ہاتھ کی انگلی پر نیل روشنائی کا ٹیکہ لگایا تو میں جاگ پڑی۔

”۔۔راجات والے کے ڈبے میں ڈالنا، ہاں“۔رتی بائی نے مجھے ہدایت کی۔

رتی بائی کے جات والے کا ڈ۔۔ایک مجسم شیم مٹھ۔۔بن کر میرے دل و دماغ سے ٹکرایا اور میں نے اپنی پرچی اس ڈبے میں نہیں ڈالی۔ ●●

بھنور

غلام عباس

• اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لیے صوم وصلوۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لیے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لیے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گھٹا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ وسفید رنگ، چوڑا چہرہ، کڑبڑی واڑھی مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی، جن میں ہروقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار خاکی رنگ کی قمیض، چارخانے کپڑے کا کوٹ، پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی، غرض لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے خاصے مردِ مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کنگھال ڈالتے۔ ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین وہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جواء کھیلنے یا کسی اور فعل شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا۔

حضور! اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آگیا ہوں۔ میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا مگر اس کی بدنصیب ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر برا حال کر لیا ہے۔

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی تنبیہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہل کاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔

ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی، اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ان کا دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دینوی سے منہ پھیر لیا اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ، سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائکہ ایسے لہجہ میں جو ہوتا تو نرم مگر طنز سے خالی نہ ہوتا، کہتی:

”حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑ دیتے ہیں، مگر انتظام معقول ہونا چاہئے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔“

اور یوں انہیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی، لپک کے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی ڈاڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیئے پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی:

”اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری ڈاڑھی میں کنگھی کروں گی۔“

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے، یہ منظر دیکھ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہ حق میں اٹھانی پڑیں اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالاخانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے، فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ

حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار دونوں بہنیں ہیں۔ ایک ناچتی ہے دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے، چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لئے بنک سے بہت سارو پیہ اڑا لایا مگر پولیس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نواب زادے نے جو قلاش ہو گیا تھا، اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا، مگر اس نئے فتنے کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں نیا جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہ راست پر لانا چاہئے ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی، قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے پھر وہ شفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے۔

”میری بیٹیو! مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تر و تازگی آخر کب تک باقی رہے گی پانچ سال، سات سال، حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابل نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں، اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لیے کہ تمہارا وجود ان کے لئے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

میری بچیو! ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے۔ دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی، قدم قدم پر جان کا خوف، ہر وقت پولس کا دھڑ کا، عدالت میں پیشیاں، یہ جینا بھی کوئی جینا ہے، میری بیٹیو تمہاری جگہ یہ بالا خانہ نہیں ہے بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو۔

جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے اور جہاں تمہاری اولاد کے لئے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو" یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا ان باتوں کو سن کر وہ گم سم رہ گئیں تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا

''حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور!''

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزر پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

''جس دن آپ آئے تھے''۔ اس نے حاجی صاحب کو بتلایا۔ ''اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میں پل بھر کے لئے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں''۔

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورت کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی، حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے جی اٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لے کے سارے گھر کی صفائی کی۔ چولہا مدت سے راکھ سے بھرا تھا اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑ پن سے ظاہر کر دیا کہ حسن و جمال، علم اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدردان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ الفت ہو گئی۔ جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لیے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی کیونکہ وہ یہ خواب سمجھتے تھے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیق کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابو کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انہوں نے بلقیس سے کہا۔

''بیٹی! آج شام ایک مہمان آرہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا، وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس سے پردہ نہیں کرنا ہوگا۔''

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کو بیٹا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر تیسرے دن، پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا ادھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی گویا وہ سچ مچ باپ ہیں اور پھر یہی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہوگئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے جو خطوط آئے ان کہ لہجہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ لکھا تھا۔

> ابا جان! تسلیم! مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا کہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہوگیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید

انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔ اس لئے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے طلاق دلوادیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے، بے چاری شکل کی بھی بری نہیں۔ اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی پیاری بیٹی
بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ رات بھر وہ غم وغصے سے کھولتے رہے۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لئے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی جس اس نے بلا حیل وحجت منظور کر لیا دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا۔ جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک آہ سرد بھر کے رہ گیا تھا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہو تو اس کے دل میں پھر بہار کی

آرزو تازہ ہوگئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کرلیا مگر حاجی صاحب نے جب تک کہ واجب مہر وصول نہ کرلیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

رسوروپش نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کیئے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کرلیا اور دنوں کو خاصی گزر ہونے لگی، یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا، مگر یہ میوہ فروش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا، شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا مگر جلد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آگئی اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی گری کی خدمت سرانجام دے اور دوستوں سے فخریہ یہ کہہ سکے۔

''یہی تھا وہ لعل بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔''

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کردیا، وہ اس کے دوستوں کی ضیافتوں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے ہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی، منت سماجت کی مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

''اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔''

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔ مقدمہ بازی سے خائف ہوکر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہوگیا۔

اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی۔ جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ تنک کر کہتی۔

''ابا جان آپ کو میری فکر کیوں رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا؟''

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابل عمل ثابت ہوا مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کرکے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے

تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضا مند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا۔ مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن، بھولا بھالا ناک نقشہ میں بھی اچھا تھا، البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا، البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا، بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں، گھر کا سامان، زیور، کپڑا لتا پہلے ہی وافر تھا۔ اس کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار تھے مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے ہفتے، مہینے اور پھر سال دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے اس دوران میں اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا کی ان آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہو گئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا، کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لیے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا۔ اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے خط کی آخری سطور یہ تھیں۔

لیکن میرے پیارے ابا جان! آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر

میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے درست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا انہیں ضرور ہو جائے گی مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا، سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں آخر جائداد اسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لئے تو ہوتی ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔ آپ کے دیدار کی طالب بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم ہو کر رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا، گویا ان کا آخری وقت آ پہنچا ہو۔۔۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر ہی رکھا تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آکر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی ساتھ کچھ سامان تھا، دو تین ٹرنک، ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے ان کی صورت دیکھ اس خاتون نے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ اس کا سن تیس پینتیس برس سے کم کسی طرح نہ ہوگا مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

''میں بہار کی بہن گل ہوں'' اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ ''دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے..........''

•••

تلاش

قدرت اللہ شہاب

● مایوس، غم دیدہ، بیزار۔۔۔۔۔۔ گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے۔ جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ، میرا اپنا کوٹ ہے۔ میں اس کوٹ کو سنبھال کے رکھوں یا پھاڑ ڈالوں، خود پہنوں یا بیچ دوں یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دوں۔۔۔۔۔ مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خرید نے دو، مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ!

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنسان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اجلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تمتمائے ہوئے سورج کے سامنے آوارہ بدلیاں آجائیں تو زمین پر ایک مدور سا چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بے وقوف آدمی! جوں جوں وہ سایہ اس کے قریب آتا جائے گا، چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے، مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا ''گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔''

گوراں نے کہا ''آجاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لیے بھٹک رہی ہوں۔'' جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے، بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا، اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پالیا، وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوب صورت، مرمریں، ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا، جھنجھناتا ہوا جسم۔ عورت کی کائنات اس کا جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوب صورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار، جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کر گرجنے لگتا ہے۔

''ابے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش، فرار، فلسفہ۔۔۔ میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو، عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو، جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں، آدھ سیر

پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤں آلو، دو پیسے کی ٹماٹر اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرام زادہ ضرورت سے زیادہ مٹھی گرم کردے اور میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں تو میں سبزی منڈی میں جا کے لٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دوکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں، میں ہر بھدیال کی دکان پر جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوبصورت سٹال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گوبھی، مٹر، چقندر، سلاد اور اناس کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا۔ کبھی وٹامنز کے اجزا میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی چھابڑی والے سے گلی سڑی سبزی تلوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں اور وہ حرام زادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے۔۔۔ کیا سمجھے بیٹا؟۔۔۔ میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ ریچھے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔۔۔ تمہارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں۔ وہ ایک کو پھانسو اور عیش کرو۔۔۔ ورنہ لٹکتے رہو گے بچہ۔ جس طرح میں کرتار سنگھ کے سٹال پر لٹک جاتا ہوں۔۔۔"

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے۔ کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی املی کے پانی سے بھرے ہوئے گپے منہ میں ڈالتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے چار چار انگلی لمبی رال ٹپک پڑتی تھی اور وہ کسی خاموش لذت سے بلبلا اٹھتا۔۔۔ ہائے ہائے کیا خستہ گول گپا ہے۔۔۔ جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں۔"

چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نا کوئی حسین حصہ نگل جاتا تھا۔ مس کلیانی کی ہونٹ، خالدہ کے دہکتے گال، زرینہ کی حنائی انگلیاں۔۔۔ ظہیر کہتا ہے، عورت شہد کی مکھی ہے، وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنک پر نہ جاؤ، اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیلما کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دئے۔ آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر دام آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوبیس امیدواروں کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپیچری کی کرسی سنبھال بیٹھا۔۔۔ ہائے عورت کی نگاہ؟ میرے بھائی! اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں، تقدیریں بدل جاتی ہیں، نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے، ذوق یقین کا سودائی کون بنے۔ دینا ہے تو عورت کی گود میں، عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب اندر سین ہیڈ کلرکی کے خواب دیکھ رہا ہے، نیلما کی بلوری گردن میں اب پھر لطفِ خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کود جاؤ۔ ایک بیچاری ہیڈ کلرکی کیا چیز ہے؟ تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر ساری کائنات اندر سین کو سونپ دو۔۔۔ ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تھرک تھرک کر ناچ رہی ہو۔۔۔"

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا، وہ عورت میں اس کا جسم ٹٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں، ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر بس نہیں، وہ جسم کی ہر رعنائی، حسن کے ہر پیچ سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری کی نظر سے ناپ تول کر ان پر قیمتوں

کے لیبل لگا دیتا ہے۔ نیلما کے گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلرک ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے، لیکن ظہیر کہتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھر یالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔

چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لیے چھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنا بائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے۔ چھمی جان تین روپے۔۔۔ گلزار بیگم پانچ روپے۔۔۔ رتنا بائی دس روپے۔۔۔۔ کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا تل ہے اور اس کی عنابی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی، اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیے۔

گوراں نے کہا " آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔ آپ میری قیمت نہیں دے سکتے"۔

ظہیر نے سوچا وہ بن رہی ہے۔ اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔ اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھال اور فخر سے بولا " مانگو کیا مانگتی ہو جان تمنا، آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔"

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی "ظہیر صاحب، میں روز روپیہ کماتی ہوں، آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لحہ کے لیے، آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں ایک عورت سمجھیں۔۔۔ ایک لحہ کے لیے، آپ گاہک نہ بنیں ایک مرد بن جائیں۔ بس ایک دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔

ظہیر ہنسنے لگا۔ وہ الو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا رہا۔ اس نے زبردستی اسے بیس روپے دیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لیے ہوئی تھی۔ کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔ لیکن جب ہم ملے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے۔ پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں حق تل کر بکتی رہی۔ سینکڑوں انسان اپنی پشت ہا پشت کی کیچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔ بنی نوع انسان صدیوں کا سیہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔ اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشک بار جلد کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے، اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے۔ میں نے کہا " گوراں! اگر تو کائناتِ کے آخری کنارے پر بھی ہوتی ہے، تو میں ارض وسما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا۔"

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔ اس کا جسم پامال جسم ہے۔ پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مرجھا جاتا ہے بلکہ سڑک کی طرح جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا اسٹیم رولر ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر ریلتا جائے، پیدل چلنے والے جوتیاں چٹخاتے گزرتے جائیں۔ ٹم ٹم اور تانگے چیخ چیخ کرتے نکلتے جائیں، موٹریں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں، سڑک گھستی جائے، پتھر ٹوٹتے جائیں، لیکن گذرنے والے گزرتے رہیں، چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا سٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔۔۔۔

گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف

کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح، تھکے ہوئے کلرک، موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے، اسٹیم رولر کی طرح بھکتے ہوئے موٹے موٹے سیٹھ۔۔۔۔ یہ آئے وہ گئے! یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے وہ بھاگے۔۔۔ اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔ گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی۔ وہ زندگی کے نام پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحوں کی خیرات چاہتی تھی، وہ چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھڑ کھڑ چلتی ہوئی بن چکی کو جاوداں سکون دے سکتے تھے۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے ''عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس ٹپکاتی ہے'' ظہیر بکتا ہے، وہ رتنابائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا فلسفہ جماتا ہے۔ صادقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے، سور کہیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ اور وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی ہے، رس لیتی ہیں، رس چوستی ہیں رس چراتی ہیں۔۔۔۔ بیگم ستار کی طرح جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے'' آہا بیٹا، میری ثروت سے ملو، ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے'' اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور پتلا بلاؤز اتار کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں پستان، یہ ہے ثروت کی لچکیلی کمر۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے شرمیلی ثروت، ایک شرمیلی ثروت دو شرمیلی ثروت تین۔۔۔ قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار۔۔۔۔ گوراں بھی یوں ہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آ جائے گا، حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گے، ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھینچ جائیں گے اور غالباً انہیں وہ امید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شبستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت، مجید، زہرہ، خورشید، نجمی، عفت۔۔۔۔ سب خوش گوار لڑکیاں ہیں، حسین، بے حد حسین ستاروں کے جھرمٹ کی طرح، جو نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسم۔۔۔۔ اوہ میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسموں میں چاند، سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کر رکھ دیا ہے ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام چھلکتے ہیں لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے چکیلی گاڑیاں، بھڑکیلے لباس۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظہیر کی خوشامد کی کہ دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے خدا کے لئے اسے میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ میری مقدس امانت ہے،، مقدس؟ ارے توبہ توبہ!،، ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ تم نہیں جانتے گوراں کو اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراثیم ہیں گلتے ہوئے زہریلے، مہک کیڑے۔۔۔۔۔ تم مقدس کہتے ہو اس سڑتی ہوئی لاش کو۔۔۔۔۔،،

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر

قالین پر جا گرا ۔ظہیر نے گرم گرم سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی۔۔۔۔ اور اگلے روز گوراں کو لے کر آیا ۔وہ آئی جھجکتی ہوئی ہچکچاتی ہوئی لجائی سی ، جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا گوراں رتمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔تم بالا خانے کے پٹ مقفل کر دو۔،،

گوراں حیران سی ہو گئی۔ اس کے خوش نما ہونٹ تعجب سے کھلے رہ گئے'' کیوں وہ بولی میں نے کہا۔'' گوراں تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔تم بالا خانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تکمیل ہو۔اگلے مہینے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینٹی ٹوریم میں داخل کروادوں گا۔سینٹی ٹوریم کا بڈھا سپر نٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے وہ مٹ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔''

''تم سچ کہتے ہو۔،، گوراں نے کہا'' لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالا خانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟،،

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔'' تم اپنے بالا خانے سے اپنی روزی کا سہارا نہ لو، گوراں ، کیا سچ مچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لیے کما رہا ہوں؟''۔

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں اس کا اوپر والا دانت کچھ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکا یک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی احمری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا پلک جھپکتے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی اس کا جسم تھا، خوب صورت مرمریں ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا جھنجھناتا ہوا جسم۔

تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔'' وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے ہاتھوں سے نوچنے لگی۔ گوراں کی قسمت میں ٹکے رات تھی تم اسے ساڑھے بارہ سو مہینے پر پچکار رہے ہو تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو اس کے لانبے لانبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے ،ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی میز کے اگالدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا اپنی ساڑھی کے الجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا اور آہستہ چلی گئی جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رو رہی تھی۔'' تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔''

مایوس ،غم دیدہ بیزار گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے جانے دو وہ اپنے جسم کی مالک ہے شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہ رو اسے خرید لے گا۔۔۔۔ خریدنے دو مجھے اس پر کوئی اختیار تو نہیں۔۔۔۔۔۔

●●●

سمے کا بندھن

ممتاز مفتی

● آپی کہا کرتی تھی ''سنہرے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا اثر ہوتا ہے۔
اپنا سمے پہچان۔ سنہرے۔ اپنے سمے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹکتی جائیگی۔
اب سمجھ میں آئی آپی کی بات جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکی آلنے سے نہ گرتی سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی کہتی تھی ''تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کٹھالی میں پڑے رہنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔''
پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کون لایا تھا۔ بال پن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی سرتال بھری بیٹھک کے جھولنے میں جھول جھول کو جوان ہوئی۔ پھر سنہرا امڈ امڈ آیا۔ چھپائے نہ چھپتا۔ آپی بولی ''نہ دھیے۔ چھپانہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔''
کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن، منظر بن اور جو دیکھے بھی تو، تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گھنشام نہ آئے۔'' آپی گنگنانے لگی۔ ''یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کا سمے ہے پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا پچھلے پہر تک۔''
ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کھلتا تھا۔
بولی۔ ''سنہرے بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے۔'' میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی ''دیکھ لڑکی۔ یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں، دُوجے میں اٹھے۔ دوجے میں جھاگ اٹھانا۔ یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دُوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے۔ ہمارا سمے۔ جب دُوجا شانت ہو جائے، ہمارا سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں ٹھمک نہ کرنا۔ ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا چمک کا سمے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل جھنکار بیرن بھئی۔''
پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی ''سنہرے۔ میرے باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں

ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں۔ بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بیتی بات ہو جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو، چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ ہڈ بیتی نہیں۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آرہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں، چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے، دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پیلی، روپی اور میں۔ پیلی بڑی "روپہ" منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے ٹمیا رس سے بھری رہیت ہے۔ گردن اٹھتی رہتی مورتی سمان۔

روپہ ہی سر تھی۔ شدھ سرتاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تجی میں تھی۔ آپی کہتی تھی۔ "سنہرے تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے۔ دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر، خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر لگتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔"

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا، منہ اٹھایا چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولیتے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اچھالیں۔ لڑکیوں نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں، وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی۔ وہ سمجھ لو، نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی رہی نہ دوسروں جوگی۔"

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے آوازیں چلتی تھیں۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھ لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آسکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم، گرم گرم۔ ویسے تھا آن بان سجت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن سی ہو۔ دھونی دی ہو۔ آرتی بجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھا۔ پیتا ضرور تھا پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا۔ الٹا دھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل

ہو جاتی۔ آواز کی کڑکی بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا منہ ہو، بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

''ڈرو سیکھوڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو نیچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من جھولنا جھلا دیتا ہے۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔''

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے ''گاٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔'' گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم رہا تھا۔ ''پھر کہو۔ پھر بولو۔'' کا جاپ کئے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کے سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں، کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی۔ ''شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔''

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔ ''نہ آپی۔'' وہ بولا ''ابھی تو رات بھیگی ہے۔'' آپی بولی۔ ''ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہے۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟ ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔ ''آپی یہ سمے کا گورکھ دھندہ کیا ہے؟''

آپی بولی۔ ''لڑکو سمے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سمے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک، پھر بھور سمے اس کا سمے ہے۔ اس کا نام جپو۔ اسے پکارو۔ فریاد کرو، دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سمے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا ہمارا ہے، اس کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سمے کے نیڑے تیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔''

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولی۔ ''بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہو گی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔''

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ ''روپہ ماندی ہے وہ تو نہیں جا سکے گی کسی اور دن رکھ لینا نذر و نیاز۔''

''خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟'' وہ بولا

''تو کسی اور کی منڈلی کو لے جا۔''

"اونہوں" ٹھاکر نے منہ بنالیا۔ "خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق کھو تو ہو"

"میں کس لائق ہوں جو ان کا نام منہ پر لاؤں۔"

"بس اک تیری بیٹھک ہے جہاں پوتر تا ہے۔ جسم کا نہیں، من کا ٹھکانا ہے۔"

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپہ کا دھیان رکھنے کے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں، بہویں، بیٹیاں، ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھ لو، بھجن منڈلی تھی۔ "خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار" سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا من ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھیگ گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو ایک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لئے آئی ہوں۔ میری آنکھیں بھر بھر آئی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ تو آیا کہ میں اس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ زبردستی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس میں اتنی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون سنکتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کوئی بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار رہ جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر ٹھاکر بولا۔ "سنہرے بائی۔ بس۔ اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چیزیا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھوبیا دھوئے جائے ساری عمریا۔"

پھر بھی مجھ سدھ بدھ نہ رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ گئی اور میں ہی نہیں، محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد ننگو خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتا۔ گھنگرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پیلی حیران، روپہ کا منہ کھلا، آپی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی۔ "بس پتر۔ تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانہ پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔"

"پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔"

"جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا۔" روپہ بولی۔

"اس بھیڑ میں جائے۔ آپی بولی" یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اس کوٹھڑی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔"

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہوگئی۔ دل میں ایک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیانیں دھوؤں۔ کپڑے استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں۔ پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی "اب کیا حال ہے دھیے؟" میں نے رو رو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی۔ "وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟"

"اونہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔"

"ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟"

"نہیں آپی"

"کوئی بات نہیں۔" وہ بولی۔ "جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔؟"

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا ہے۔ آپی داخل ہوئی۔ بولی۔ "خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟"

"کون ہے؟"

"کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کیے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کے لئے دے دے۔ ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔" آپی ہنسنے لگی۔ بولی۔ "چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔"

"اونہوں۔" میں نے سر ہلا دیا۔ "نہیں آپی انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟"

"کتنی دیر کے لیے مانوں؟"

"جیون بھر کے لیے۔"

"سوچ لے۔ جو اباش نکلا تو؟"

"پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے، جیسا بھی نکلے۔"

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا۔ بولی۔ ''سودا نہیں کر رہی۔ وِدھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔''

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ ساز و سامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے قد آدم آئینے۔ جھاڑ فانوس۔ سبھی کچھ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ سمے کو سمے سے ٹکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیئے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیر نیا ہو۔

دور اس کواٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے تھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو،

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کانٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی، چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی۔ دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمیں چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنا لیا تھا؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی اسے حویلی سے نکال کر باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف اتنی بے نیازی کہ اتنی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس بیٹھی رہتی ہے اور پھر ٹوٹتی رات سمے اس کے کمرے سے گنگنانے کی مختلف آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا پر اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی۔ پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر ایک درخت گرد گھمایا اور اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''میں ہوں پٹواری۔ چودھرانی جی۔''

''تو جا۔۔۔۔ جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟''

''آپ ہی سے کام ہے۔'' وہ بولا۔

''تو بول، کیا کہتا ہے؟''

''گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے میں ٹھہرا دیں۔''

''ٹھہرا دو''۔ وہ بولی۔

''تو کر جا کر بندوبست۔۔۔۔۔'' وہ رک گیا۔

''سب ہو جائے گا۔''

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا۔'' کہاں سے آئے ہیں؟'' پٹواری بولا۔'' اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔'' ایک دھماکا ہوا۔ چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا۔'' جنت۔ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟''

جنت بولی۔'' لو چھوٹی چودھرانی۔ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں، ہو جاتا ہے۔''

''تو تیار رہو جنت۔ ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔''

''چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔''

''تو چل تو سہی۔'' چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا۔'' اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔ خبردار۔۔۔۔!''

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔'' کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل

ہوگئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا ''سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔''

''ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔'' چھوٹی چودھرانی بولی۔

''تو پھر؟'' سفید ریش گھبرا گیا۔

''ایک سوال پوچھنا ہے۔'' چودھرانی نے کہا۔

''سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔''

''سائیں بابا نے جواب دینا، انہوں نے پوچھنا ہے،'' وہ بولی۔

''کس سے پوچھنا ہے؟'' خادم بولا۔

''اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ با لکے ہیں۔'' یہ سن کر سفید ریش خادم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

''ان سے پوچھو'' چھوٹی چودھرانی نے کہا۔ ''ایک عورت تیر دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟''

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی۔ ''کہو وہ عورت پوچھتی ہے۔ تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔'' وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہوگئی۔ ''اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟'' یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

''تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔'' سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟'' وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہوگئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

''میری طرف دیکھ۔'' سفید ریش خادم نے کہا ''سنہری بائی۔ میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا، کیا ہوگیا۔''

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے چیخ نکلی۔ ''استاد جی آپ۔۔۔۔۔'' وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

''سنہری بی بی۔'' وہ بولا۔ ''مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا۔''

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ ''ٹھاکر۔۔۔۔'' وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا۔ ''اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا'' اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا۔ ''بی بی۔ ہمیں آشیرباد دے۔''

●●●

فروری ۲۰۰۸ء میں مخدوم کی پیدائش کو سو برس ہو رہے ہیں ذہن جدید مخدوم کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر اگلے چند صفحات پر اپنا خراج پیش کر رہا ہے۔

مخدوم کی نظم

زبیر رضوی

● آزادی کے ان ساٹھ برسوں میں شاعری پر جو باتیں ہوئی ہیں ان میں جس نظم کو ادبی مباحث میں سب سے زیادہ جگہ ملی اس کے لکھنے والے ترقی پسند نظم نگار تھے اس کی واضح وجہ یہ تھی کہ ترقی پسندی ہماری زبان کی تخلیقی سرگرمیوں کے ایک بڑے عرصے پر محیط رہی دوسرے غزل کے مقابلے نظم کو بطور ہیئت مقبول بنانے کی جس تحریک کا آغاز ۱۸۶۷ء میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے لکچر اور تحریروں سے ہوا تھا ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وہ نظم نگاری اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی یہ نظم اگر ایک طرف اپنے ہیئتی تجربوں کی بناء پر اپنے خدوخال کی صورت گری میں مصروف تھی تو دوسری طرف اپنے موضوعات اور اظہار کے مختلف پیرائے بھی اپنا رہی تھی ترقی پسندی کے ادبی تقاضوں کے تحت اگر نظم ایک خاص طرح کے اظہاری سانچوں میں ڈھالی جارہی تھی اور موضوع کے برتاؤ میں ایک جیسی یکسانیت اور رویے کی حامل نظر آنے لگی تھی تو اسی کے متوازی وہ نظم بھی تھی جو کسی ہدایت یا منشور کے دباؤ کے بغیر آزاد خیالی اور کسی بھی فکری پابندی کو قبول کئے بغیر لکھی جارہی تھی نظم کے اس ملے جلے منظرنامے پر جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند نقطہ نظر کے اعلان سے ہوا تھا ایک تفصیلی نظر ڈالنے کا یہ مناسب وقت ہے کہ اب مباحث کا جوش وخروش، تعصب اور دباؤ بڑی حد تک باقی نہیں رہا اور اب نئی ادبی فضا اور ذہن کے ساتھ تخلیقی احتساب اور تجزیے کی ضرورت ہے دراصل ادب کو سب سے بڑا نقصان کلشے اور مفروضوں سے پہنچا ہے ترقی پسند ہونا یا پھر غیر ترقی پسند ادبی رویے جب اپنے بعد کے تخلیقی دور میں اپنی شناخت اور اہمیت پر اصرار کرتے ہیں تو پھر ساری ادبی تاریخ اور اس کی تخلیقی ہل چل کو ایک مختلف تناظر میں دیکھنے کا تجزیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے گذرے ہوئے ادبی عہد نے اپنی تخلیقی ذہانتوں کی جو طویل فہرست سازی کی ہوتی ہے اسے نئے عہد کا قاری اور ناقد Short listed کر دیتا ہے اور یوں کئی دہائیوں تجزیے اور پرکھ کی بھٹی میں تپ کر تخلیق، سونا بن کر باہر نکلنے کا انتظار کرتی رہتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تخلیق اور تخلیق کار کے ادبی مرتبے اور اس کی ادبی حیات کی توثیق یا تصدیق کے لیے مذکورہ مدت بھی ناکافی ہوتی ہے فراق صاحب نے میرے ساتھ ریڈیو پر بات چیت کرتے ہوئے استادانہ بات کہی

تھی ’’سیاست میں صدر اور وزیر اعظم کی کرسی ایک پل بھی خالی نہیں رہ سکتی کہ اس میں آئینی بحران کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن ادب میں مسند صدارت برسوں خالی رہتی ہے اور وہ انتظار کرتی ہے کسی غالب کا کسی فراق کا‘‘۔

ادبی تاریخ میں زندہ رہ جانے کی توثیق پانے کی حسرت لئے کتنے ہی ادیب پیوند خاک ہو گئے لیکن ان کا یہ پیوند خاک ہو جانا بھی کبھی کبھی ادب کی اگلی فصلوں کے لئے کھاد کا کام کرتا ہے لیکن تخصیص یہاں بھی ہے کہ پیوند خاک ہونیوالے بھی ایسے کتنے ہیں جو کھاد کی صورت میں زمین کو زرخیز کر سکتے تھے تخلیق کب کیسے اور کہاں اپنے بے ساختہ پن کے ساتھ وجود پا جاتی ہے یہ اسی طرح ایک معمہ ہے جیسے زندگی —— ایک بات تو طے ہے اور وہ یہ کہ تخلیق تو کیکٹس کی طرح ہوتی ہے جو کسی بھی بنجر زمین پر پانی اور آب وہوا کی سازگاری کے بغیر اُگ آتی ہے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک تخلیقی اور اختراعی ذہن اپنے عہد کے قاری کی امیدوں کو پورا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ ’آگ کا دریا‘ جیسے ناول کی اردو دنیا میں غیر معمولی پذیرائی کے بعد ’گردش رنگ چمن نے قاری کی توقعات کو پورا نہیں کیا عالمی ادب کو "Tin Drum" جیسا ناول دینے والے جرمن ناول نگار گنتر گراس نے جب جرمنی کے اتحاد اور دیوار برلن کو گرائے جانے کو موضوع بنا کر نیا ناول Awide Field لکھا تو اسے پڑھنے کے لئے ایک خلقت بک اسٹالوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ لیکن چند ہی دنوں میں جرمن قارئین اور نقادوں نے اسے مایوس کرنے والا ناول قرار دیدیا۔ گنتر گراس نے جواباً وہی کہا جو میں ابھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ ’کلشے ‘ادب کی پرکھ کا صحیح پیمانہ نہیں بنتے گنتر گراس کا یہ ناول کئی طرح کے دائیں بائیں بازو کے کلشوں کا شکار ہو گیا یہ سلوک ’گردش رنگِ چمن‘ کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ایک قابل ذکر عرصہ گزرنے کے بعد کسی کتاب یا ادب پارے کے بارے میں مشہور کر دیئے گئے یا رائج کر دئے گئے کلشے سے ہٹ کر معروضی انداز میں اس سے متعلق تجزیاتی بحث میں حصہ لینا چاہیے اگر ہم شاعر مخدوم کی سرگرم سیاسی عملی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے دوسرے مجموعے ’گل تر‘ کی شاعری کو ترقی پسند ادب کے مروجہ ادبی نظریے اور ہدایتوں کو نظر انداز کرنے کا ردعمل کہنے پر اصرار کرتے ہیں تو اسے کلشے ہی کہا جائے گا جب کہ تخلیقی سچ یہ ہے کہ دوسرے ترقی پسند شاعر مخدوم کی طرح سرگرم سیاست کا حصہ نہیں تھے مخدوم کو اپنے سیاسی نقطہ نگاہ اور اشتراکی فکر کے اظہار کا مختلف محاذوں پر شب وروز موقع ملتا تھا اس لئے مخدوم کی شاعری سردار جعفری، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کی راست طرز کی بیانیہ شاعری کے حصار سے باہر سفر کرتی نظر آتی ہے۔

مخدوم اپنی رہائی کے بعد چار پانچ برسوں تک کمیونسٹ ملکوں کی دعوت پر دنیا بھر میں گھومتے رہے تھے۔ مخدوم کی رہائی کا زمانہ میں نے نہیں دیکھا کیوں کہ میں نے ۱۹۵۲ء میں مخدوم کی رہائی سے قبل حیدرآباد چھوڑ دیا تھا اور دلی آ گیا تھا میں حیدرآباد سے یادوں کی صورت جو جذباتی خزینہ اپنے ساتھ دلی لایا تھا اس میں شاعر مخدوم کا وہ باغی اور انقلابی امیج بھی تھا جو ایک آئیڈیل کی صورت میرے ذہن پر نقش ہو کے رہ گیا تھا۔ سجاد ظہیر نے کہا تھا ’’اگر مخدوم کی شاعری میرے ساتھ نہ ہوتی تو میری زندگی کتنی تہی دست ہوتی‘‘۔ مخدوم کی نظم

'اندھیرا' فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی نظم تھی۔ ناول نگار عزیز احمد نے اعتراف کیا ہے کہ 'مخدوم کی نظم 'انقلاب' اردو کی ایک اچھوتی نظم ہے جس میں انقلاب اور عشق دونوں یک جا ہو گئے ہیں۔'' ان باتوں نے مخدوم کی شاعری میں میری دلچسپی کو مہمیز کیا کہ میں اب تک تو مخدوم کے طلسماتی اور داستانی حسن رکھنے والی شخصیت کا گرویدہ اور قصیدہ گو تھا۔ تلنگانہ تحریک اور مخدوم کے 'سرخ سویرا' کا یہ اثر تھا کہ 'کامریڈ لال سلام' کہہ کر ہم اپنے کسی ہم خیال کی پذیرائی کچھ ایسے جذبے کے ساتھ کرتے تھے جیسے ''اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں'' ہمارے اردگرد جو ترقی پسند ادبی فضا تھی جو کمیونسٹ موومنٹ تھی اور اشتراکیت میں رچا بسا جو ماحول تھا اس میں مخدوم شہ نشیں بنے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں ایک افسانوی کردار بن گئے تھے لیکن دلی اور لکھنو کے لیے ان کا وہ افسانوی کردار اپنے قصوں کہانیوں کے ساتھ نامعلوم تھا۔

مخدوم نے اپنے مجموعے 'سرخ سویرا' کو 'محبت اور محنت' کے نام معنون کیا تھا اور یہ بے حد موزوں انتساب تھا کیوں کہ مخدوم کے اس پہلے مجموعے میں رومانی شاعری بھی تھی اور باغیانہ خیالات کی حامل وہ شاعری بھی جو ہر نوجوان ذہن کو پسند آتی ہے۔ مخدوم کی رومانویت بڑی حد تک ویسی ہی ہے جو اختر شیرانی کی شاعری کا وصف تھی۔ مخدوم کی نظر ہر اس منظر پر جم کے رہ جاتی ہے جس میں کوئی حسین چہرہ موجود ہو۔ 'سرخ سویرا' کی پہلی ہی نظم 'طوز' کا وہ مصرعہ ''خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے'' اسی طرح عاشقوں میں مقبول ہوا تھا جیسے فیض کا مصرع ''ہائے اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے لب''۔ مخدوم ہی کیا اختر شیرانی کے تخلیق کردہ نظم کے عشقیہ منظر نامے سے کوئی رومانی فطرت شاعر بچ نہ سکا تھا جس طرح حسرت نے پہلی بار غزل میں ایک زندہ نسائی پیکر کا احساس دلایا تھا اسی طرح اختر شیرانی نے نظم میں اپنی محبوبہ کو نام دے کر اس کے رومان پرور وجود کو اجنتا ایلورہ کے نسائی پیکروں اور ان کی شبیہوں جیسا دلاویز و دلکش بنا دیا تھا ترقی پسند نظم کا عشقیہ خمیر بڑی حد تک اختر شیرانی کی رومانی نظموں کی دین تھا۔ یہ بات دل چسپ ہے کہ 'سرخ سویرا' کی اشاعت کے آس پاس ہی فیض کا 'نقش فریادی'، ن۔م راشد کا 'ماورا' اور اختر الایمان کا 'گرداب' نام کے پہلے شعری مجموعے شائع ہوئے تھے اگر ان چاروں ہم عصر شاعروں کے اولین شعری مجموعے کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو 'سرخ سویرا' پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ مخدوم کی نظم 'انتظار'، 'انقلاب' اور 'اندھیرا' ہی اپنے غیر معمولی تاثر کی بنا پر ہم سے داد طلب ہوتی ہیں۔

ترقی پسند شاعری میں اور اس سے قبل جوش کی شاعری میں جو لہجے کی صلابت تھی اس کی چھوٹ مخدوم پر بھی پڑی تھی، جس تشدد توڑ پھوڑ، اتھل پتھل کو انقلاب سے وابستہ کیا جاتا رہا تھا اسے پہلی بار مخدوم نے ایک ایسے انسانی خواب کی صورت میں دیکھا جو شاعری کی نگاہ میں انسان کو توہمات سے نجات دلانے والا اور شمیم عدل سے کوچہ و بازار کو مہکانے والا ہوگا جب وہ آئے گا تو ایک اندازِ مریمی کے ساتھ آئے گا اور جب آئے

گا تو رخ حیات پر کاکل کی طرح بکھر جائے گا ایسے انسان دوست انقلاب کی آمد کا منتظر سارا انسانی معاشرہ بنتا ہے جو ایک آواز ہو کر کہتا ہے ''گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے''۔ مخدوم نے نظم 'اندھیرا' میں جو جنگ کے خلاف اٹلی اور جرمنی کی سرزمین سے اٹھنے والے فاشزم کے طوفان کی ایک طاقتور مزاحمت کا درجہ رکھتی ہے اپنے اُس نظمیہ ڈکشن کی بنیاد رکھ دی تھی جس کی آبیاری انھوں نے 'گلِ تر' کی نظمیں لکھ کر کی۔ 'اندھیرا' نظم اپنے آہنگ اور اثر میں بڑی دیرپا ہے اس طرز کی نظم اوپر مذکورہ کسی شعری مجموعے میں نظر نہیں آئی۔ اسی طرح مخدوم کی عشقیہ نظم 'انتظار' بے پناہ نظم ہے اس کو پڑھتے ہوئے فیض کی نظم 'تنہائی' یاد آتی ہے۔ دونوں نظمیں انتظار کے جانے پہچانے انسانی جذبے کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنی لے اور اپنے آہنگ کے الگ ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ فیض کی نظم تشریح اور تفہیم کے کئی کھانچے چھوڑ دیتی ہے جو اس نظم کے ساتھ ہوا بھی مگر مخدوم کی نظم جذبے کو مربوط انداز میں بیان کرتی ہوئی مضطرب آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی

یہ انتظار اور اس کا کرب وہی ہے جو اس شعر کا ہے:

کِا کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کو کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

'سرخ سویرا' میں شاعر کی امن دوستی اور جنگ کو انسانیت کے لئے تباہ کن تجربہ کہنے کا احساس اپنے معاصرین کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے جنگ کی لائی تباہی کے ساتھ اس کو روکنے کے عمل میں بھی شاعر کی دلچسپی غیر معمولی دردمندی کے ساتھ 'نظم سپاہی' میں محسوس ہوتی ہے دوسری جنگ عظیم نے جس بے دردی کے ساتھ دنیا کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا 'سپاہی' اس المیے کا ایک حزنیہ شعری اظہار ہے جو سویرا ہونے کی نوید پر ختم ہوتا ہے۔

ترقی پسند شاعری کا طرۂ امتیاز بننے والی شاعری میں فیض اور مخدوم دو ایسے ہم مزاج شاعر ہیں جو اپنے دوسرے اور اس کے بعد کے مجموعوں میں اپنی شاعری اور پیرایۂ اظہار کو ہلکے بیانیہ کے بجائے اسے مزید تہ داری سے آراستہ کرتے ہیں اپنے واضح سیاسی کمنٹ منٹ کے باوجود وہ نظریے، آدرش اور سیاسی مینی فیسٹو کو اپنی شاعری میں ارادتاً راہ نہیں دیتے۔ فیض نے اپنی شاعری پر ترقی پسندی کے ایسے خارجی دباؤ سے زنداں نامے تک آتے آتے رہائی پالی تھی۔ مخدوم کے 'گلِ تر' کی پہلی نظم 'قیدِ زندانی ادب کی ایک ایسی منفرد نظم ہے جو اس سلسلے کی بے شمار نظموں میں اپنی ہی پہچان رکھتی ہے اس نظم کی زیریں لہر فیض کی کئی نظموں کی یاد دلاتی ہے۔ سردار

جعفری کی خوبصورت نظم 'اودھ کی خاک حسیں' کی بھی یاد آتی ہے لیکن مخدوم کی نظم جعفری کی نظم کے مقابلے ایک توانا احساس پر ختم ہوتی ہے۔

مجھے غم ہے کہ میرا گنج گراں مایہ عمر رندِ رزنداں ہوا رندِ ر آزادیِ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

وطن کی سربلندی کے لئے کٹ مرنے اور اس کی آزادی کی خاطر سب کچھ کرگزرنے کا احساس مخدوم کی شاعری کا ایک غالب عنصر ہے۔ جو 'سرخ سویرا' میں صف آرائی کرتا نظر آتا ہے اور یہی جذبہ 'گلِ تر' کی کئی نظموں میں اپنی خوشبو سے ہوا کے دامن کو بھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

'گل تر' ایک طرفہ شعری واردات تھی جو کسی آثار اور احوال کا پتا دیے بغیر واقع ہوگئی۔ حالاں کہ مخدوم اپنی نظم 'اندھیرا' میں ردیف قافیہ والے چار چھ مصرعوں کی پسندیدہ ہیئت کو ترک کرنے کی خبر دے چکے تھے 'گل تر' کی نظم، قید، چارہ گر اور چاند تاروں کا بن، غنائیت سے لبریز ایسی نظمیں ہیں جو بے حد دل نشین ہیں ۔'چارہ گر' انسان کو عطا ہونے والے عشقیہ جذبے کے سرخرو لمحوں کی زائیدہ نظم ہے ایسے لمحوں میں پیار کئی مرحلوں سے گزرتا ہوا اپنی ابدیت کا اقرار کرتا ہوا کبھی حرفِ دعا اور کبھی خدا بن کر اپنا مقتل بھی آپ بن جاتا ہے حُسنِ ازل تاب کے روبرو اپنی آہوتی دینے والا یہی پیار مداوا بھی ڈھونڈتا ہے مگر چارہ گر کی زنبیل میں محبت کے حق میں کیمیا بن جانے والا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ نظم وصل اور پھر تشنہ وصال اور دل شکستگی کا ایک پر درد پروسہ بن جاتی ہے۔

'چاند تاروں کا بن' آزادی ملنے اس کے بعد اور آگے کے مضمون کو کچھ ایسے دردمند لہجے میں بیان کرتی ہے کہ اس موضوع پر لکھی بے شمار ترقی پسند نظمیں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ صرف فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا' اور اختر الایمان کی نظم اپنا حسن برقرار رکھتی ہیں۔ مخدوم کی نظم میں غیر معمولی رمزیہ تہ داری ہے اور اس نظم کے بعض مصرعے تو بے پناہ ہیں رات کی شہ رگوں سے اچھلتا لہو رجوئے خوں بن گیا ر رات کی کچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے/ ہمد موہاتھ میں ہاتھ دور سوئے منزلِ چلو رمنزلیں پیار کی رمنزلیں دار کی رکوئے دلدار کی منزلیں ردوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو۔

یہ نظم اندھیرے میں اجالے کی کامیاب تلاش کی نظم ہے ایک ایسی رجائیت جو پسپائی اور انہدام کا ملبہ ہٹا کر اوپر ہاتھ پاؤں ماری ہوئی آجاتی ہے۔ 'گل تر' کا حاوی لہجہ، شگفتگی، تازگی اور زندگی آمیز ہو کر اس کی نشاط آفرینی کو پورے انسانی کنبے کی دسترس میں لانا چاہتا ہے۔ مخدوم نے 'گل تر' کی بدلی ہوئی شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے دیباچے میں لکھا تھا:

''یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربے اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے پھر انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہے۔''

ترقی پسند ادب میں خواہ وہ شعری ادب ہو یا افسانوی اس میں ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرنے کا

رویہ بڑا حاوی ہے اردو میں مزاحمتی اور احتجاجی ادب کی بناء رکھنے میں ترقی پسندوں کے افسانے اور شعری سرمایے نے ایک اہم رول ادا کیا ہے نظمیہ شاعری میں مزاحمت، احتجاج اور انحراف کا رجحان کم وبیش ہر شاعر کے یہاں نظر آتا ہے لومبا کے قتل پر مخدوم کی نظم اسی احتجاج کو ہر پل شعلہ رو رکھنے کی تحریک دیتی ہے یعنی خاموشی کے ساتھ ظلم و جبر نہ سہو اس کے خلاف صف آرائی بھی کرو آواز بھی بلند کرو

جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا
چپ نہ رہو، چپ نہ رہو

ہر انقلاب خون بھی مانگتا ہے اور ستون دار پہ سروں کے چراغ بھی اور اگر جبر شدید ہو اور لبوں کو سی دیا گیا ہو اور درِ زنداں دار و گیر کی زنجیروں سے گونج اٹھا ہو تو سرفروش ہر حلقۂ زنجیر کو احتجاج اور مزاحمت کی زبان دیکر اپنے پر ہر آسائش کو حرام کر لیتے ہیں

درد کی رات ہے چپ چاپ گذر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ

مخدوم کی نظم 'وقت بے درد مسیحا' وقت کے بے رحم سلوک اور اس کی ستم رانیوں کے طفیل ملنے والے درد کا مداوا نہ چاہنے والے انسانی حوصلے کو مہمیز کرتی ہے

درد کی کہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات
رات اک ساقی بے فیض کی مانند گذر جاتی ہے
گذر جانے دو
وقت:
او مشفق و محسن قاتل
رات کی نبض پہ نشتر رکھ دے
رات کا خون ہے
بہتا ہے تو بہہ جانے دو

یہ صحیح ہے کہ اپنے معاصر نظم نگاروں کے مقابلے میں مخدوم کی نظموں کا سرمایہ زیادہ نہیں ہے لیکن یہ سرمایہ قلیل ہوتے ہوئے بھی غیر اہم نہیں ہے اس سرمایے میں قید، چارہ گر، چاند تاروں کا بن اور وقت بے درد مسیحا ایسی نظمیں ہیں جو مخدوم کو ہر دور کے نظم نگاروں کی صف میں سرخرو رکھے گیں اور نظم کے کسی بھی سخت گیر انتخاب میں بلا تامل جگہ پائینگی .... ●●

جدیدیت اور مخدوم

علی ظہیر

● اس سے پہلے کہ مخدوم کی شاعری میں جدیدیت کے ہونے یا نہ ہونے کی بات کی جائے ہم جدیدیت کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرلیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اردو میں یہ اصطلاح انگریزی سے Modenisim کے ترجمے کے طور پر آئی۔ ماڈرن کا ترجمہ جدید ہے جس سے جدیدیت بنا۔ جدید عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں نیا، تازہ، حال کا وغیرہ۔ ہماری کلاسیکل شاعری میں اب بھی کسی نئے رنگ یا ڈھنگ سے بات کہی جائے تو اسے جدت پیدا کرنا کہتے ہیں اور اسے اچھا سمجھا جاتا ہے۔ جدید ہونے میں تو کوئی خرابی نہیں۔ لیکن جدیدیت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے۔ جب کہ مغرب کے تمام فنون لطیفہ میں اوایل بیسویں صدی ہی سے جدیدیت ایک لازمی چیز تصور کی جاتی رہی ہے۔ وہاں جدیدیت ادب سے پہلے مصوری اور آرکی ٹیکچر میں شروع ہوئی۔ خاص طور سے مصوری میں سے ایک لازمی عنصر یہ سمجھا گیا چنانچہ مغربی دنیا کے تمام بڑے آرٹسٹ انیسویں صدی ہی سے ماڈرن کہلانے لگے لیکن ان کی پہچان مختلف ہیئتوں کے ذریعہ ہوئی۔ امپریشنزم، آواں گارد، سریلیسٹ اور کیوبزم وغیرہ۔ ان فارمس کے استعمال کرنے والے مذہبی بھی تھے، لامذہب بھی تھے اور مارکسسٹ بھی تھے۔ بیسویں صدی کا مشہور آرٹسٹ پکاسو جو کیوبیزم کا بھی بانی ہے کہ شہرۂ آفاق پینٹنگ ''گورنیکا'' 1930ء میں ہوئی سپین کی خانہ جنگی سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہے۔ اسی طرح آرکی ٹیکچر اور دیگر تخلیقی فنون میں بھی جدیدیت بغیر کسی سیاسی رجحان کے داخل ہو گئی۔ جدیدیت کسی بھی سیاسی یا مذہبی نظریہ رکھنے والے فن کار کا لازمی طریقہ کار رہا ہے۔ مغربی ادب میں جدیدیت انیسویں صدی میں فرانس کے شاعر بودلیئر سے شروع ہوئی۔ یہ روایت انگریزی میں ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ایزرا پاونڈ کے ہاں بیسویں صدی میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی عروج پر پہنچ گئی۔ یورپ اور لاطینی امریکہ کے مارکسسٹ یا کمیونسٹ شاعر بھی جدید ہی تھے۔ وہ چاہے فرانس کے رومین رولاں یا انقلابی شاعر لوئی اراگاں یا انگریزی کے ای ایم فاسٹر ہو یا، تھامس مان یا روس کے میکسم گورکی یا پاسترناک ہوں سب اپنی بات اپنا احتجاج جدیدیت ہی میں کر رہے تھے۔ دنیا کو فاشزم اور سرمایہ داری کے برے پہلو سے بچانے ہر طرف سے ادب اور فلسفے سے وابستہ لوگ اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان فن کاروں کی تخلیقات کا رشتہ ان سے کیا تھا یہ علی سردار جعفری سے سنئے ''اتفاق سے دسمبر 1954 میں اس مسئلے پر فرانس کے عظیم انقلابی شاعر لوئی اراگوں سے ہوئی۔ ہم دونوں لینن گراد سے ماسکو تک ہم سفر تھے۔ اراگوں اپنے کوپے سے اٹھ کر میرے کوپے میں آگئے اور تین چار گھنٹے باتیں کرتے رہے جن میں جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانس کے ادیبوں کی جنگ بھی شامل تھی۔ جواہر لال نہرو، ملک راج آنند اور سجاد ظہیر کا ذکر بھی اور یہ مسئلہ بھی کہ فن کار کی ذات اس کی تخلیق کو کیا عطا

کرتی ہے۔ انھوں نے پکاسو کے حوالے سے یہ بات کہی کہ فاشزم اور جنگ کے خلاف اس کی شہرہ آفاق پینٹنگ میں رنگوں سے زیادہ خوب صورت پکاسو کی روح ہے اور اس میں احتجاج کی جو طاقت ہے وہ سچے فنکار کے دل کی پکار ہے۔" آگے چل کر جعفری کہتے ہیں، "1954 میں لوئی اراگوں اور سارتر کے تعلقات خاصے خراب تھے۔ اور اختلاف نظریاتی تھا اور دونوں اس بات پر متفق تھے کہ جاودانی ادب وہ ہوتا ہے جس میں روح عصر ہوتی ہے۔ اور روح عصر کے بغیر ترقی پسند تحریک کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔" (ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔ از: سردار جعفری)

ترقی پسند تحریک کی ابتداء کرنے کا اعزاز ہندوستان کے ادیبوں کو اس وقت حاصل ہوا جب 1935 میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور دوسروں نے مل کر لندن میں پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ پھر April, 1936 میں اسی انجمن کو لکھنؤ میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء نے ہندوستان میں بھی قائم کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی ہر اہم زبان کے ادبی منظرنامے میں ترقی پسند تحریک نظر آنے لگی بقول سردار علی جعفری، "اس اعتبار سے ترقی پسند تحریک، ہندوستان کی تین چار ہزار برس کی تہذیبی تاریخ میں ادب کی اور فکر کی سب سے بڑی غیر مذہبی تحریک تھی اور ایسی تحریک، جس کے رشتے ہندوستان کی تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ یوروپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ بھی قائم ہو گئے تھے جن میں انگریزی، فرانسیسی اور روسی زبانوں کو خاص اہمیت ہے۔" (ترقی پسند تحریک کی نصف صدی۔ از: سردار جعفری)۔ یقیناً یہ تحریک ہم اردو والوں کے لئے قابل فخر بات ہے کیوں کہ اس نے ساری دنیا کے ادب کو متاثر کیا۔ ہمارے ہاں آزاد و حالی کے زمانے کے نیچرل ادب سے لے کر مابعد جدید اور آج کے زمانے تک کے ادب میں مغرب کی کم و بیش تقلید ملتی ہے۔

دراصل جدیدیت کا ترقی پسندی سے تقابل کرنا ایک بے مقصد بات ہوگی کیوں کہ یہ دو جداگانہ رویے ہیں ایک کا تعلق اظہار کے طریقے سے ہے اور دوسرے کا مطلب سے ہے۔ اور جدیدیت کو ترقی پسندی کے بعد شمار کرنا بھی صحیح نہیں اسی لیے وحید اختر کا یہ مشہور بیان کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے بالکل غلط ہے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ترقی پسندی جدیدیت کی توسیع ہو سکتی ہے کیوں کہ جدید طرز اظہار کے سانچے پہلے بنے اور اشتراکی نظام کی پیروی بعد میں شروع ہوئی۔ بقول علی سردار جعفری اردو میں جدیدیت حالی کے زمانے میں شروع ہوئی۔ "حالی جدید شاعری کے بانی ہیں۔" (سردار جعفری۔ ترقی پسند تحریک کی نصف صدی)۔ ہر عہد کا ایک سچ ہوتا ہے اور اپنے عہد کے سچ کو دریافت کرنا ہی جدیدیت ہے۔ غالب انہیں معنوں میں جدید شاعر تھے۔ سچ جتنا جانا جائے گا اس کے بیان کے طریقے بھی اتنے ہی وسیع یا مختلف ہوں گے۔

مخدوم محی الدین نے جس معاشرے میں نشوونما پائی وہ تھا تو فیوڈل ہی لیکن یہ صرف جاگیردارانہ ماحول نہیں تھا بلکہ اس معاشرے میں بہت واضح تضاد بھی تھے اور ان تضادات کو مٹانے کی ایک کوشش بھی تھی۔ اس کوشش کی ایک اہم کڑی عثمانیہ یونیورسٹی تھی۔ مخدوم کا تعلق اس کے اولین دور سے تھا جہاں سے انہوں نے بی اے کی ڈگری لی تھی انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی جدیت کے اس شعور کو حاصل کر لیا تھا جس کا

سلسلہ بعد میں عوامی جدو جہد اور کمیونسٹ پارٹی سے جڑا۔ بحیثیت شاعر انہوں نے ابتداء پابند شاعری سے کی ان کے پہلے مجموعے کلام سرخ سویرا جو 1944 میں شائع ہوا تھا میں اکاون نظمیں اور گیارہ قطعات شامل ہیں اس میں کوئی غزل نہیں ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر ایک نئی سمت اور نئے لہجے کی تلاش میں ہے یہ نیا لہجہ اور نئی سمت کی تلاش دراصل عصر حاضر کی روح کو جاننے کی کوشش ہے۔ خود مخدوم کو اپنی شاعری میں تبدیلی کا احساس تھا لیکن یہ انھیں 'گل تر' کی شاعری میں محسوس ہوا کیوں کہ اس میں واضح انحراف ہے لیکن دراصل سرخ سویرا کی شاعری میں ہی یہ عمل شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ بساط رقص میں "پڑھنے والوں سے" کے عنوان کے تحت مخدوم لکھتے ہیں، "شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے، شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدل جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے اپنے تجربے کی بنا پر۔ جب آپ 'گل تر' پڑھیں تو شائد آپ بھی اس عمل سے گزریں، ذہن سرخ سویرا اور گل تر میں مقابلہ بھی کرنے لگے گا۔ شائد یہ بھی خیال آئے گا کہ یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفس مضمون، حقیقت وندرت جمالیاتی کیف وکمیت اور تاثر کے اعتبار سے سرخ سویرا سے مختلف ہے۔" اس نظم میں پہلی بار مخدوم نے مروجہ آہنگ کو چھوڑ کر شاعری کی ہے اور یہیں سے ان کی شاعری کا وہ جدید دور شروع ہوتا ہے جوان کو مارکس وادی رہتے ہوئے بھی حقیقی معنوں میں ایک جدید شاعر بنا دیتا ہے۔ نظم 'اندھیرا'

رات کے ہاتھ میں ایک سہ دریوزہ گری/ یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن/ یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ/ وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم/ خندقیں/ باڑھ کے تار/ باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ/ وہ تڑختے ہوئے سر/ میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک / سرد ہوا / نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا/ کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی/ چاند کے تاروں کی ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم/ صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں/ رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جس طرح نظم میں پیکروں کو توڑ کر جیگا پوز کیا گیا ہے اسی کی مناسبت سے نظم کے عروضی سانچے کو بھی توڑا گیا ہے۔ نظم شروع ہوتی ہے۔ بحر رمل مثمن محذوف سے جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے۔ چھے مصرعوں تک تو یہی بحر ہے لیکن اس کے بعد جیسے ہی پیکر منتشر ہوتے ہیں بحر بھی ٹوٹتی ہے اور یہ مصرعہ آتا ہے: وہ تہذیب کے زخم رخندقیں رباڑھ کے تار اس طرح نظم آگے بڑھ کر ایک دائرہ بناتی ہوئی "رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں" کی تکرار پر ختم ہوتی ہے۔ یہ نظم 1935 میں ہسپانیہ میں ہونے والے عوامی احتجاج کو فاشسٹوں کی جانب سے کچلنے کے رد عمل کے طور پر لکھی گئی۔ لورکا جو ہسپانوی عوام کا ضمیر تھا کو فاشسٹوں نے نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کیا تھا۔ ساری دنیا کے ادیب دانشور اس کے خلاف اپنے اپنے انداز میں احتجاج کر رہے تھے۔ پکاسو کی مشہور پینٹنگ گویرنیکا کے محرکات میں یہ واقعہ بھی تھا۔ الیکسی سوخا چیف

کہتے ہیں، ''مخدوم محی الدین کو اس ملک کی خانہ جنگی سے کتنی دل چسپی تھی اس کا اندازہ اس امر واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے لکھنے پڑھنے کی میز پر پکاسو کی مشہور تصویر گویرنیکا کی نقل آویزاں رہتی تھی اور نظم ''اندھیر'' میں جو انھوں نے ''دھواں'' کے کچھ عرصے بعد ہی لکھی تھی دراصل انھیں خیالات کو الفاظ میں ظاہر کیا ہے جنھوں نے پکاسو کے پاس تصویر کا روپ دھارا ہے۔ محققین نے بارہا اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اس نظم میں بھی اسی موضوع کو آگے بڑھایا گیا ہے جو ہسپانوی فن کار کی تصویر کا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ اس کے لیے فن کے دوسرے ذرائع کو کام میں لایا گیا ہے۔ شاعر ویرانی، فسطائیت کے جرائم اس کے ہاتھوں پھیلی ہوئی تباہی اور موت کی دہشت ناک تصویر دیکھتا ہے۔'' (مخدوم محی الدین، الیکسی سوخاچیف، ترجمہ اسامہ فاروقی)۔ جن معنوں میں ہم پکاسو کے کام کو جدید مصوری کہتے ہیں انھیں معنی میں مخدوم کی شاعری بھی جدید شاعری ہے۔

لیکن خود شاعر کو اپنے انداز میں تبدیلی کا احساس ''گلِ تر'' کی شاعری سے ہوتا ہے۔ ''یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقاء کی نشان دہی کرتا ہے، پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہیں۔''
(مخدوم۔ بساطِ رقص)

مخدوم کی شاعری روح عصر کی تلاش میں جدید سے جدید تر کی طرف ہمیشہ گامزن رہی۔ گل تر کی ساری مشہور نظمیں، چارہ گر، آج کی رات نہ جا، چاند تاروں کا بن، وغیرہ کے سرخ سویرا کی شاعری سے الگ ایک طرح کا بدلاؤ ہے جو ہر بڑے فن کار کے پاس ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جن نئے مسائل کا سامنا اس وقت کے سماج کو تھا اس سے پورا سروکار رکھتے ہوئے مخدوم نے ہمیشہ سچ کو پانے کی کوشش کی۔ ان کے آخری زمانے کی نظمیں، لختِ جگر، سناٹا، نیا سال اور بلور اپنے پورے احساس اور جذبے کے ساتھ ساری کی ساری جدید ہیں۔

سناٹا کوئی دھڑکن/ نہ کوئی چاپ/ نہ سنچل/ نہ کوئی موج/ نہ ہلچل/ نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن/ ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتا کھڑکے/ کوئی پگھلا ہوا موتی کوئی دل/ کچھ بھی نہیں
/ کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر/ کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے۔

اسی طرح ان کی نظم بلور کے یہ مصرعے دیکھیے

منور خموشی کے بلور چھلکے/ کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی کلی چٹکی، آواز کے پھول مہکے/
رنگوں کے سروں کی کہکشاں کھل کھلاتی ہوئی گود میں آپڑی ہے/ خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ کی سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو/ اندھیرے کے پردے ہلے، ساز چونکے
[illegible] نور کی انگلیاں جگمگائیں/ شفق در شفق رنگ در رنگ/ عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے/ دھنک سامنے ہے/ کسی کو یہ قصہ سناؤں تو کیسے قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے

یہ نظم 4 دسمبر 1966 کو لکھی گئی تھی اگر ہم اس دور کی جدید شاعری کا مطالعہ کریں تو مخدوم کی یہ نظم اپنے پیرائے اظہار، اس کے علامتی نظام اور ہیت کی وجہ سے اپنے زمانے کی دیگر نظموں میں ممتاز نظر آئے گی جیسا

کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں عصر حاضر کی روح کو جاننے کے لئے مخدوم نے ہمیشہ جدیدت کا سہارا لیا۔ان کی شروع کی شاعری میں بھی نئی لفظیات جیسے نئی دنیا، نیا آدم وغیرہ یا پھر مذہبی استعارے جیسے نظم ''جہان نو'' میں ایک مصرع ہے باطل کی گردنوں پر چمک ذوالفقار بن ذوالفقار کے باطل کی گردنوں پہ چمکنے کا استعارہ مذہبی تلمیح بھی ہے دنیا کی تعمیر نو کے لئے نبرد آزما ہونے والے کو مخاطب کرتے ہوئے شاعران تلمیحات کا سہارا لیتا ہے، جن کا تعلق اسلامی مذہبی روایات سے ہے اور جو اس کے قارئین کے لیے محتاج تعارف نہیں۔'' (مخدوم محی الدین الکیسی سوغا چیف)

دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح مخدوم نے بھی اقبال کی شعری روایات کو آگے بڑھایا ہے لیکن مخدوم اقبال کے اثر سے خود کو الگ کرنا بھی جانتے تھے مخدوم کا 'نیا آدم' اقبال کے 'انسان کامل' کا تسلسل ہے لیکن الگ ۔مثبت انسان کامل کو صرف اسلامی سیاق وسباق میں دیکھا جا سکتا ہے ورنہ نطشہ کا بھی ایک انسان کامل تھا جس نے ہٹلر کی منفی شکل اختیار کی نیا آدم وہ ہے جو کسی مذہبی یا فلسفیانہ حد بندیوں سے آزاد ہے نیا آدم ایک مثبت انسان ہے یہ آزاد آدمی صرف ایک آزاد سیکولر اور جمہوری نظام ہی میں مل سکتا ہے یہی آزاد آدمی اس آزاد وفکر کا حامل ہو سکتا ہے جو جدید بھی ہو اور ترقی پسند بھی۔

آخر میں مخدوم کی غزل گوئی کا تذکرہ بھی ضروری ہے مخدوم کے قاری کو یہ بات ضرور محسوس ہوتی ہے کہ سرخ سویرا کی شاعری میں غزل نہیں لیکن گل تر میں غزل موجود ہے یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ سرخ سویرا کا کلام آزادی سے پہلے کا ہے اور گل تر کا بیشتر کلام آزادی کے بعد کا ہے میرا خیال ہے کہ سماجی ،معاشی اور سیاسی قید و بند کے ماحول میں غزل مزید ایک اور قید معلوم ہوتی ہوگی جب کہ نظم بالخصوص آزاد نظم کم از کم فکری اور تخیلاتی سطح پر ایک آزادی کا احساس دلاتی ہے شاید یہی نفسیاتی وجہ رہی ہو کہ مخدوم نے سرخ سویرا میں غزل سے اجتناب کیا لیکن مابعد نو آبادیاتی post colonial دور میں انہیں غزل کہنا ایک جمہوری عمل محسوس ہوا ہو کہ وہ عوام کی پسندیدہ صنف سخن رہی بہر حال چاہے وجہ کچھ بھی رہی ہو مخدوم نے جتنا نظم کی ہیئت میں جدید طرز فکر کو اپنایا اتنا ہی انہوں نے غزل میں بھی برتا، میں غزل کے چند اشعار پیش کر کے اپنی بات کو یہیں ختم کروں گا:

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی — غم کی لو تھر تھراتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے — چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا — کوئی آواز آتی رہی رات بھر

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں — موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

دوستو ایک دو جام کی بات ہے — دوستو ایک دو گام کی بات ہے

ہاں اسی کے در و بام کی بات ہے، — بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو

شاعری نہ تو پیغمبری ہے نہ ساحری لیکن یہ حدیثِ دلِ فتنہ ساماں و دلِ غم زدگاں ضرور ہے اور اس کے عرفاں کے لیے بقول مخدوم 'ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی' چاہیے۔

●●●

مخدومؔ کا تصورِ عشق

سید بشارت علی

● مخدومؔ کے تصورِ عشق میں جو چیز بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ ہے ''عشق کی دوامیت'' یعنی عشق لافانی ہے اور ابتدائے ازل سے ابد کی سرحد تک رواں دواں ہے۔ لیکن عشق کی اصلیت کیا ہے؟ عشق آگ ہے۔ ایک ایسی آگ جو زندگی کو تب و تاب عطا کرتی ہے۔ ایک ایسی آگ جس میں جل کر فنا ہو جانا گویا روحانی بقا حاصل کرنا ہے۔ یہ وابستگی ہے خود اپنے آپ سے، محبوب سے، زندگی سے، موت سے، کائنات سے، خدا سے، یہ وہ مسجود ہے جو سجدہ گزار کو ہر ایک کی بندگی سے آزاد کر دیتا ہے۔

دو بدن/ پیار کی آگ میں جل گئے/ پیار حرفِ وفا/ پیار ان کا خدا/ پیار ان کی چتا (چارہ گر)

یہ وہ کیفیت ہے جو انسان کی روح کو کائنات اور کفر اور دین کی سرحدوں سے ماورا لے جاتی ہے اور اسے ترفع بخشتی ہے۔

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

(چارہ گر)

عشق ایک ایسی صدا ہے جو صورِ اسرافیل کے پھونکے جانے تک فنا نہیں ہو سکتی اس صدا کو صلیب پر لٹکایا گیا تو وہ فرش سے بلند ہو کر عرش تک جا پہنچی، انسانیت کی رہ نمائی اور دلوں پر حکمرانی کرنے لگی۔

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنوئیں میں / مگر ایک آواز پیچھا کرے گی/ ....

وہ آواز / ناخواستہ طفلکِ بے پدر/ ایک دن/ سولیوں کے سہارے

بنی نوعِ انساں کی ہادی بنی / پھر خدا بن گئی (لختِ جگر)

لیکن عشق کے منازل کو طے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بقول بوعلی قلندر:

عشق است وصد آفات ومحن لازم وملزوم
ایں منزلِ دشوار ورہِ سخت دراز است

عشق اک درد ہے/ درد دنیا میں جو آیا تو دوا بھی آئی

لیکن یہ ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں، کوئی علاج نہیں۔

اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا
درد پیدا ہوا درماں کوئی پیدا نہ ہوا

چونکہ یہ درد ''ابدیت'' کی صفت کا حامل ہے ایسا کوئی چارہ گر ہے نہ ہوا ہے نہ ہوگا جو اس درد کی دوا نکال لائے۔

از ازل تا ابد/ یہ بتا چارہ گر/ تیری زنبیل میں/ نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے۔
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟ (چارہ گر)

عشق کے دردوغم کو علاج و مداوا سے نسبت ہی کیا۔ اسے تو اور فزوں ہوتے رہنا چاہئے۔

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدہ شیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

اور وہ اس لیے محبت کیمیا ہے اور ایسی کیمیا جو روح کو تمام آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک کر کے طہارت و لطافت عطا کرتی ہے۔ اور صرف روح ہی نہیں بلکہ ذہن خرد، فکر و فرزانگی بھی محبت ہی سے شگفتگی اور تازگی، تابش و تجلی حاصل کرتے ہیں۔

وہ عطر تری کاکل شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد، روح کلی بن کے کھلی ہے

عشق انسانیت کے لیے اعلیٰ ترین قدر ہے۔ عشق قدرت کی ایک بیش بہا عطا اور نعمت ہے۔ عشق کی عظمت ہی میں انسان اور انسانی زندگی کی عظمت ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عشق نہ ہو تو انسان اپنی تمام انسانی خصوصیات اور صفات سے عاری و محروم ہو جائے، انسان کا مادی وجود، اس کی فکر و نظر، اس کے جذبات و محسوسات اس کے نطق و اظہار سب پہ جمود طاری ہو جائے۔

لب سرد، نظر سرد، بدن سرد ہے، دل سرد
وہ جانِ مسیحا نفساں آتو رہا ہے

اور محض انسان اور انسانی زندگی ہی کیا' کائنات کی رنگارنگی حسن اور دلکشی' دلفریبی اور دلربائی ہمہ ہمی اور نیرنگی نہ ہوتی اگر عشق نہ ہوتا۔

صدیوں سے صدف بند' گہر بند' نظر بند
وہ جان صدف' جان گہر آتو رہا ہے

عشق کی دوامیت کے ساتھ ساتھ مخدوم کے تصور عشق کا دوسرا اہم عنصر ہے عشق کی افادیت ہر شخص اپنی الگ انفرادیت رکھتا ہے پھر بھی بنی نوع انسانی ایک اکائی ہے اور اسکا سبب بھی عشق کا جذبہ ہے جو خفی یا جلی ہر دل میں موجزن ہے۔

وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا میرا ہی نہ تھا/ وہ تو سب کا خواب تھا
سایہ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے/ لاکھ دل ہوتے تھے/ لیکن جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح/ جب مچلتے تھے تو ایک دل کی طرح/ جب اچھلتے تھے تو اک دل کی طرح/ جب مہک اٹھتا تھا دل

یہ جذبہ عشق ہی ہے جو بنی نوع انسان کے دلوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے ان کے دلوں میں عشق کی مہک اٹھتی ہے تو کائنات کا دل مہک اٹھتا ہے سارے عالم میں رنگ و نور سے لبریز نظارے بکھرے ہوئے ہیں تو عشق کے دم سے ان میں حرکت و حرارت ہے تو عشق کے دم سے۔

اس اندھیرے میں اجالوں کا گماں تک بھی نہ تھا شعلہ رو، شعلہ نظر سے پہلے

بے محبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا/ گو جام وہی مئے وہی مئے خانہ وہی ہے
ہے اسی کے جمال نظر کا اثر/ زندگی زندگی ہے/ سفر ہے سفر سایۂ شاخ گل بن گیا/ بن گیا ابر ابر رواں/ دوستو/

ایک پری چہرہ کہ جس چہرے سے آئینہ بنا
دل کہ آئینہ درآئینہ پری خانہ بنا
ہے چراغاں ہی چراغاں ،سرِ عارض، سرِ جام
رنگ صد جلوۂ جاناں نہ صنم خانہ بنا

عشق کی یہ بھی کرامت ہے کہ زندگی کے آلام ومصائب ،رنج وآفات کو سبک تر اور گوارا بناتا ہے۔
بقول عرفی شیرازی:

دردِ دل ماغم دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے بلند عزائم اور ارفع مقاصد کے حصول کے لیے جو سعی و جہد درکار ہے وہ عشق بہم پہنچاتا ہے۔

اس گزرگاہ میں اس دشت میں اے جذبۂ عشق
جز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے
یہ کوہ کیا ہے، دشتِ الم فزا کیا ہے
جو ایک تری نگہۂ دل نواز ساتھ رہے

حسن وعشق کی داستان روزِ ازل سے جاری ہے۔ زمانہ لاکھ کروٹیں بدلتا رہے، زندگی چاہے کتنے ہی روپ رنگ بدلے، تہذیب وتمدن کوئی نہج اختیار کرے، حسن وعشق کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی
دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

لیکن عشق ومحبت کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ آگ کے ان شعلوں کو بجھنے سے بچائے رکھیں۔ انھیں اپنے دامن کی ہوا سے اور بھڑکاتے رہیں۔ نفرت وعداوت کی یلغاروں اور طوفانوں سے انھیں بچائے رکھیں۔

چشم ورخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے
تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غمگسار کی بات
منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے

اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

یہاں تک تو ہم نے مخدوم کے تصور عشق کے دو عناصر ''دوامیت'' اور ''آفاقیت'' پر گفتگو کی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ تیسرے عنصر ''ارضیت'' کی نشاندہی کی جائے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عشق سے منسلک جذبات، محسوسات اور کیفیات اور تجربات کو کسی ایک نظریے کے تحت نہیں لایا جا سکتا۔ صرف ''ارضیت'' پر ہی غور کریں تو اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عشق دو روحوں کے ہم کلام ہونے کا ہی نام نہیں بلکہ یہ دو وجود اور دو افراد کا باہم انسلاک اور اتصال بھی ہے اور دوسرا پہلو یہ کہ یہاں داخلی اور ذاتی جذبات و محسوسات خارجی اور بیرونی دنیا اور ماحول سے منقطع یا آزادانہ وجود نہیں رکھتے۔ یہ ایک دوسرے پر اپنا اثر ڈالتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں۔ یہ اثرات اور تاثرات آپس میں مل کر اپنا اپنا رنگ نکھارتے رہتے ہیں۔

ارضیت کے اولین پہلو یعنی دو افراد کی باہم وابستگی کو لیں تو یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کہ شاعر کے یہاں اگر کوئی معشوق ہے تو وہ گوشت پوست سمیت انسانی وجود بھی رکھتا ہے۔ ویسے عشق کسی خیالی یا فرضی معشوق سے بھی ممکن ہے بلکہ محض روحانی انسلاک تک بھی محدود ہو سکتا ہے لیکن ہے یوں کہ اردو شاعری میں چونکہ غزل حاوی صنفِ سخن رہی ہے اس کے اثرات اردو نظم پر بھی پڑتے رہے ہیں۔ غزل کے اشعار میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ معشوق کو اس کی صنفی یا جنسی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا جائے یا اس کی شناخت دینے والی صفات یا تجربات کو بیان کیا جائے۔ لہٰذا یہ فرض کر لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ ہر عاشق کا رشتہ کسی معشوق یا معشوقاؤں سے ہوتا ہے جن کا تعلق جنسِ مخالف سے ہوتا ہے (ہم جنس سے بھی ہو سکتا ہے، یہ ایک علیحدہ بحث ہے)۔ طرفہ بات یہ ہے کہ حسرت موہانی اور کچھ لکھنوی شعرا کے کلام میں تو جیتا جاگتا معشوق نظر آتا ہے لیکن نظم نگار شعرا کے کلام میں جیسے نظیر اکبرآبادی کے یہاں واضح طور پر معشوق مادی وجود رکھتا ہے لیکن اختر شیرانی، جنھوں نے کثیر تعداد میں عشقیہ نظمیں لکھیں، معشوقاؤں کے نام بھی ان میں بیان کر دیئے، ان کے یہاں یہ معشوق محض تجریدی وجود رکھتے ہیں، یعنی جسم و جان سے عاری ہیں، ذکر مخدوم سے ماقبل کے شعرا کا تھا۔ یہاں پر تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مخدوم کی شاعری میں جو معشوق یا معشوقائیں ملتی ہیں وہ واضح طور پر اپنی نسوانی خصوصیات کے ساتھ مادی اور انسانی وجود رکھتی ہیں۔

یاد آئیں وہ چاندنی راتیں / وہ ہنسی چھیڑ دل لگی باتیں / چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز اس کی باتوں کی (سجدہ)

اور نظم ''لمحۂ رخصت'' میں تو نسوانی وجود محض جسمانی نہ ہو کر اپنی بلکہ معشوقانہ نفسیات کے ساتھ موجود ہے۔

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو / کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں / گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا بانہوں میں / مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کی حیا سے جھک جانا / اک شوق ہم آغوشی پنہاں / ان نیچی بھیگی پلکوں میں شانوں پہ پریشان ہونے کو بے چین سیہ کاکل کی گھٹا / پیشانی میں طوفاں سجدوں کا لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

ارضیت کا دوسرا پہلو، جس کا ذکر آ چکا ہے، داخلی جذبات کو خارجی ماحول و مناظر میں منعکس دیکھنا اور بیرونی دنیا کی مخصوص اشیاء کا اندرونی کیفیات کے لئے ذریعہ بن جانا ہے۔ ''سرخ سویرا'' کی پہلی ہی نظم

''طور'' اس کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ اس نظم کے ہر بند کے اختتام پر ایک ہی ٹیپ کا مصرعہ دہرایا گیا ہے اور وہ ہے ''یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی'' یہ نظم عاشق و معشوق کے میل جول کا بیان ہے جو اب ماضی بن چکا ہے لیکن ذہن کے اوراق پر مرتسم ہے۔ اس نظم کا اختتام جس شعر پر ہوتا ہے وہ ہے:

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے ایک دھندلا نشاں باقی

یہاں کھیت اور پانی وصال کا پس منظر بھی ہیں، مقام کا تعین بھی کرتے ہیں اور استعاروں بلکہ علامتوں کی طرح بہت معنوی وسعتیں بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اور اس کے بعد جو دو نظمیں ہیں'' ساگر کے کنارے'' اور ''تلنگن'' ان میں بھی فطری مناظر اور دلی جذبات کی یہی آمیزش اور آپس میں امتزاج ملتا ہے۔ یہاں منظر اور جذبات علیحدہ علیحدہ وجود نہیں رکھتے بلکہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

مخدوم کی نظم ''طور'' اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کا ایک مصرعہ ہمارے اصل موضوع ''تصورِ عشق'' کے ایک اہم عنصر کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ مصرعہ ہے۔

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

ابھی تو خیر سے ''بنیاد پرستی'' کے عہد کا آغاز ہی ہوا ہے۔ وسیع النظری، کشادہ دلی اور ''لبرل ازم'' کو کفن پہنایا جا چکا ہے اور ان کی تدفین کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ مخدوم خوش قسمت تھے کہ انہیں یہ دور دیکھنا نہ پڑا اور اس ایک مصرعے پر ''کفر'' کے فتوے سے نوازے جانے سے بچ گئے۔ شیخ، ملا واعظ، زاہد جنہیں اردو شاعری میں روزِ اول سے لتاڑا گیا ہے وہ خود بھی آج شعر و ادب کی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو گئے ہیں اور حسن و عشق کے معاملات کے بیچ ''خدا'' کو لانا گناہِ عظیم کا مرتکب ہوتا ہے، چاہے عشقِ حقیقی کے سلسلے میں ہی کیوں نہ ہو۔ خیر ہمیں تو مخدوم کے تصورِ عشق کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ عشق مقدس ہے۔ عشقِ حقیقی ہی نہیں بلکہ جسم اور جسمانیت والا عشق ہے دو روحوں کا ہی نہیں بلکہ دو بدن کا اتصال بلکہ اختلاط بھی۔ یوں تو کوئی فرد و بشر عشق کے جذبے سے محروم نہیں کہ قسامِ ازل نے اس نعمت کو بڑی فیاضی سے بنی نوعِ انساں کو بخشا ہے لیکن جو عشق کی عظمت اور تقدس کا منکر ہو اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ وہ انسانی صفات سے ہی عاری ہے۔

شعر و ادب کی دنیا میں تصورات مجرد طور پر یا تجریدی انداز سے رونما نہیں ہوتے بلکہ اپنے اندرون میں زندگی کی حرکت و حرارت اور تاب و توانائی اور جذبے اور حساس کی تب و تاب کو روح کی طرح سمائے رکھتے ہیں۔ چونکہ عشق زندگی کے بہاؤ میں ایک زیریں لہر کی طرح رواں دواں رہتا ہے زندگی کی ہی طرح رنگا رنگی اور بوقلمونی سے عبارت ہوتا ہے۔ مخدوم کے الفاظ میں!

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
سازو آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی، آبِ حیات لب و رخسار بھی ہے

زندگی دار بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے

(آج کی رات نہ جا)

زندگی تضادات کا مجموعہ ہے۔ زندگی کے مظاہر باہم متصادم ہوتے رہتے ہیں لیکن اسی تصادم سے ان میں ایک نیا امتزاج ہی رونما ہوتا ہے اور یہ نئے عناصر اپنے مخالف عناصر سے برسر پیکار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح کا سلسلہ عشق کی قلمرو میں بھی چلتا رہتا ہے۔

وصل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز
کونسا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

میرؔ نے اپنے انداز میں یہ بات یوں کہی تھی:

وصل وہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

وصل اور ہجر دونوں کا وجود عاشق ومحبوب کی طرح ایک دوسرے پر انحصار رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ مخدوم ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کے عشق کے افسانے میں وصل کا رنگ زیادہ گہرا اور تابناک ہے۔ ہجر کا وقفہ آتا ضرور ہے لیکن وصل کی تمہید بن کر، ہجر میں کرب والم کی کیفیت جس قدر شدید ہوگی اتنی ہی وصل کی لذت دوبالا ہوگی۔ اور لمحاتِ وصل جب عاشق کو نصیب ہوتے ہیں تو وہ اسے گردشِ لیل ونہار سے نکال کر ماورائی جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔ کب چھلک جائے تری لبریز وفا آنکھوں سے مہر کی مئے/ کب نکل آئے ترے پیار کا چاند/ توڑ دے حلقۂ زنجیر شب وروز

کہ یہ سلسلۂ کرب والم ختم تو ہو/ اور ہو جائے جنوں آوارہ

تو مرے حلقۂ آغوش میں آ (جز تری آنکھوں کے)

اور ایک ایسی منزل بھی آتی ہے کہ وصل وہجر ایک دوسرے میں یوں مدغم ہوجاتے ہیں کہ ایک ایک لمحے میں دوامیت سمٹ آتی ہے۔

ستارہ ہم نشیں ہے/ ماہ ہم نفس ہے/ سازِ جاں نواز ساتھ/ گریز کا سفر ہے
ایک ایک پل ہے جاوداں / الٰہی یہ سفر کبھی نہ ختم ہو (ملاقات)

●●●

جو بک نہ سکا

ہاجرہ مسرور

● یہ غالباً ۴۲ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ میں ایک صبح کو ایک پولیس والا میرے گھر کا دروازہ اپنے ڈنڈے سے کھٹکھٹا رہا تھا، اور مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا۔ پولیس والے کا یہ رعب داب میرے لئے بڑی دہشت ناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ میں جس ماحول کی باسی تھی، وہاں کسی لڑکی کا نام گھر کے افراد بھی اونچی آواز سے پکارنا بے حیائی سمجھتے تھے۔ میں ان دنوں جگر کی تکلیف میں مبتلا تھی، اور بستر پر پڑے پڑے چھپتے توڑے کے لئے ضد کر کے رویا کرتی تھی۔ بہر حال معلوم ہوا کہ لاہور کی کسی عدالت کا سمن میرے نام آیا ہے۔ بظاہر بہادر بنتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے سمن لیا اور پڑھا۔ منٹو صاحب نے ''دھواں'' کے مقدمے میں گواہ صفائی کے طور پر مجھے بلوایا تھا۔ میں نے گھبرا کر دستخط کر دیئے لیکن سمن کی خوفناک عبارت نے حواس غائب کر دیئے تھے۔ ایک قانون داں عزیز کو فوراً بلوایا تو کہیں جا کر ''عدمِ حاضری کی صورت میں وارنٹ گرفتاری'' کا خوف دل سے نکلا —— انہی قانون دان عزیز سے معلوم ہوا کہ میری گواہی عدالت تسلیم نہیں کرے گی۔ کیونکہ گواہ کے سلسلے میں کچھ عمر وغیرہ کی بھی قید ہوتی ہے —— اس بات سے اوس سی پڑ گئی۔ میرے بجائے میڈیکل سرٹیفکٹ گیا —— لیکن اس سارے قصے سے خواہ مخواہ اہمیت کے بُرا حال ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ ''ادیب پن'' اپنے اوپر طاری کر کر کے سب سے کہے جا رہے ہیں کہ ''جناب یہ منٹو بھی عجیب ہیں''۔ مجھ سے تو پوچھا ہوتا''۔ (کچھ یوں جیسے منٹو صاحب اپنے لئے انتہائی روز مرہ، قسم کی چیز ہو مگر اس قصے کے تیسرے یا چوتھے دن جب کہ مجھے لاہور میں ہونا چاہئے تھا۔ مجھے منٹو صاحب کا خط اور ان کے عدالتی بیان کی نقل ملی۔ انھوں نے نہایت پر تکلف انداز سے بلا اجازت میرا نام گواہان صفائی میں رکھنے پر معذرت کی تھی۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا —— (دوسرا اور آخری خط لاہور میں ملا جبکہ وہ ''اردو ادب'' مرتب کر رہے تھے۔)

منٹو صاحب کو اس وقت تک میں نے بہت کم پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ ''دھواں'' بھی اس کے بعد پڑھ سکی۔ مگر ''نیا قانون'' میرے دل پر بری طرح نقش تھا اور میں اس زمانے میں محض اسی ایک افسانے کی وجہ سے انھیں بہت بڑا افسانہ نگار مانتی تھی —— منٹو صاحب کو میں نے معذرت کا ایک طفلانہ سا خط لکھ ڈالا، جس میں میں نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا، لیکن عمر وغیرہ کی قانونی باریکی کو ٹال گئی۔ اس خط کا کوئی جواب نہ آیا، مجھے دکھ سا ہوا کہ شاید منٹو صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار میرے عدالت میں حاضر نہ ہونے سے ناراض ہو گئے ہیں۔

پھر جب مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں مقیم کئی مشہور ادبی شخصیتوں کو خط لکھے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ آپ جیسے بڑے افسانہ نگار سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے —— سب نے جواب دیا

مگر منٹو صاحب کا جواب نہ آیا ــــــ میں اس بات کو بھول سی گئی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے تکے جارحانہ انداز سے سوال فرمایا۔ ''آپ نے منٹو کو ملنے کے لئے خط لکھا ــــــ ان کا لہجہ کچھ اس قدر تنبیہ الغافلین قسم کا تھا کہ میرے منہ سے بلا ارادہ ''نہیں'' ٹپک پڑا'' ــــــ اپنے مخصوص قسم کے ''چار دیواری ماحول'' سے باہر آ کر کھلی ہوا تک حملہ آور سی لگتی تھی۔ میں نہیں پر اڑی رہی۔ اور ان صاحب نے قصہ یوں پاک کیا ''میں نے خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے''۔ میں اس بات پر بہت چڑ چڑائی کہ منٹو صاحب بھی کیسے عجیب آدمی ہیں۔ آخر بڑے ادیبوں سے ملنے کا شوق نئے لکھنے والوں کو ہوتا ہی ہے۔ اس میں عجیب بات کیا تھی جو انھوں نے سب سے تذکرہ کر ڈالا ــــــ اس کے بعد منٹو صاحب سے نہ تو میری ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت ــــــ (اور اب، کہ وہ ہم میں نہیں رہے تو ان کی یہ بات بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے)۔ لاہور آ کر، میں نے کئی بار انھیں دور سے دیکھا مختلف ادبی جلسوں میں، ــــــ وہ ہمیشہ اتنے زرد نظر آتے کہ بے ساختہ ان کی زندگی کی دعا کرنا پڑتی۔ بڑی بڑی بے چین آنکھیں، اور بھوؤں کے درمیان سلوٹیں جیسے ان کی نظریں ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جسے اور کوئی نہ دیکھ سکے ایک دفعہ ایک ادبی محفل میں جہاں منٹو صاحب کے فن کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے کرسئ صدارت یا صحیح الفاظ میں کرسئ حماقت پر بیٹھنا پڑا۔ یہ شرف خود اپنی جگہ، ہم جیسے پچھلی قطاروں میں چھپ کر بیٹھنے والوں کے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، اس پر وہاں کا تنا تنی کا ماحول، اور سب پر مستزاد منٹو صاحب کی موجودگی ــــــ میں نے بہت لوگوں سے سن رکھا تھا کہ منٹو صاحب اپنے فن پر کسی قسم کی تنقید نہیں سن سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک لفظ تک نہ بولے۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے اپنے چہرے کو زرد ہاتھوں میں لئے بیٹھے رہے ــــــ ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی ــــــ اور ہر بولنے والے کی طرف ان کی بے چین آنکھیں یوں جھپٹیں جیسے کچھ پانا چاہتی ہوں ــــــ لیکن جب بات ختم ہوتی تو یوں ہٹتیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو ــــــ اس دن منٹو کے اکٹھے بہت سے نقاد کچھ آپے میں تھے بھی نہیں، اور منٹو صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا ــــــ منٹو صاحب کی اس دن کی مضطرب خاموشی سبھی کے لئے حیرت انگیز تھی ــــــ منٹو صاحب ضبط بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی عجب بات تھی۔

آخری بار میں نے انھیں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ جس وقت اپنی بیوی صفیہ کے ساتھ آئے۔ تو کسی مضمون پر تنقید ہو رہی تھی ــــــ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر پنکھے کے بہت سے لوگ چند موم بتیوں کی روشنی میں بیٹھے تھے ــــــ منٹو صاحب آتے ہی اپنے مخصوص انداز سے آستینیں چڑھا کر اور ایک پاؤں بینچ پر رکھ کر بیٹھ گئے اور تنقید میں حصہ لینے لگے ــــــ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد زرد اور دبلے ہو رہے تھے ــــــ صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے، مجھے ادیب منٹو کے بجائے صرف صفیہ کے شوہر سعادت حسن کا خیال آنے لگا ــــــ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں سخت فکر مند تھیں اور بڑی مایوس تھیں ــــــ لیکن آج جبکہ منٹو صاحب اپنے افسانوں کی طرح اچانک موت کی وادیوں میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی ایک فکر موت نے لوٹ لی، تو وہ اپنی تین بچیوں کے

ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر کتنی ڈھیر سی فکروں میں مبتلا رہتی ہوں گی —— منٹو صاحب کے مداحوں کو یہ بات ضرور سوچنا چاہئے۔

مجھ سے منٹو صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے —— مگر ذاتی طور پر ان سے میرا کیا واسطہ رہا ہے۔ میں ابھی تک یہی کچھ بتا رہی تھی۔ ان کی ذات کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق منٹو صاحب کو دیکھتے اور پھر کہتے —— ان باتوں میں خود منٹو صاحب کس حد تک ہوتے تھے۔ میں کیا سمجھ سکتی ہوں —— اس لئے ان کی ذات کا معاملہ اس جگہ چھوڑتی ہوں۔

اب رہا منٹو صاحب کا فن تو اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس خدمت کے لئے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کیونکہ وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں سیدھے سادے انداز سے کی ہوئی بات کا شمار تنقید میں تو ہوتا نہیں۔ اس لئے منٹو صاحب کے فن پر اگر میں کچھ کہوں تو اس کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ منٹو صاحب کے فن پر لکھنے کا جواز اگر یوں ڈھونڈوں کہ میں نے بھی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ قطعی ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ منٹو کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے —— ہاں فنی ردعمل دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس ردعمل کا بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ جو منٹو صاحب کے افسانوں سے میں نے قبول کیا۔

منٹو صاحب حد درجہ ''شدید'' افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کو ان کے فن کے مدنظر، شریر متین شریف اور لطیف افسانہ نگار کہنے کی جرأت ہو تو میں منٹو صاحب کو ''شدید'' افسانہ نگار کہوں گی۔ منٹو صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انہیں کھٹکتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر ڈالتے تھے۔ ریشم کی لچھیوں میں اگر سوت کا ایک ننھا سا تاگا بھی نظر آجاتا تو وہ اس کے گرد اپنے ردعمل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کی بُنت کی خوبی اور نفاست تک اردو افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ منٹو صاحب موضوع کے انتخاب میں تو اتنے شدت پسند تھے مگر موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجہ کے باشعور اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ مختصر افسانہ نگاری کی تکنیک کو پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں اگر اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار منٹو کے مقابل لایا جا سکتا ہے تو وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

منٹو صاحب بے حد جری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کئی قسم کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ نقادوں کی مخالفت پر غصے سے منہ پھیر لیا، ادیبوں کی مخالفت پر حقارت بھری نظر ڈالی، معاشرت کے ٹھیکیداروں اور اخلاق کے اجارہ داروں کی مخالفت کو ٹھکرا دیا۔ اور زندگی کے کسی لمحے میں بھی کسی سے ہار نہ مانی —— یہ ضد، یہ پتھر پر لکیر کی قسم کا نقطۂ نظر فن کار کو نقصان بھی پہونچاتا ہے۔ کیونکہ ہر مخالفت کی بنیاد بدنیتی پر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات خلوص بھی نکتہ چینی کی بنیاد بنتا ہے۔ اور اس قسم کی نکتہ چینی میں فن کار کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر مخالفت کو ٹکرا کر واپس ہو جانے پر مجبور کرنے کے لئے کسی شخصیت کو اپنے

اردگرد ایک حصار سا بنانا پڑتا ہے اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا منہ پھیر دیتا ہے بلکہ بسا اوقات مشاہدات اور محسوسات کو بھی محصور کر کے ٹھنڈی تازہ ہوا سے محروم کر دیتا ہے ـــــ لیکن اگر یہ ''حصار'' محض اس لئے بنایا گیا ہو کہ ''فن'' کو کہیں اس سے کمتر درجے کا خول محبوس نہ کر ڈالے تو اس قلعہ بندی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے ـــــ میں سوچتی ہوں کہ منٹو صاحب کی اٹل ضد بڑی حد تک اسی زمرے میں آتی ہے ـــــ انھوں نے معاشرت کے چہرے پر داغ دیکھ لئے تھے۔ اور اسی لئے وہ معاشرت کے حسن پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو جھٹلانے سے انکار کرتے تھے۔ اور اخلاق کی اس انوکھی قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ داغوں کو نظر انداز کر کے معاشرت کے حسن کا قصیدہ کہو ـــــ یا پھر داغوں کو بھی لوازمات حسن قرار دو۔ یہ درست ہے کہ منٹو صاحب آئے دن کی نصیحتوں سے کچھ کربلا کے منتقم مزاج بن گئے تھے۔ اس لئے وہ معاشرت کے حسن پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو جھٹلانے سے انکار کرتے تھے، اور اخلاق کی اس انوکھی قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ داغوں کو نظر انداز کر کے معاشرت اور اخلاق کے ان مطالبات کا مذاق اڑانے کے لئے شدت پر بھی اتر آتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی شرارت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی جرم نہیں ـــــ بعض رنگوں کو گہرا کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رخ سپاٹ نہیں۔ جو لوگ ہلکے خوابیدہ رنگوں کو فن کا عروج قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے ہلکے پن کو بالواسطہ گہرا کرتے ہیں۔

منٹو صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اردو ادب میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں ـــــ لیکن ان میں (امراؤ جان کو الگ رکھنے کے بعد) بہت کم اصلی تصویریں تھیں۔ طوائفیں یا تو نہایت بقراط تھیں یا محض سماج کا کوڑھ، جن پر ادیب تھوتھو کر کے آگے بڑھ جاتے ـــــ دلال بھی جھلک دکھا جاتے، مگر صرف اپنے لباس کی، منٹو صاحب کا سب سے بڑا اور زندہ رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں پہلی بار سنجیدگی سے، اس گرے ہوئے طبقے کو داخل ہونے دیا ـــــ اور فتویٰ صادر کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے، وہ تو جو کچھ ہوتا ہے، جو کچھ ہے جیسا کچھ ہے اسے بغیر کلیاں پھندنے ٹانکے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر پڑھنے والے کو اجازت تھی، وہ جو رائے چاہے قائم کرے جو علاج مناسب سمجھے کرے۔ منٹو صاحب کی طوائفیں بگڑی ہوئی لڑکیاں اور دلال، بدمعاش غنڈے، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں۔ اور ہماری ہی طرح ان کے بھی لطیف انسانی احساسات ہیں۔ انھیں دکھ پہنچتے ہین، ان کی بھی ہتک ہوتی ہے۔ یہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور قربانی بھی دے سکتے ہیں ـــــ بے روزگاری کا زخم یہ بھی کھاتے ہیں، دوسروں کے اٹین بھی ہوتے ہیں، اور مددگار بھی ـــــ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان ''گرے'' لوگوں کو پہلی بار اردو ادب میں پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کیا ـــــ اسی سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ عریانی پر اتر آتے تھے ـــــ اب یہ الگ بحث ہے کہ عریانی کیا ہے اور کیا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ آرٹ اور ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے ـــــ مگر للہ کوئی اتنا تو بتائے کہ کیا ''عریانی'' میں ایک دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک راگ سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسل

انسانی کی بقا کے مقدس تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو ''سفلی جذبات'' یا اسی قسم کے دوسرے نجس الفاظ کا نتیجہ قرار دیں ـــــ مگر یہ بحث بھی منٹو صاحب کے مخصوص فنی رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیونکہ منٹو صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں (مجھ کو چھوڑ کر) اس میں خصوصاً طوائف سے متعلق افسانوں میں اکتسابات لذت یا ویسا ہی بننے کی اکساہٹ کہیں نہیں پائی ـــــ اب بھی ''ہتک'' کی ہیروئین ہی کو دیکھ لیجئے۔ اپنے غلیظ بستر پر ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔ ایک بازو سر کے گرد رکھے ہوئے۔ منٹو نے اس عام انداز کے لئے چاند کے گرد ہالے کی خوبصورت تشبیہ لکھ کر ساری عورتوں کو یوں بغیر آستین کے کپڑے پہن کر سونے کی ترغیب نہیں دی۔ بلکہ تشبیہ دی بھی تو بغلوں کی کھال کے متعلق پر نچی مرغی کی گھناؤنی کھال میں ـــــ خدا جانے وہ کس دل گردے کے بزرگ ہیں جنھیں پر نچی مرغی کی کھال دیکھ کر لذت کا دورہ پڑسکتا ـــــ یا پھر بڑی بڑی کھوئی ہوئی آنکھوں والی سراج کو دیکھئے، جو واہیات سے واہیات جنسی حرکتوں پر اور بھی بے جان ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو بکنے کے لائق بنانے کے لئے چرس والی سگریٹ کے دم لگاتی ہے۔ کیا کسی کو یہ ادا آگے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے ـــــ میں نے تو جہاں تک منٹو صاحب کے مشہور و معروف ''عریاں'' کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان انھیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ جنسی فعل کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے ـــــ جو ایک سادہ انسان کے لئے ایک مسئلہ بن سکتی ہے ـــــ جنس کے خلاف یہ نفرت، اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ منٹو صاحب ان جنس میں ڈوبے ہوئے کرداروں، پر تشبیہوں اور استعاروں کا رنگ و روغن نہیں پوتتے ـــــ یہ لیپ پوت منٹو صاحب کی فطرت کے خلاف تھی، اس لئے وہ اتنی سچائی سے ان کی تصویر اتارتے کہ وہ بگڑی ہوئی تصویریں بھی نہیں بلکہ ایکس رے فوٹو بن جاتیں ـــــ ایکس رے فوٹو ڈاکٹر حضرات غور سے دیکھیں تو دیکھیں، ان سے لذت اخذ کرنا عام ذہن کا کام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد منٹو صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بدترین دن گزارے، یہ عمر یہ زمانہ منٹو صاحب کی فنی بلندی اور ذہنی تخلیق کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن افسوس کہ اسی زمانے میں، اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوائے ـــــ ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہر چیز کو حقیر گرداننے کے عادی ہیں، ذرا بتائیں تو کہ کیا یورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے پچھتر روپے کمانے کے لئے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بازار میں آجائے تو وہ بڑی شان سے سال دو سال کچھ نہ لکھ کر، صرف سوچ کر گزارہ کر سکتا ہے ـــــ منٹو صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے بوتے پر بہتر دن گزارے تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ اپنی بیوی اور بچوں کا معیار زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ـــــ مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعہ آمدنی نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند روپوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسائل میں لکھتے رہے۔ منٹو صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے لکھنا پڑا۔ اکثر موضوعات پر شاید، وہ بمبئی کے دوران قیام میں کبھی قلم نہ اٹھاتے۔ یا اگر

اٹھاتے تو دوسرے انداز سے ــــ مگر لاہور آکر ضروریات زندگی کی طلب نے ان سے کبھی کچھ لکھوادیا ــــ بہت سے افسانے جو لکھے گئے انھیں بہتر حالات میں شاید تھوڑا اور سوچ کر لکھا جاتا ــــ مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود منٹو صاحب کی عظمت سے کون منکر ہوگا کہ وہ دانستہ بکے نہیں۔ ایک دفعہ انہی اذیتوں کے دور میں چچا سام کے ایک نمائندے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کرلیا، مگر منٹو صاحب کی رگِ طنز پھڑکی اور انھوں نے تین سو (غیر ملکی) روپیہ فی افسانہ کے بجائے (غالباً) پچیس تیس (ملکی) روپیہ فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے ــــ منٹو صاحب کبھی بک نہ سکے اور نہ ہی کوئی انھیں کھلے بندوں اپنے حق میں استعمال کرسکا ــــ وہ طبیعت کے کھرے تھے۔ اس لئے کسی قسم کی پابندی انھیں گوارا نہ تھی۔

آج منٹو صاحب ہم میں نہیں۔ وہ اپنی انمٹ بہادری کے ساتھ ختم ہوگئے۔ لیکن ان کا فن، اردو ادب میں ناقابل فراموش کارنامے کی طرح دھڑکتا رہے گا ــــ منٹو صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہوسکتے ہیں۔ مگر منٹو صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کرسکے گا۔ اور وہ خصوصیت تھی ،انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف اور بے داغ دیکھنے کا جذبہ جو ان کے فن کا مجموعی تاثر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو 'بو' بیکار کی چیز معلوم ہو، لیکن کیا قارئین کے دل میں "بو" کی گھاٹن کے لئے "کیوں" نہیں گونج اٹھتی۔ جس کا میل اور گندی ساری بھی ایک جنسی بدہضمی کے شکار نوجوان کے لئے باعث کشش ہوئی۔ کیا 'خوشیا' سے کوئی شخص نفرت کرسکتا ہے۔ کیا "سرکنڈوں کے پیچھے" بکنے والی بھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہوجاتی جسے یہی نہیں معلوم کہ وہ گناہ کرتی ہے ــــ یہ ہمدردی اور انسانیت دوستی کی لہر ایک دو افسانوں تک محدود نہیں ان کے زیادہ تر افسانوں میں موجود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کرسکتی ہے ــــ اور مختلف اشخاص میں نظر آسکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی سانچہ مقرر نہیں کہ یہاں غالب رکھو، یہاں پریم چند کو، یا یہاں سعادت حسین منٹو نہیں سما سکتے ــــ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس انسانیت دوستی پر کون سی مہر ثبت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ کلبیت نہیں ــــ انسانیت سے نفرت نہیں، انسان کو فطری اور جبلی طور سے کمینہ اور رذیل قرار دینے کی عادت نہیں۔ یہاں پیٹ بھری تھکن، اضحلال اور مایوسی نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کارفرما ہے کہ انسان بڑی ہی پیاری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بازار میں بھی انسان ہی رہتی ہے ــــ اگر اس کے معاشرتی زخم مندمل ہوجائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کررہا ہے تو یہ دنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہوجائے۔ اور منٹو کے فن کا مجموعی تاثر یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچئے کہ سعادت حسن منٹو اگر بہتر دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے اور ان کا جاندار قلم کیا کیا حسن نہ بکھیرتا۔

●●●

انتخاب کلام مخدوم

گلِ تر کا دیباچہ

● شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے، شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے اپنے تجربے کی بنا پر۔ جب آپ 'گل تر' پڑھیں تو شاید آپ بھی اس عمل سے گزریں ذہن 'سرخ سویرا' اور ''گلِ تر'' میں مقابلہ کرنے لگے گا۔ شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفسِ مضمون حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیفیت وکمیت اور تاثر کے اعتبار سے ''سرخ سویرا'' سے مختلف ہے۔

بعض قارئین کو ''سرخ سویرا'' کی وہ نظمیں اور اشعار شاید یاد آجائیں جو انھیں متاثر کر چکے ہیں مثلاً رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے/ سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے/ جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں/ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے/ کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں/ کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں/

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو/ چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
یہ جنگ ہے جنگ آزادی/ اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا/ سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد
یہ تھا ''سرخ سویرا'' کا رنگ ''گل تر'' میں یہ رنگ ملے گا:

ہجوم بادہ وگل میں ہجوم یاراں میں/ کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے/ تحفۂ برگ گل وباد بہاراں لے کر/ قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے/ کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل/ تمام رات غزل گائیں دیدیار کریں/ آج تو تلخی ہے دوراں بھی بہت ہلکی ہے/ گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں/

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن/ ہر صبح مے تلخی ایام بھی پی ہے/ غمزدہ تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے/ اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے/ الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو/ صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو/ ہم سوا تھ میں ہاتھ دو/ سوئے منزل چلو/ منزلیں پیار کی/ منزلیں دار کی/ کوئے دلدار کی منزلیں/ دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ فرق میری نظر میں ایک نیاپن ہے جو عمر تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے، پھر بھی انسان دوستی اور سمتا ہوا جمالیاتی اثر قدرِ مشترک ہیں۔

زمان ومکان کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (Timeless) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک

عمر میں کئی عمریں گذارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے، جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو ونما کا دوسرا نام ہے، اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا، جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا، فنونِ لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا اک بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔

شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے۔

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب واضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا ہے اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین وطمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فردِ معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب واضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب "انا" اور "انفرادیت" سے تعبیر کرتا ہے۔

شعر میں ہم ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے، مگر میں ایک محروم بے کاری انسان ہوں 'گل تر' کی نظمیں غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جارہا ہوں، سماجی تقاضے پراسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی "ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی" ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔

مخدوم محی الدین

حیدرآباد دکن

۲۳ر جولائی ۱۹۶۱

قطعہ

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ناز پہ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں

جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں

رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے

دور مجلس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں

سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے

چونک جاتا ہے دماغ

جھلملا جاتی ہے انفاس کی لوٗ

جاگ اٹھتی ہے مری شمع شبستانِ خیال

زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے

شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ

ان کے مصروف قدم

ان کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش

اُن کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال

سیکڑوں لاکھوں قدم

سیکڑوں لاکھوں عوام

سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل

جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال

جانے کس موڑ پہ یہ ٹھٹھن سے دھما کا ہو جائیں

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ

طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے

کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور

خواب میں زیست کی سوزش کا پتہ دیتا ہے

مجھے غم ہے کہ میرا گنجِ گراں مایۂ عمر

نذرِ زنداں ہوا

نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا؟

1951ء

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چتا
دو بدن اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لئے رک گئی
ہم نے دیکھا اُنھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا اَبد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر!

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے، بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا
زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
سازو آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب ورخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا
آج کی رات، بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

1956

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ تیرا نامِ وفا آتا ہے

وشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی
دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں نہ مَن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے، دلدارئ جاں باقی ہے
سرِ فہرستِ نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

1958

چاند تاروں کا بن

(آزادی سے پہلے ربعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو
جوئے خون بن گیا
کچھ امامانِ صد مکر و فن
اُن کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا ابھی ہے
ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

رقص

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آ گیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آ گیا

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
بدن مہک مہک کے چل
کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آ گیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آ گیا

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

1958

جانِ غزل

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں
آنسوؤں کے کنول
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رُخسار کی چاندنی
چھٹ گئیں بدلیاں، کھل گئے پیچ و خم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پئیں
راستے مختصر، گل بداماں ہے ہر رہ گزر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل

1959

احساس کی رات

مجھے ڈر ہے کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغۂ طوفانِ حوادث کے ہوس کی یلغار
یہ دھماکے، یہ بگولے، سرِ راہ
جسم کا جان کا پیمان وفا کا کیا ہوگا؟
تیرا کیا ہوگا مرے تارِ نفس
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں
یہ دہکتے ہوئے رخسار
یہ مہکتے ہوئے لب
یہ دھڑکتا ہوا دل
شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ
کیا ہوگا
اڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا
چپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا سرِ شام گذرگاہوں میں
دہر میں لطف وعطا کچھ بھی نہیں
دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
سجدہ کچھ بھی نہیں نقشِ کفِ پا کچھ بھی نہیں
میرے دل اور دھڑک
شاخِ گل
اور مہک اور مہک اور مہک

1960

چپ نہ رہو

(لومبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں ایک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گذری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گذری ہے
خیر ہو مجلسِ اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی صداقت کی جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو،
چپ نہ رہو

1961

سناٹا

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ چنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

1961

نیند

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے
مری بے کیف تنہائی کو یوں رنگین بناتی ہے
یہ کس کی جنبشِ مژگاں ربابِ دل کو چھوتی ہے
یہ کس کے پیرہن کی سرسراہٹ گنگناتی ہے
مری آنکھوں میں کس کی شوخیِ لب کا تصور ہے
کہ جس کے کیف سے آنکھوں میں میری نیند آتی ہے
سکوت اور شانتی کے ہر قدم پر پھول برساتی
اسیرِ کاکلِ شب گوں بنا کر مسکراتی ہے
مری آنکھوں میں گھل جاتی ہے وہ کیفِ نظر بن کر
مجھے قوس و قزح کی چھاؤں میں پہروں سلاتی ہے
سحر تک وہ مجھے چمٹائے رکھتی ہے کلیجے سے
دبے پاؤں کرن خورشید کی آ کر جگاتی ہے

1938

ساجدہ زیدی

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

خدایا!
کیا یہ بحرِ منجمد ہے اور کنارہ ڈھونڈ نا ہے؟
یہ دردِ ہجر ہے — یا ایک طلسم جاوداں ہے
عجب سا اضطراب جاں ہے
شاید لازماں ہے
مکان ولا مکاں سے ماوراء ہے
دلِ وحشی یہ کہتا ہے......
قرارِ جاں کہاں ہے؟
کہاں احساس کے ٹکڑے سمیٹوں......
کہاں بے نام رشتے کا پتہ ڈھونڈوں......
کتابوں کی گذرگاہوں میں کھو جاؤں......
کہ فکر و فلسفہ کے ریگ زاروں میں نکل جاؤں؟
غموں کے رمز پاؤں — یا
طرب کے جام چھلکاؤں
نشاطِ زیست کے اک جامِ میگوں میں پگھل جاؤں
کہ اس سیلِ روانِ وقت کی ہم رقص ہو جاؤں......؟؟
اندھیرا ہے......
مجھے اس راستے کے پیچ و خم میں اک شرارہ ڈھونڈ نا ہے

تلاش نور میں اور جستجوئے حرف و معنی میں
ردائے نیلگوں کے پار جاؤں
رازِ ہستی کا پتہ ڈھونڈوں
جو روحِ عشق لرزاں ہے فضائے دہر میں
اس میں سما جاؤں
رموزِ غم میں دل کا مدعا پاؤں
کہ — اس دارِ فنا کے کیف و کم کی جستجو لے کر
عدم کے بن میں کھو جاؤں......
یہ دردِ ہجر...... جو احساس کا تارِ گریباں ہے
اسے کس طرح سلجھاؤں......؟؟
مجھے اس عالم لاہوت کی بے منظری میں
گلِ نورستہ کا رنگیں نظارہ ڈھونڈ نا ہے!

شاہین

نیا کھیل

ضربِ کاری لگا کے لمحوں پر
صبح کو رات سے جدا کرتی
ریڈیو کے الارم کی آواز
اور بتدریج میری آنکھوں سے
پٹیاں زخمِ جاں کی کھلتی سی
آنکھ کھلتی ہے پر نہیں کھلتا
یہ مسلسل طلسم سا کیا ہے
قہر ہے روشنی کا آنکھوں پر
یا مرا زخم اب بھی تازہ ہے
اور پھر یوں ہی بے ارادہ بھی
پاس رکھی کتاب اٹھا کر میں
پاز کی نظم پڑھنے لگتا ہوں
"اس گلی میں رواں ہیں میرے قدم
اور اُدھر دوسری گلی میں دور
اپنے قدموں کی چاپ سنتا ہوں
اور دونوں کے درمیان فقط
دھند سچائی کا وسیلہ ہے"
جسم میں چاند ہو چکا تحلیل
اصل جو کھیل تھا وہ ختم ہوا
اب تو باری ہے صرف یادوں کی
یہ نیا کھیل کر دگارِ جمال
ختم ہوتا نظر نہیں آتا

میرا دشمن

سرِ محفل کبھی وہ فاصلے سے مسکراتا ہے
کبھی بڑھ کر وہ ہاتھ اپنا بڑھاتا ہے
کوئی اڑتی اڑاتی سی خبر اس تک پہنچتی ہے
تو اس میں رنگ بھر کر وہ مری تاب و تواں کو آزماتا ہے
یقیں آتا نہیں لیکن کسی کو اس کی باتوں پر
کہ ان میں ربط کا فقدان ہوتا ہے
الجھتا ہے وہ اپنے آپ سے اس طرح
جیسے مخمصے میں فیصلے سے قبل ہر انسان ہوتا ہے
اسے معلوم ہے شاید کہ میں یہ جانتا ہوں
وہ مری کم مائیگی، سادہ دلی، اور بے ریا
پہچان پر فقرے بھی کستا ہے
مگس کی طرح ڈستا ہے
بسا اوقات لیکن
خود ترس آتا ہے مجھ کو اپنے دشمن پر
کہ وہ جو اس قدر الجھن میں پیہم مبتلا رہتا ہے
شاید دوستی کے حرفِ شیریں کو ترستا ہے!

احتشام اختر

Sunny کی ایک دوپہر

یاد جلنے لگی سگریٹ کی طرح
''ڈسپرسیو'' میں گھلی ہے
میری آنکھوں کی تھکن
دھوپ اندر تو نہیں آئے گی
بھارے پردے اسے آنے ہی نہ دیں گے اندر
روشنی گو کہ بہت مدھم ہے
پھر بھی ہاتھوں کی لکیریں تو میں پڑھ سکتا ہوں
بات سرگوشی میں کرتے ہیں جو بیٹھے ہیں یہاں
دھیمی میوزک انھیں مخمور کیے دیتی ہے
راکھ دانی میں بجھادی ہے گو سگریٹ لیکن
اس کی باتوں کا دھواں ہے اب بھی
میرا احساس تپاں ہے اب بھی
لحہ لحہ میں اداسی کو پیے جاتا ہوں!

یعقوب راہی

کھیل تماشے جاری ہیں

کیسی مسجد؟ کیسا مندر؟
کیا گرجا گھر؟ کیا گُردوارا
سب کے سب تو بہکاوے تھے، بہکاوے ہیں
انسانی بٹوارے ہیں
صدیوں پہلے
ہم سب میں جو ایک درندہ زندہ تھا
آج بھی شاید وہ زندہ ہے
اپنے کھیل رچاتا ہے
انسانوں کو انسانوں سے کٹواتا، مرواتا ہے
کیسے کیسے کھیل تماشے
اب بھی جاری ساری ہیں
کتنی آنکھیں بھاری ہیں؟!

شاہد عزیز

وقت باقی ہے

ہوا سے پوچھنا ہے
اور سفر کے راستے
معلوم کرنے ہیں
درختوں کو بتانا ہے
کہ ان کے پھل
بہت ممکن ہے
اس موسم میں شاید
پک نہیں پائیں
ستاروں سے یہ کہنا ہے
کہ ان کی روشنی
سب کو نہیں ملتی
خلاؤں میں
جو سیارے بھٹکتے ہیں
انہیں بھی کچھ نئی باتیں بتانی ہیں
کہ وہ آپس میں
ٹکرانے سے بچ جائیں
کہ ان کے یوں بکھرنے سے
ہماری اپنی دھرتی بھی
اچانک اپنے محور سے
نہ ہٹ جائے
سمندر سے بھی کہنا ہے
کہ ان کے ان جزیروں میں
پرندے کیوں نہیں آتے
ابھی تو وقت باقی ہے
ابھی جی بھر کے جینا ہے
بہت سے کام کرنے ہیں
ابھی خوابوں سے لڑنا ہے
تمہارے ساتھ مرنا ہے تمہارے ساتھ جینا ہے!

سمندر

جو منظر میں نے دیکھے ہیں
اگر تم دیکھ لیتے تو
کناروں سے پلٹ آتے
کبھی آگے نہیں جاتے
سمندر دور تک
ان کشتیوں کو
لے تو جاتے ہیں
مگر واپس نہیں لاتے
محبت کیسے اپنے آپ
سارے زخم بھرتی ہے
ابھی تم نے
پرانی یاد کی کھڑکی نہیں کھولی
ابھی شاید ہمارے درد نے
کروٹ نہیں بدلی
ابھی تاریک راہوں میں
کسی پربت کے پیچھے سے
کوئی سورج نہیں نکلا
ابھی اپنی زمیں سے
آسماں روٹھا ہوا کیوں ہے
کبھی ہم اپنے خوابوں کی
نئی ہستی بسائیں گے
سمندر مان جائیں گے
کنارا چھوڑ کر جو جا چکے ہیں
لوٹ آئیں گے!

خلیل مامون

شش جہات

دھیرے دھیرے
دھیرے دھیرے
سورج مشرق سے نکلا
دھیرے دھیرے
دھیرے دھیرے
روشنی مشرق سے پھیلی
مغرب میں اتری
دھیرے دھیرے
سورج مغرب میں اترا
دھیرے دھیرے
مشرق سے رات چلی
مغرب تک پہنچی
روشنی اور رات
ایک دوجے ساتھ ساتھ
آگے پیچھے
لوگوں کو ایک ساتھ
سلاتے ہوئے اور جگاتے ہوئے
آدھی دنیا جاگ رہی ہے
رستوں پر
بھوکے کتوں کی طرح
بھاگ رہی ہے
آدھی دنیا
نیند کے گہرے سائے میں
پیٹ بھرے شیروں کی طرح
بستر پر
خراٹوں میں
خوابوں میں
دن بھر کی تھکن کو
آنکھوں کی جلن کو
خوشبو کے ویران چمن کو
بکھرتے گیتوں میں راگ رہی ہے
آنگن میں
صدیوں پرانے
بوڑھے پیڑ اونگھ رہے ہیں
نیند سبھوں کو آتی ہے
دیکھنے والی آنکھ
دیکھتے دیکھتے تھک کے
کبھی تھوڑی دیر کے لئے
تو
کبھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
سو جاتی ہے
مٹی اور گھاس پھوس سے
نکلے ہوئے ہم لوگ
اپنے آپ سے کٹے ہوئے ہیں
صبح کے اجالے سے
اور رات کے اندھیرے سے بندھے ہوئے ہیں
کبھی
صرف ہم وہاں کو
پرواز چڑھانے کی خاطر
اور کبھی
لذت حواس خمسہ کی امید میں
رقصاں ہیں
اور کبھی
وہم وگماں کی تپتی ریت کے
صحراؤں میں
لاموجود سایوں کے پیچھے
بھاگ رہے ہیں

دن میں اونگھ رہے ہیں
راتوں کے اندھیارے میں جاگ رہے ہیں
سارا وقت
جانی پہچانی جغرافیائی حدوں کو
بار بار ناپنے
سرحدیں بنانے میں
اور تاریخ کی جھوٹی کہانیوں کے
سچ کی تلاش میں گذر جاتا ہے
اور
آج کا سپنا پسر جاتا ہے
آنکھوں سے
سنہرے جنگل
سرسبز داریاں
نیلے پیلے پھول
کانٹے دار ببول
نیل کمل کی ندیاں
دھاڑتے دریا
گھور اندھیری کھائیاں
آسمان کی چمکتی پہنائیاں
سب اوجھل ہو جاتے ہیں
سامنے پتھروں کی اونچی اونچی
دیوقامت عمارتیں آجاتی ہیں
شہر کی سڑکیں
سارے گھر کھا جاتی ہیں

ہم سے ہم کا رشتہ
روح سے روح کا ناطہ
کٹ جاتا ہے
سارا سنسار
میں اور تو میں بٹ جاتا ہے
ایسے میں خدا کہاں
دانائی کہاں، شیطاں کہاں
پھول سے خوشبو اڑ جاتی ہے
پیڑ سے پتے گر جاتے ہیں
آنکھوں سے آنسو
دل سے درد چلا جاتا ہے
آسمان میں
اماوس کا اندھیرا چھا جاتا ہے
دنیا میں
کھوکھلے انسانوں سا سایہ
منڈلاتا ہے

ابراہیم اشک

دشتِ تنہائی

کہیں سراب کہیں دشتِ زندگی اپنی
ہر اک قدم پہ ہے پیاسی رتوں کے ہنگامے
ہر ایک موڑ پہ ٹھہرے اُداس سناٹے
ہر ایک سمت میں دیوار بے نشاں راہیں
غزال بھٹکے ہوئے جائیں تو کہاں جائیں
سفر ہے ڈوبتی سانسوں کا بجھتی آنکھوں کا
بکھر رہے ہیں سبھی خواب موتیوں کی طرح
اجڑ رہے ہیں سب ارمان قافلوں کی طرح
تمام درد کی وادی میں ہے گھنا کہرا
بچھڑ گئے ہیں جو ساتھی وہ یاد آتے ہیں
ابھر رہی ہیں تصور میں چند تصویریں
پھسل رہے ہیں وہ لمحے گلاب موسم کے
کہ جن کی خوشبو ابھی تک بدن سے لپٹی ہے
وہ بھینی بھینی ہوائیں فضا کی مدہوشی
کہ جس میں ڈوب کے رہ جائے آدمی کا وجود
وہ بوند بوند محبت کی پیاس کا عالم
ہوئی جو شام تو سورج کے ساتھ ڈوب گیا
وہ چاند ہنستا ہوا اور دیپ جلتے ہوئے
جو روشنی کی طرح دل میں جذب ہوتے تھے
وہ جھلملاتے ستارے کہ نور سے جن کے
تمام رات نہاتی تھی ہر نظر اپنی
نہ جانے کون چرا کر وہ لے گیا ہم سے
سسک رہی ہے اندھیرے میں اپنی تنہائی
کہ آس پاس جسے سننے والا کوئی نہیں
ہم اپنے درد کو دل سے لگائے بیٹھے ہیں
کہ ایک گوشے میں خود کو چھپائے بیٹھے ہیں
جہاں بہار کا موسم کبھی نہ آئے گا
کہیں سراب کہیں دشت زندگی اپنی!

گلاب رت

یہ کالی کالی گھٹائیں، یہ بادلوں کے ہجوم
یہ بھینی بھینی پھواریں، فضا کی مدہوشی
تصورات میں ہلچل مچانے لگتے ہیں
پرانی یاد کی پریاں کسی ہنڈولے پر
مچل کے عشق کی محفل سجانے لگتی ہیں
کہ سازِ دل کو دوبارہ بجانے لگتی ہیں
فضا میں گونجنے لگتا ہے اجنبی نغمہ
سروں کی جیسے شعائیں بکھرنے لگتی ہیں
غزل کے شعر سے اوراق بجنے لگتے ہیں
ہر ایک لفظ میں مردنگ بجنے لگتے ہیں
صراحی جھومنے لگتی ہے رقص کرتی ہے
مچلنے لگتے ہیں گردش میں آکے پیمانے
لبوں کی پیاس میں صحرا اترنے لگتا ہے
ہر ایک زخم مہکتا ہے پھول کے جیسا
کہ درد روشنی بن کے گذرنے لگتا ہے
یہ ایک گوشۂ تنہائی ایسا لگتا ہے
ٹھہر گئی ہو کوئی کائنات آکے یہاں
کہ بامِ درد میں کئی عرش و فرش ڈوب گئے
تمام عظمتیں جیسے لہو میں رقصاں ہوں
تمام وسعتیں جیسے نظر میں لہرائیں
گلاب رت کے یہ بھیگے ہوئے حسیں لمحے
کہ جس کا درد بہت میٹھا جان لیوا ہے
یہ درد اور بڑھے، اور بڑھے اور بڑھے

جمال اویسی

"آ دیکھ مجھے"

آ دیکھ مجھے
اس روز کے بعد
آکاش سمندر ایک ہوئے
اک سازش میں
مری ناؤ کی لکڑی ٹوٹ گئی
مرے ہاتھ سے چھوٹ گئی پتوار
آ دیکھ مجھے
میں بیچ سمندر میں ایک تختہ پر بیٹھا ہوں
یوں مرے دل کو سکوں ہے بہت
یہ تختہ مجھ کو بچا لے گا
آکاش سمندر مل کر بھی
نابود مجھے کرنے کے لئے
ناکافی ہیں!
آ دیکھ مجھے
وہ رات ہوئی
آکاش میں سب تارے نکلے
عفریت کو اب نیند آنے لگی
میں گانے لگا ہوں
بھولا ہوا اک گیت
مجھے کوئی خوف نہیں
آ دیکھ مجھے!

خلا اپنے جہنم کا

ستارے!
ظلمتوں کے درمیاں
اُجلے جزیرے ہیں
کفن اوڑھے سیہ شب کا
وہ اک بے انت ساگر کی طرف
طوفان کی سلوٹ لئے
ہر دم اور ہر پل موجزن ہیں
ستارے!
ڈوب کر پھر سے ابھرتے ہیں
مجھے یہ کائنات اک طفلِ ناداں کی طرح
معلوم ہوتی ہے
ہمکتی ہے، مچلتی ہے
اچانک سہمی جاتی ہے
جب اس پر وقت آندھی بن کے حملہ کرنے لگتا ہے
ستارے!
موتیوں کی طرح ساگر میں
لڑھک کر گرنے لگتے ہیں
میں ساکن ہو کے سب کچھ دیکھتا ہوں — اور
بلاغت سے بھرے لہجے میں کہتا ہوں
اٹھاؤ!
پھر سے اعماقِ سیہ کے بیکراں تابوت کو
تا کہ
نئے تابوت میں بھر دیں
خلاء اپنے جہنم کا......!

عطاء الرحمٰن طارق

O

دل آج گائے بدھائیاں

موسم کو ہری ہری سوجھنے لگی
لڑکی پہیلیاں بوجھنے لگی
سکھیوں نے بانٹی مٹھائیاں

دل آج گائے بدھائیاں

کاجل دیے کی نشانی ہوا
بادل نچوڑا تو پانی ہوا
ایسے نہ دو اب رکھائیاں

دل آج گائے بدھائیاں

تن من میں جھنکے ہے جھنکار سی
مدھم سروں کی پڑے مار سی
راتوں کو نیندیں نہ آئیاں

دل آج گائے بدھائیاں

O

پھر ہوا یوں کہ سارے کنول کھل گئے
کیا بتاؤں سکھی میں تو لہرا گئی
میرے من میں اداسی نے سایا کیا
کوئی خوشبو مجھے درد پہنا گئی

ہار گوندھے نہ تیوہار میں نے کیے

جب ذرا ہوش جاگے تو مجھ پر کھلا
رت کہیں میرے اندر شرابور ہے
اور میں نے ابھی تک یہ جانا نہیں
گھل رہا ہے جو نشہ مجھی میں تو ہے!

مرغوب علی

بدلتی رتوں کے درمیاں

بہت شاخوں پہ گل کھلتے ہیں ہر پل
گیت ہونٹوں پر تھرکتے ہیں
مری باہوں پہ تارے، چاند اور مخمل
بچھی رہتی ہے
آنکھوں میں
سدا سرسبز میداں کی تمنائیں مچلتی ہیں
امنڈتی شوخیوں سے کھیلتا، سرشار سا میں
وادیوں میں لذتوں کی ڈوب جاتا ہوں
تھکن سے چور نیندوں کے پھسلتے نرم بستر پر
نئے سپنے اگاتا ہوں
مگر اک اور ہے کوئی
وہ جس کی کروٹوں میں رات انگارے بچھاتی ہے
وہ جس کی آنکھ میں ہر شب
چراغوں کی لویں پلکوں کے کنگورے جلاتی ہیں
وہ مجھ سا ہے، مگر ہر رت میں وہ
بےنور رہتا ہے
نہ کوئی چاند ہے اس کا، سمندر اور نہ ساحل ہے
وہ بادل ہے!

ریشم کی سالگرہ

کئی رشتے
عجب گنجان جنگل کی طرح ہوتے ہیں
جن میں روشنی اور راستہ پانا
ہمیشہ غیر ممکن ہے
کئی باتیں
یونہی چھوٹی سی ہوتی ہیں
مگر ان کے معانی کو
مگر ان کی نزاکت کو
مگر ان کی نفاست کو
کہاں تم جان سکتے ہو
یہ رشتوں اور باتوں کا
یہ دن کا اور راتوں کا
جو آنا، اور جانا ہے
جو بننا اور بگڑنا ہے
انھیں تم جان لوگے جب
تو جنگل کے سبھی رستے
تمہیں آسان ہوں گے
اور
کسی کے چمپئی چہرے کی ان میں روشنی ہوگی!

مختار شمیم

نظم

تتلیاں — رنگ رنگ
دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی کھنک / کسمساتی ہوئی آرزو
سبز چادر پہ بکھری ہوئی نرم جھونکوں کی وہ خوب آسا بہار
جو مرے دل کی رگ رگ سے ہوتی ہوئی
روشنی، چاندنی، دھوپ، شبنم —
میں ڈھلتی رہی
لالہ و گل کی رنگیں قبا چاک ہوئی
خوشبوئیں اجنبی لمس پا کر بہکتی رہیں
تتلیاں — رنگ رنگ
اپنے نازک پروں میں سمٹتی رہیں!
شام کی دھند میں
صبح کے ملگجے سائے میں
تتلیاں، رنگ رنگ
جھوم کر جلترنگ (بربط و نے کے سنگ) یوں بجاتی رہیں
— آہِ سوزاں کے نغمے سجاتی رہیں!
خوشبوئیں رقص کرتی رہیں
ہولے ہولے کرن تھاپ دیتی رہی
کتنی یادیں ترے ہجر کا گیت گاتی رہیں!

غزل

نہ آنکھ میں کوئی منظر نہ خوابِ جادہ بھی
نکل پڑے ہیں تری سمت بے ارادہ بھی
سرابِ شورِ تمنا، سکوت زادہ بھی!
ہے تنگ مجھ پہ مگر دشتِ جاں کشادہ بھی
بجھی بجھی سی کوئی آرزو تڑپ اٹھی
لبوں پہ آہی آگیا ایک حرفِ سادہ بھی
ہوائے غیب تھی ایسی اتر کے شاخوں سے
روش پہ چلنے لگے پھول پا پیادہ بھی
شکستِ خواب کے ہیں رنگ کیا چھلکتے ہیں
نگہ کی پیاس، تمنا کی موج بادہ بھی
لہو نچوڑے ہے رگ رگ سے شعر میں مختار
کرے ہیں میر سے کچھ کچھ وہ استفادہ بھی
بجھے بجھے سے چراغوں میں ڈھونڈتے کیا ہو
دھواں دھواں ہے شمیم اب خمارِ بادہ بھی

شاہد میر

راگ رنگ

اک طرف لفظ ہیں
اک طرف رنگ ہیں
اک طرف ہے سُروں کی صدا
رنگ خوشبو لبھاتی ہوئی لفظ کی بندشیں
گھنگروں کی جھنک ہے سُروں کی چمک
اک تراہا بنی
"نغمگی، شاعری، فنِ صورت گری"
کون جانے کسے ہے خبر
میرے احساس کا اصل چہرہ
چھپا ہے کہاں؟
گہرا پاتال ہے
سبز دھرتی ہے یہ
یا کوئی نیلگوں آسماں!

پولٹری فارم

سہولتیں ہیں ہر طرح کی یہ وہی مقام ہے
آب و دانہ، روشنی، ہوا کا انتظام ہے
مریض ہوں تو دیکھ بھال ان کی صبح و شام ہے
توانا جسم کے لئے یہ سارا اہتمام ہے
کسی کو یہ خبر نہیں اسی بہشت زار میں
اماں ملے گی کب تلک
کتنے دن قیام ہے؟

نظم

"من پنجرے" سے گھبرا کر
صبح سویرے اڑ کے چلا "احساس پرندہ"
چاردشاؤں میں گھوما
دہلیزوں پر سجدے کئے
ہر اک دروازہ چوما
لیکن اس کا من چاہا کوئی بھی ٹھکانا نہیں ملا
سہما ہوا "احساس پرندہ"
گھبرایا؟
پنجرے میں واپس لوٹ آیا!!

سید بشارت علی

بے نیازانہ

اور جانے کی تیاریوں میں لگے ہیں
وہ مٹی کہ جس سے بدن اپنا تشکیل پایا
وہ شاہی لبادوں کے قابل کہاں تھی
نہ وہ سر ملا ہے
جو سرداریوں کا سزاوار ہوتا
نہ دل ہی وہ پایا کہ جس میں
کبھی تخت اور تاج کی بھی ہوس آسماتی
نہ کوئی ہنر تھا کہ جس کے سہارے سے
اعزاز و اکرام کی سربلندی کو چھوتے
سو بس اپنی گدڑی سنبھالے ہوئے
خاک کے فرش پر پیر پھیلائے
ساری زمیں مملکت
آسماں کو چھتر سا بنائے ہوئے
بے نیازی کی شان و ادا کو جلو میں لئے
حکمرانی پہ، شاہی پہ، ٹھوکر لگاتے رہے!

فوزیہ فاروقی

نظم

تمہارے بوسوں کے سلسلے سے
جو اک شگوفہ
بدن میں میرے کھلا ہوا ہے
ہماری چاہت کے ایک لمحے کا راز داں ہے
جب اس کی خوشبو
مری رگوں میں رواں دواں ہو
جب اس کی جنبش
مرے لہو میں شرر فشاں ہو
جب اس کی رنگت
ہماری آنکھوں میں گل کھلائے
میں سوچتی ہوں کہ یہ شگوفہ
ہماری دھڑکن سے اپنی دھڑکن کی دُھن ملا کر
مرے لہو سے جو اپنی صورت اُجالتا ہے
شجر ہے کوئی کہ جس کی شاخیں
مرے بدن میں گڑی ہوئی ہیں
دلوں کے آنگن میں جانے کب سے نہاں تھیں
جس کی جڑیں
کسی کو خبر نہیں تھی
کہ بس اچانک وصال کا ایک شدید لمحہ
نمو کی اک بوند میں سمٹ کر
دلوں کے آنگن میں ایسا برسا
کہ اک شجر نے میرے بدن میں
بہار آسودہ آنکھ کھولی!

ریاض لطیف

جزیرہ کے نام

کئی جہانوں سے ماورا ہو کے
خود کو پایا ہے
تیری آنکھوں کے دائروں کی
تمام چیزیں
عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں
کسے بتاؤں کہ میرے آنسو
قیام کرنے لگے ہیں تیری نفی میں آخر
میں الجزائر کی پچھلی راتوں میں
تیرے خوابوں کو چھو گیا ہوں
کبھی میں پیرس کی شاہراہوں پہ
ترے سایے میں جذب ہو کر
گڑا ہوں ورلین اور رانبو کی
کالی سانسوں کے ہر فسوں میں
کسے بتاؤں
مرے جہاں میں "جہاں" معمہ نہیں ہے کوئی
کہ میرے چہرے کی سرزمیں پر
ترے سماوات کا گھنا لمس رُز گیا ہے
جو ہو رہا ہے وہ ہو گیا ہے
اور اب میں
ہونے کے اور نہ ہونے کے
درمیاں تجھ کو بو رہا ہوں
بس ایک نابینا آسماں پر
خدا کی آنکھوں سے رو رہا ہوں

تین نمبر کی گلی میں چڑیا کی قبر

گر کبھی جاؤ وہاں،
آہستہ چلنا
تین نمبر کی گلی میں
قبر ہے چڑیا کی ننھی سی
پَروں میں جس کے ہم نے
اپنے بچپن کی اڑانیں دفن کر دی ہیں
ابھی تک قبر کی مٹی ہے گیلی
جس میں ہم لڑکوں کے آوارہ تخیل کا
جہاں سویا ہوا ہے
تین نمبر کی گلی کی ٹیڑھی میڑھی سانس میں
پوشیدہ تھے شبیر کتنے!
ایک تھا شبیر دامو
ایک تھا شبیر پاتو
ایک تھا شبیر پپی اور ایک شبیر تی تھا
علیو بدرو اب کہاں ہے؟
کھو گیا ہے ہر کوئی اب بچی جھوٹی قبر میں
اور تین نمبر کی گلی کے موڑ پر
سونی ہوا کی آنکھ میں
کھوئے ہوئے چہرے بھٹکتے ہیں
کہ جن کے دائرہ در دائرہ حلقوں میں
چڑیا کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ
دور تک آتی ہے ملنے مجھ سے
اپنی قبر سے باہر!

فاطمہ تاج

پچھتاوا

بہت سے دن گذر گئے کئی راتیں بھی کٹ گئیں
آسماں چاند تاروں سے جگمگاتا رہا
کبھی اماوس کی چادر میں منہ چھپائے اونگھتا رہا
زمیں اپنے محور پر
اور میں اپنی تنہائیوں کی بے برگ شاخوں پر
گم سم سی بیٹھی رہی
سمندروں میں بھنور رقص کرتے رہے
دشت وصحرا دائروں سے آگے بڑھتے رہے
ماہ وسال میں ڈھلنے والے عمر کے تمام لمحے
یادوں کی اُس حسین محفل میں جا بیٹھے
جہاں سے کوئی لوٹنا نہیں چاہتا
تغیرات کی اس دنیا میں
میری سوچ نے زاویہ نہیں بدلا
سوچ کے لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی
ہمیشہ تلاش کا راستہ طے کرتی رہی
تخیل کے ایوانوں میں جھانکا
ارمانوں کے شاداب گلشن پر نظر ڈالی
ماضی کے شہر میں گھومتی
یادوں کی گلیوں کو کھوجتی
بند کواڑوں کو دھکیلتی
زندگی کے ہر کونے میں
پُر امید نظریں دوڑاتی رہی
لیکن مجھے نہ تم ملے نہ وہ خواب گاہ
جہاں آنکھیں صرف حسین خواب دیکھتی ہیں!!

عادل حیات

زندگی کی راہ پر

شعاعیں جب
زمیں کے گوشے گوشے میں اترتی ہیں
اچانک نیند سے آنکھوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے
امیدیں جگمگاتی ہیں
ہر ایک جانب
قدم کی چاپ سے خوابیدہ راہیں جاگ جاتی ہیں
تو میں بھی زندگی کرنے نکلتا ہوں
پھر اس کے بعد
کتنی خواہش دل میں ابھرتی ہیں
سحر سے شام تک تکمیل جن کی
سرابوں کو حقیقت جانتا ہوں
کہ اک انسان ہوں میں بھی!

تراشے

عالمی ثقافتی میلہ

● دلی والوں کو پہلی بار ایک عالمی ثقافتی میلہ میں شرکت کرنے کا موقع ملا اس میلے میں فنون لطیفہ کے مختلف مظاہروں کے ساتھ ساتھ ثقافتی سطح پر دنیا کے دوسرے ملکوں کو مدعو کر کے ان کی ثقافتی سرگرمیوں کو ہندوستان کی سرزمین پر منعقد کرنا بھی شامل تھا قوالی اور صوفیانہ موسیقی کے پروگراموں کے علاوہ ہندوستان کے مقبول ملبوسات اور اس کے کھانوں کے رنگارنگ ذائقوں کے دسترخوان بھی شامل تھے اس میلے میں دلی والوں کی ہجوم کی صورت میں شرکت اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ انھیں یہ میلہ اچھا لگا جس کے انعقاد کے لیے سیاحت کے مرکزی وزارت کے علاوہ سنگیت ناٹک اکادمی اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشن جیسے ادارے شامل تھے۔

پکاسو کی تصویر کا قضیہ

● ماڈرن آرٹ کو تحفظ فراہم کرنے والے ایک امریکی میوزیم نے فیڈرل کورٹ سے کہا ہے کہ وہ پکاسو کی دو مشہور پینٹنگیں کو اس کی ملکیت قرار دے جنھیں نازی جرمنی میں ایک دباؤ کے تحت فروخت کردیا گیا تھا یہ تصویریں ہیں Boy leading a horse (1906) اور Le mouldin de a Galta 1900 پہلی پینٹنگ 1964 میں اور دوسری پینٹنگ 1963 میں میوزیم کو عطیے میں دی گئی تھیں میوزیم کا کہنا ہے کہ یہ تصویریں کبھی کسی جبر یا دباؤ کے تحت نہیں بیچی گئیں اور یہ جائز طور پر میوزیم کا اثاثہ ہیں لیکن ان دونوں پینٹنگیں کی ملکیت کو اختلافی اور متنازعہ فیہ بتانے والوں کا کہنا ہے کہ پینٹنگیں یقینی طور سے جبریہ طور پر ہی بیچی گئی تھیں اور ان کے خریدنے

والوں کے نام بدلتے رہے ہیں پکاسو کی پینٹنگیں اور آرٹ کے نادر نمونوں کی تجارت کرنے والوں کے لئے امریکی عدالت تک پہونچنے والا یہ مسئلہ خاصی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔

ڈاونسی (Davinci) اٹیلین نہیں عرب تھا

● ڈیلی ٹیلی گراف نے ایک تازہ تحقیق کے حوالے سے یہ خبر دی ہے کہ لیونارڈو ڈاونسی جس کی پیدائش اٹلی کی بتائی جاتی ہے وہ دراصل عرب نژاد تھا انسانی انگلیوں اور پنجے کے حوالے سے انسان کے نسلی نسب کا پتہ لگانے والے اٹلی کے ماہرین کا ایک گروپ ڈاونسی کی پینٹنگس پر اس کی انگلیوں کے نشان کھوجنے کی تین سال سے جو کوششیں کر رہا تھا اس میں اسے کامیابی مل گئی ہے اور اس کی ایک پینٹنگیں پر اس کی انگلیوں کے بڑے واضح نشان مل گئے ہیں ماہرین کا کہنا ہے کہ مغربی ایشیاء کی ساٹھ فی صد انسانی آبادی کی انگلیوں کی ساخت ڈاونسی کی انگلیوں کی ساخت سے ملتی جلتی ہے اس انکشاف سے اس تھیوری کو تقویت ملی ہے کہ ڈاولسنی کی ماں کیٹرینا دراصل ایک غلام تھی جو اِستنبول سے آگئی تھی وہ (Vinci) Tuscany کی رہنے والی کسان عورت نہیں تھی 1519 میں ڈاونسی کے باقیات اس علاقے میں لڑی جانیوالی مذہبی جنگوں کے درمیان ادھر ادھر بکھر گئے تھے Tuscany میں ہونیوالی اس تحقیق کے دوران 52 مخطوطات اور پینٹنگ پر اس کی انگلیوں کے نشانات کی کھوج کی گئی تھی جس پینٹنگ پر انگلیوں کے نشانات کو تحقیق کے لیے مفید سمجھا گیا وہ اس کی پینٹنگ Portrait of a lady with an ermine پر ملے تھے۔

ہندوستانی گٹار بجانے والوں نے ریکارڈ بنایا

● پچھلے دنوں شمال مشرقی ہندوستان کے شہر شیلانگ میں دس دنوں کا ایک Autumn فیسٹول منایا گیا اس فیسٹول کا یادگار لمحہ وہ تھا جب ایک کھلے میدان میں آسام،

میگھالیہ اور میزورم کے 1,730 گٹار بجانے والوں نے ایک ساتھ ہم آہنگ ہوکر چھ منٹ تک تواترسے باب ڈائلن کے مقبول گانے Knocking on Heavens Door کی دھن بجائی یہ ایک ریکارڈ تھا جسے گنی بک میں درج کرانے کے لیے میگھالیہ کی وزارتِ سیاحت مطلوبہ کاروائی کرچکی ہے اس سے قبل یہ ریکارڈ امریکہ کے شہر Kansas کے پاس تھا جہاں 1,721 گٹارسٹوں نے جمع ہوکر نیا عالمی ریکارڈ درج کرایا تھا یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ 2006 میں اسی شہر شیلانگ میں 7,951 ڈرم بجانے والوں نے ایک ساتھ ہم آہنگ ہوکر اتنی بڑی تعداد میں پانچ منٹ تک مسلسل ڈرم بجانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔

اسرائیل سب سے بڑا دہشت گرد

● مہاتما گاندھی کے پوتے ارون گاندھی باپو کے دوسرے بیٹے منی لال کے بیٹے ہیں واشنگٹن پوسٹ کی ایک ویب سائٹ پر سرکولیٹ ہونے والے اپنے مضمون میں باپو کے عدم تشدد اور صلح کل والے فلسفے سے انحراف کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل اور یہودی دونوں ہی عالمی سطح پر تشدد کو فروغ دینے والے زبردست کھلاڑی Players ہیں ارون گاندھی نے وضاحت کی کہ انھوں نے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ چاہتے ہیں کہ عالمی سطح پر اسرائیل اور یہودیوں نے تشدد کے کلچر کو پھیلانے میں اپنا جو سرگرم کردار ادا کیا ہے اس پر مباحثے اور مکالمے کی فضا پیدا ہو ارون گاندھی کے اس تبصرے کے نشانہ بننے والے یہودیوں نے اپنے بے حد غم وغصے کا اظہار کیا اور معافی مانگنے کا زوردار مطالبہ کیا گیا تو گاندھی نے Reohester امریکی یونیورسٹی سے وابستہ Peace Institute سے استعفیٰ دیدیا ارون گاندھی نے 1950 میں رپورٹر کی حیثیت سے ٹائمز آف انڈیا میں کام شروع کیا تھا وہ 1987 میں امریکہ منتقل ہوگئے تھے۔

شاہ رخ اور سگریٹ

● وزیر صحت A.Ramadoss اور بالی وڈ کے بادشاہ شاہ رخ خان کے درمیان فلموں اور ذاتی زندگی میں سگریٹ نوشی کرنے پر جو دلچسپ نوک جھونک ہوئی اس میں شاہ رخ کا موقف دلچسپ تھا شاہ رخ نے اپنے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کہا کہ "میں وزیر صحت کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ہم اداکاروں کی صحت کے سلسلے میں اپنی فکر مندی کا اظہار کیا" شاہ رخ نے وضاحت کی کہ وہ ہمیشہ ہی یہ مانتے

اور مناسب موقعوں پر یہ اعتراف کرتے رہے ہیں کہ سگریٹ صحت کے لئے نقصان دہ ہے اور وہ ذاتی زندگی میں تمباکو نوشی ترک کرنے کے لئے کوشاں ہیں لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ سنیما ایک Creative میڈیم ہے اور فلموں میں سگرٹ نوشی پر مکمل پابندی صحیح نہیں ہوگی آپ کو یاد ہوگا کہ ۲۰۰۶ میں وزیر صحت نے فلموں میں سگرٹ نوشی پر مکمل پابندی لگانے کی فضا بنائی تھی لیکن ان کی اس مہم کو روشن دن دیکھنا نہ نصیب ہوا۔

قرآن کا نادر نسخہ
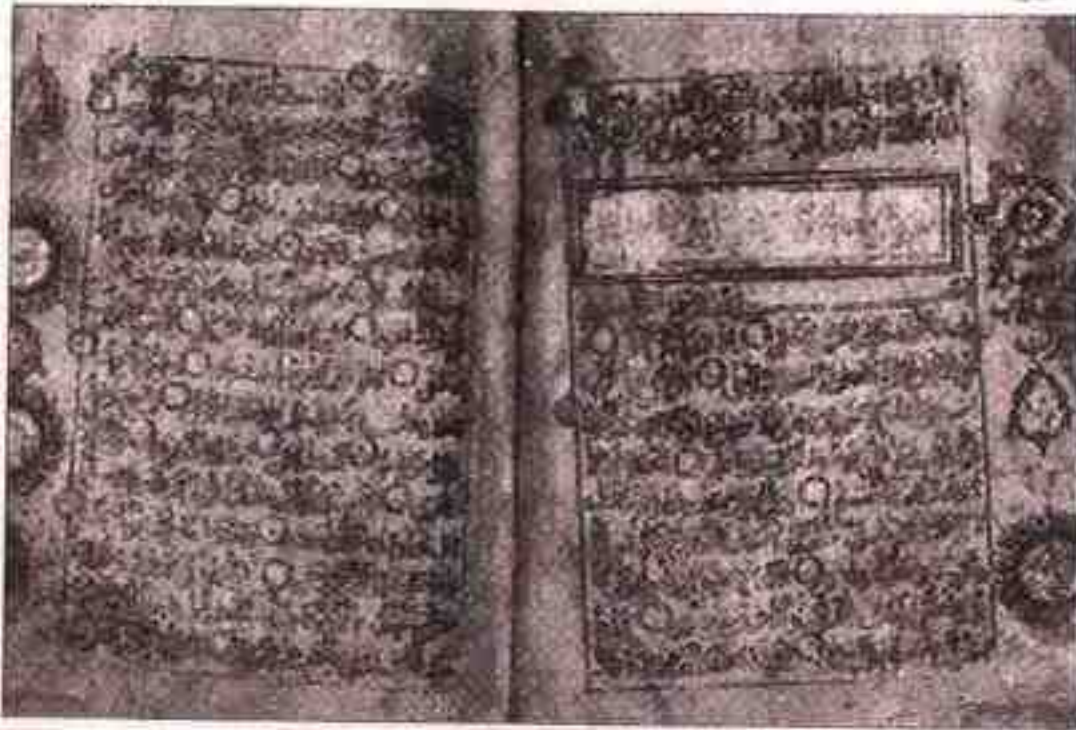
- آرٹ کے نادر نمونوں کو عالمی سطح پر نیلام کرنے والی ایجنسی نے اس بار اسلامی آرٹ کے نادر نمونے انٹرنیٹ کے ذریعے مشتہر اور نیلام کر کے اپنے اندازے سے کہیں زیادہ رقم بٹور کر وہ نوادارت ایک اسلام کے شیدائی کو سونپ دیئے نادر اسلامی نمونوں میں 1203 عیسوی میں سونے سے لکھا قرآن کا قلمی نسخہ بھی تھا جس کے حاشیوں پر چاندی سے عبارت آرائی کی گئی تھی سوتھ بھی کو اس پوری deal میں 5.9 ملین پاونڈس ملے اس میں قرآن کا ہدیہ 1,140,500 پاونڈس تھا جو اس آسمانی صحیفے کے لئے اب تک کا دیا جانے والا سب سے بڑا ہدیہ ہے اس موقع پر خطِ کوفی میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ کا ہدیہ نو لاکھ سولہ ہزار پانچ سو پاونڈس ادا کیا گیا۔

سوتھ بی کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ اسلامی آرٹ اور فنون کے شہ پاروں کے حصول میں نوادارت جمع کرنے والوں کی دلچسپی بڑھی ہے اور ہم اس میدان میں مزید امکانات کی کھوج کریںگے۔

2.58 ملین پاونڈ میں ریمبراں کی تصویر

- ممتاز ڈچ مصور Rembrandt نے اپنے عروج کے زمانے میں اپنا جو پورٹریٹ بنایا تھا اُسے پچھلے دنوں لندن میں ہوئے ایک نیلام میں گھنٹے کی آخری چوٹ پر 2.58 ملین پاونڈس میں خریدا گیا ریمبراں کے اس Portrait کے بارے میں یہ تاثر بھی نیلام گھروں میں گردش کر رہا تھا کہ یہ

پورٹریٹ ریمبراں کے کسی ہم عصر کا بنایا ہوا ہے اور یہ کہ اس کی اصلیت مشکوک ہے لیکن برسوں آرٹ کے کسی پرانے شیدائی کے گھر کی دیوار پر آویزاں اس پورٹریٹ کے نئے مالک اور دوسرے نمبر کی بولی لگانے والے دونوں کا خیال ہے یہ ریمبراں ہی کا بنایا ہوا پورٹریٹ ہے تب ہی اس کی اتنی بھاری قیمت لگانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

وان گاگ کا پورٹریٹ جعلی نکلا

● عالمی سطح پر اور ہندوستانی آرٹ گیلریوں میں ماڈرن پینٹنگس کی بھاری قیمتوں نے آرٹ کے شوقینیوں کو خاصا تذبذب میں ڈال دیا ہے اب کسی بھی بھاری قیمت کی پینٹنگس کو خریدتے ہوئے اس کے اصلی اور جینوئن ہونے کی تصدیق پر اصرار بھی اتنا ہی آرٹ مارکٹ میں بڑھتا جارہا ہے بڑے بڑے پینٹروں کے ناموں سے منسوب تصویروں کے جعلی ہونے کا معاملہ عالمی سطح پر اس وقت سامنے آیا جب آرٹ کے شہ پاروں کے ماہرین نے ایمسٹرڈم کے واں گاگ میوزیم میں پچھلے 60 سال سے آویزاں ایک Self Potrait کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ وان گاگ کا یہ پورٹریٹ 1940 میں 2,196 پونڈس میں خرید کر ملبورن کی ایک آرٹ گیلری میں آویزاں کیا گیا تھا پھر اسے ایڈنبرگ کی ایک آرٹ گیلیری کے لیے مستعار لے لیا گیا 1886 کے آس پاس کے برسوں میں بنائے جانے والے اس پورٹریٹ کا ذکر وان گاگ کے کسی خط میں نہیں ملتا۔

آسٹریلیا کے وان گاگ میوزیم کے پاس اب اس پورٹریٹ کو دیوار سے اتار کے ردی میں ڈالنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہا۔

عالمی ادب میں عربوں کی دلچسپی

● ابوظہبی میں سرگرم ایک اشاعتی ادارے 'کلمہ' نے خلیج کے عربی داں قارئین کے لیے ہر سال ایک کتابوں کے عربی تراجم شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کتابوں کو بازاروں میں بڑے شوق سے خریدا اور پڑھا جارہا ہے ایسے ادیبوں کی فہرست میں لاطینی ادیب گارسیا مارکیز جرمن ناول نگار گنسٹر گراس کے ساتھ ساتھ اسٹیفن ہاکنگ، امبرٹو ایکو، ہیریکو ٹراکامی اور نوم چومسکی جیسے ادیبوں کی مقبول کتابیں بھی شامل ہیں منصوبے کے پہلے سال میں سو کتابوں کے عربی ترجمے شائع کیے جائیں گے اس کے بعد کے برسوں میں ہر سال 500 ٹائٹل ترجمہ کرائے جائیں گے پہلے 100 ترجمے جاپانی، سویڈن، چیک، روسی، چینی، اٹیلین، ناروجین، اور لاطینی اور قدیم یونانی زبانوں کی کتابوں کے ہونگے باقی ترجمے انگریزی زبان میں شائع ہونیوالی مختلف

موضوعات کی کتابوں کے ہوں گے ان تراجم کے پس پردہ اقوام متحدہ کی وہ Arab Human Develpment Report ہے جس میں کہا گیا تھا کہ بیرونی دنیا میں مختلف سطحوں پر آج کے انسان کو درپیش مسائل پر جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جارہا ہے اس سے عرب دنیا کے دانشور باخبر نہیں ہیں رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اکیلے اسپین میں ہر سال اتنی تعداد میں غیر اسپینی زبانوں کے تراجم شائع ہوتے ہیں جتنے عرب دنیا میں پچھلے ایک ہزار برس میں شائع ہوئے ہیں ''کلمہ'' کے مصری سربراہ کریم ناگی نے زیر حوالہ منصوبے کے تحت جب پہلے ترجمے کو متعارف کرایا ہے تو انھوں نے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد ہے کہ بے خبری اور لاعلمی کا موجودہ فاصلہ کم ہو اور عرب دنیا کی لائبریریوں میں اہم غیر ملکی ادب اور علم وفکر کی حامل کتابوں کے نہ ملنے کا گلہ بھی جاتا ہے انھوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ اہم تحریروں کے انتخاب میں ایک توازن برقرار رکھا جائے گا تاکہ کلاسک کے ساتھ ساتھ معاصر کتاب بھی مطالعے کا حصہ بنی رہی۔ اس موقع پر برطانوی ادیب آن میکیون نے یہ اعتراف کیا کہ ماضی میں دنیا نے عربوں کے علمی اور فکری سرمایے سے بڑے پیمانے پر استفادہ کیا ہے اب وقت یہ ہے کہ عرب دنیا غیر عرب دنیا کے فکری سرمایے سے استفادہ کرے اس سال جن قلم کاروں کے تراجم کرائے جارہے ہیں ان کے نام ہیں Nadine Gordimer, Khaled Hosseini, Albert Camus, George Eliot, ALbert Einsteein, Jacques Lacan and Spinoza۔

غالب ہی غالب

- مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا خواہ یوم وفات ہو یا ولادت دلی ایسے موقعوں پر ان کے ذکر وفکر میں ڈوب جاتی ہے غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنے سالانہ ایورڈس کی تقسیم کے موقع پر اقبال کی فکر اور شاعری کو اس بار کے سالانہ عالمی سی می نار کا موضوع بنایا گیا تو مبر میں نئی دلی میں تین روز تک جاری رہنے والی ان تقریبات میں غالب کو اس کی آن بان کے ساتھ یاد کیا گیا سی می نار اور مشاعرے میں بھی غالب کا ذکر خوب ہوا یہ سارا بارونق ادبی ہنگامہ سریندر ورما کے غالب پر لکھے ڈرامے 'قید حیات' پر ختم ہوا اسی تسلسل میں دلی سرکار نے گلی قاسم جان میں غالب کی رہائش گاہ تک شوبز کے انداز میں موم بتیوں کا ایک جلوس وزیر اعلیٰ شیلا دوکشت کی

قیادت میں نکالا یہاں غالب کی غزلیں گائی گئیں اور حسب روایت غالب کی غزلوں کو کتھک ناچ سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اوماشرما نے انھیں دیکھنے والوں کے لیے بے حد دلکش بنا دیا دلی سے باہر بھی غالب خوب یاد کئے گئے کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ سہ ماہی میں غالب اور غزل دلی کی ثقافتی زندگی پر چھائے رہے۔

لال قلعه عالمی ورثه

● دلی میں منعقد ہونیوالی ایک تقریب میں یونیسکو کے ڈائریکٹر جنزل Koithro Matsuura نے اُس کتبے کی نقاب کشائی کی جس میں ہندوستان میں مغل تعمیرات کے سلسلے کے سب سے پرشکوہ اور خوبصورت لال قلعے کو عالمی ورثہ قرار دینے کی توثیق کی گئی ہے اور جسے لال قلعے کے مین دروازے کی دیوار پر سیمنٹ کر دیا جائے گا اب دلی شہر میں لال قلعے کے عالمی ورثہ قرار دیے جانے کے بعد مغلیہ دور کے تین آثار قدیمہ عالمی ورثے کے تحت آگئے ہیں لال قلعے کے علاوہ قطب مینار اور ہمایوں مقبرہ پہلے ہی یونیسکو کی مرتب کردہ عالمی ورثے کی فہرست میں موجود ہیں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے زمانہ اقتدار میں 1639 اور 1648 عیسوی کے درمیان تعمیر ہونے والا سرخ پتھروں کا لال قلعہ بہادر شاہ ظفر کے معزولی کے زمانے تک مغلوں کا پائے تخت رہا تھا دلی والے خوش ہیں کہ لال قلعے کو یونیسکو کے ذریعہ عالمی ورثہ قرار دینے کے اس اقدام سے ہندوستان میں بیرونی سیاحوں کی آمد میں اضافہ ہوگا۔

اسرائیلی عورتیں اور فلسطینی جدو جهد

● کوئی بیس سال پہلے فلسطینیوں کی سرزمین پر اسرائیل کے جبریہ فوجی قبضے کے خلاف ایک عوامی جدوجہد وانتفاضہ، کا آغاز ہوا تھا تو دنیا کے امن پسندوں کو یہ بات حیرت انگیز لگی تھی کہ اپنی سرزمین سے ایک جبریہ قبضے کو ختم کرنے کے لئے انتفاضہ کے نام سے شروع ہونیوالی اس عوامی مزاحمت کے لئے جان کی قربانی دینے والے بچوں، نوجوانوں اور لاکھوں مردوں عورتوں کا بنیادی ہتھیار صرف پتھر تھا غاصبانہ قبضے کے خلاف پتھروں کی مدد سے لڑی جانے والی یہ دنیا کی پہلی لڑائی تھی یروشلم کی بائیں بازو کی حامی کچھ اسرائیل عورتوں نے فلسطینیوں کی اس منصفانہ لڑائی کی حمایت کرنے کے لئے

"وومن ان بلیک" Women in Black (WIB) نامی ایک تنظیم بنائی تھی جس کا سیاہ پلے کارڈوں پر لکھا ایک متعین نعرہ تھا "End the occuption" اسرائیل کے چالیس مقامات پر سرگرم WIB آج دنیا بھر میں پھیل چکی ہے اور آزادی کے حق میں جبر اور قبضے کے خلاف یہ تنظیم جرمنی، انگلستان، امریکہ اور افریقہ میں وہاں کے ایسے مسائل کے بارے میں احتجاج کرنے میں سرگرم ہے عرب، یہودی اور عیسائی عورتوں کی اس تنظیم نے گذشتہ ۲۸ دسمبر کو بیس برس پورے کرنے کی ایک بے حد اثر آفریں تقریب اسرائیل میں منائی تنظیم کار یہودی خاتون Gila Svarsky نے اس موقع پر کہا "میں اسرائیل سے محبت کرتی ہوں لیکن میں اپنے ملک کو یہ اجازت نہیں دینا چاہوں گی کہ وہ ان علاقوں پر قبضہ کرکے وہاں آباد ہو جائے جن پر اس کا حق نہیں ہے۔"

ستیہ جیت رے کے آرٹ کی نمائش

• فلم ساز ستیہ جیت رے کی شہرت تو ان کی مثالی اور کامیاب فلموں کی بناء پر ہے لیکن ان کے بارے میں اب بھی اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ وہ آرٹسٹ پہلے ہیں اور فلم ساز بعد میں یوں تو ستیہ جیت رے کی فلموں اور فوٹو گرافی کی کئی نمائشیں ہوتی رہتی ہیں لیکن اس بار کلکتے میں آرٹ آف ستیہ جیت رے کے عنوان سے جو نمائش ہوئی اس میں رے کے پرستاروں کی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ اس نمائش میں رے کی ڈرائینگس اور illustrations کے کئی خوبصورت نمونے شامل تھے شانتی نکیتن کے کلا بھون میں جا کر آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے والے رے نے کلکتے کی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لئے صابن، تیل، سگریٹ وغیرہ کے illustrations بھی بنائے تھے ان کے علاوہ نمائش میں کتابوں کے وہ ٹائٹل Book Jackets بھی تھے جو رے نے کلکتے کے اشاعتی ادارے Singent Press کے لیے بنائے تھے۔

وان گاک کی اسکیچ بک کی بازیافت

• حال ہی میں ڈچ مصور وان گاگ کی ایک قیمتی Sketchpad ملی ہے 60 صفحات کی اس Sketch Book کی مارکٹ قیمت 4 ملین یوروز ہے یہ اسکیچ بک وان گاگ کی بیٹی کو اپنے باپ کے ایک پرانے اسٹور روم سے ملی ہے اس اسکیچ بک کے حقیقی اور اصلی ہونے کی تصدیق کے لیے اس نے ایمسٹرڈم کے 'وان گاگ میوزیم' سے رائے مانگی۔ میوزیم کے ماہرین کے خیال میں یہ اسکیچ بک وان گاگ ہی کی بنائی ہوئی ہے میوزیم کے ایک ماہر آرٹسٹ کے مطابق ڈچ مصور کی یہ اسکیچ بک مصوری کے عالمی شائقین کے لیے ایک بڑا نادر تحفہ ہے۔ جس دریافت کرنے کا سہرہ وان گاگ کی بیٹی Peppa کو جاتا ہے۔

سلطان اختر

تہہ بہ تہہ منظرِ شب تاب میں روشن ہے ابھی
کوئی تو ہے جو میرے خواب میں روشن ہے ابھی

اس کی آمد سے ہے محروم دلِ خانہ خراب
وہ مگر دیدۂ بیتاب میں روشن ہے ابھی

طنز سہہ کر بھی حریفوں کو دعائیں دینا
ہم فقیروں کے یہ آداب میں روشن ہے ابھی

اب کے طوفاں میں بجھے کتنے سفینوں کے چراغ
اپنی کشتی ہے کہ سیلاب میں روشن ہے ابھی

ہم کہ اک خستہ حویلی ہیں مگر اپنا وقار
بام و در منبر و محراب میں روشن ہے ابھی

گھومتا پھرتا ہے وہ باغِ تمنا میں مدام
اس کی خوشبو گلِ شاداب میں روشن ہے ابھی

پارہ پارہ سہی پیراہنِ تہذیبِ قدیم
پھر بھی کچھ اطلس و کمخواب میں روشن ہے ابھی

اس سے ملنے کا نشہ ہو کہ بچھڑنے کا خمار
کچھ نہ کچھ تو دلِ بیتاب میں روشن ہے ابھی

اٹھتی رہتی ہیں سرِ آب لہو کی موجیں
تشنگی حلقۂ گرداب میں روشن ہے ابھی

رقص کرتا ہے یہ اندازِ جنوں دوڑتا ہے
دل اگر خوش ہے تو چہرے پہ بھی خوں دوڑتا ہے

کبھی سرسبز ہے منظر کبھی بے آب و گیاہ
کشتِ اُمید میں یہ کیسا فسوں دوڑتا ہے

جذبۂ عشق بہت خاک اڑاتا ہے مگر
کوئے جاناں میں بہ اندازِ سکوں دوڑتا ہے

صرف مخلوقِ خدا پر ہی تو موقوف نہیں
سینۂ دہر میں بھی سوزِ دروں دوڑتا ہے

خستگی ایسی تو مجھ پر کبھی گذری ہی نہ تھی
اب کے سر تا بہ قدم حالِ زبوں دوڑتا ہے

کیسی وحشت ہے کہ دم لینے کی فرصت بھی نہیں
جس کو دیکھو وہی ہمرنگِ جنوں دوڑتا ہے

غور کرتا ہوں تو ہر لمحۂ بیتاب یہاں
جتنا میں سوچتا تھا اس سے فزوں دوڑتا ہے

اپنی رفتار پہ نازاں بھی ہوں شرمندہ بھی
رزم گہہ میں کوئی بے وجہ بھی یوں دوڑتا ہے

ایسی ویرانی تو دیکھی نہ سنی تھی اختر
ہر طرف عالمِ فانی میں سکوں دوڑتا ہے

عقیل شاداب

O

جسم کا صندل اکیلا
آنکھ کا کاجل اکیلا

گھٹ رہا ہوں خود میں ایسے
گاؤں کا پیپل اکیلا

وہ ادھر تنہا پریشاں
میں ادھر بالکل اکیلا

یہ رہ کوہ ندا ہے
عمر بھر اب چل اکیلا

دل کی اس بنجر زمیں پر
کیا کرے بادل اکیلا

پتے سارے جھڑ چکے ہیں
رہ گیا ڈنٹھل اکیلا

کونے میں شاداب تنہا
اور اک چپل اکیلا

O

تلاش کیسے کروں اب میں رہ گذر میری
وہ اشک ٹپکے کہ دھندلا گئی نظر میری

میں اک بگولہ ہوں دوش ہوا پہ چلتا ہوں
نہ روک پائیں گے رفتار، ہم سفر میری

رقیب اپنے علاوہ نہیں کوئی اپنا
ہوئی ہے اپنی ہی تنقید میں بسر میری

کہ ہوتے ہوتے ہی ہوجاؤں گا فنا اک دن
کہ جھکتے جھکتے ہی جھک جائے گی کمر میری

مرے ہی اپنے ہوئے خون میرے کے پیاسے
کہ کربلا نہیں بن جائے میرا گھر میری

جو مجھکو بھول گئے ہیں بنامِ بے خبری
انہیں بھی ایک دن مل جائے گی خبر میری

فراقِ یاد میں پلکوں سے خون ٹپکے ہے
گواہی دیتی ہے دن رات چشمِ تر میری

میں اپنے آپ میں ہوں منفرد مگر شاداب
زمانے اس طرح تقلید تو نہ کر میری

رونق شہری

O

میں تتلی کے پروں کو خوشبوؤں میں گھول دوں گا
مہکتی رت تجھے تحفہ کوئی انمول دوں گا

رکی موجِ مسرت سوکھ جانے کا نہیں غم
پہنچتے ہیں جو تجھ تک راستے سب کھول دوں گا

شئ عنقا مروت سب جگہ یکساں نہیں ہے
زیادہ بانٹنے کی فکر میں کم تول دوں گا

خموشی ہی جواب جاہلاں کا ہے تقاضا
ضروری بھی نہیں سب اس کے منہ پر بول دوں گا

کوئی بادل سا مجھ پر جھکنے کی کوشش کرے گا
برسنے سے ہی پہلے اپنی آنکھیں کھول دوں گا

یہی تصویر شرمندہ کرے گی مجنوؤں کو
رئیس شہر کے بھی ہاتھ میں کشکول دوں گا

بڑے دعوے کیے ہیں گیسوئے شب کھولنے کے
بڑھے ناخن سے اپنی بھی گرہ میں کھول دوں گا

کبھی نقل مکانی کا نہیں خدشہ ہے غالب
جہاں جاؤں گا اپنے ظرف کا ماحول دوں گا

محسن جلگانوی

O

یقین کے ہاتھ عطا کر گمان تھوڑا سا
کہ آسمان سے دے آسمان تھوڑا سا

مری زمین پہ اس نے محل بنایا تھا
مگر دیا نہ مجھے سائباں تھوڑا سا

وہیں سے اس کی ندامت کے سلسلے نکلے
مرے خلاف تھا اس کا بیان تھوڑا سا

بہت ہیں بارشیں دیوار و در کا کیا ہوگا
بچا تھا پچھلے برس ہی مکان تھوڑا سا

بس ایک ضد تھی کہ اٹھے نہ بیچ میں دیوار
کہ میں نے مانگا نہیں کب تھا مکان تھوڑا سا

یہ کن حصاروں میں میری سزا کو بانٹ دیا
زمین تھوڑی سی پھر آسماں تھوڑا سا

مدارِ ناصرؔ و باقیؔ تو خوب ہے محسنؔ
مگر وہ میرؔ کا طرزِ بیان تھوڑا سا

راشد انور راشد

○

وہ تو اس بار بھی آیا ہی نہیں وادیٔ گل
اب کسی رُت کا بھروسہ ہی نہیں وادیٔ گل

لوگ خوشبو کی تجارت میں ہیں مصروف، مگر
یہ ہنر، ہم نے تو سیکھا ہی نہیں وادیٔ گل

اس علاقے میں بھی آسکتی ہے پت جھڑ کی صدا
ہم نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں وادیٔ گل

لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، لیکن اپنا
کوچ کرنے کا ارادہ ہی نہیں وادیٔ گل

چھپ گیا ہے کسی کہسار میں سورج میرا
کتنے یگ بیتے، نکلا ہی نہیں وادیٔ گل

صرف اک بار نظر آئی یہاں سبز پری
پھر کسی اور کو دیکھا ہی نہیں وادیٔ گل

اس نے جاتے ہوئے آنکھوں کو بشارت دی تھی
کوئی منظر یہاں بدلا ہی نہیں وادیٔ گل

ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے انہونی کا
دل بھی سینے میں دھڑکتا ہی نہیں وادیٔ گل

○

سفر میں اب کے ہوا اطمینان، ریگستان
سنائی دیتی ہے مجھ کو اذان، ریگستان

ہوا کی ضد ہے کہ تجھ کو تباہ کردے گی
دکھا دے اپنی انا، آن بان، ریگستان

سلگتی ریت میں ہی تربیت جنوں کی ہوئی
یہی تو ہے مری وحشت کی شان، ریگستان

کسی طرح سے اگر آگیا سمندر میں
مٹا نہ پائے گا میرا نشان، ریگستان

کوئی بھی رُت ہو نتیجہ نہیں نکلتا ہے
میں دے رہا ہوں عجب امتحان، ریگستان

ہرے بھرے جو علاقے تھے، ہیں سرِفہرست
ادا ہے کرنا تجھے بھی لگان، ریگستان

تو ہر نگاہ میں، ہر دل میں ہے مگر، کب سے
تری تلاش میں ہے ایک جہان، ریگستان

وہ ٹولی روندنے نکلی ہے تیری وسعت کو
کہ اب سنبھال لے تیرو کمان، ریگستان

گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھو شوق سے تم
رہے گا اپنا سدا سائبان، ریگستان

میں ڈھونڈھتا ہوں کہ پھر کھو گیا ہے برسوں سے
یہیں کہیں پہ مرا خاندان، ریگستان

اگر وجود کی وادی بھی ہوگی، معدوم
تو سوچ لینا ہے وہم وگمان، ریگستان

اکرم نقاش

O

مری شام رات سے ڈر گئی
کہیں راستے میں اُتر گئی

کبھی زندگی کے بھی پاؤں تھے
ترے ابد جیسے ٹھہر گئی

کوئی خواب آنکھ سے گر گیا
کوئی چاہ آنکھوں میں بھر گئی

تجھے سوچتے ہی طرف طرف
کوئی کہکشاں سی بکھر گئی

جو طلب تھی بستر مرگ پر
یہ بھلا ہوا کہ وہ مرگئی

ہے یہ کس خیال کی روشنی
درِ دل سے شام اُتر گئی

شبِ ہجر ڈھونڈتی ہم نفس
جو چلی تو اپنے ہی گھر گئی

O

کھُلی اور بند آنکھوں سے اسے تکتا رہا میں بھی
تری دنیا کے پیچھے بھاگتا پھرتا رہا میں بھی

مری آواز پچھلی رات تجھ تک کیسے آپاتی
کسی گہرے کنویں میں رات بھر سوتا رہا میں بھی

ہے جس راہِ یقیں پر گامزن پائے خرد ہردم
اسی راہِ گماں پر مدتوں چلتا رہا میں بھی

بہ ظاہر دیکھتی آنکھیں بہ ظاہر جاگتی روحیں
بہ ظاہر ان سبھوں کے ساتھ ہی جیتا رہا میں بھی

میں ہوں اُس کارِ سازِ بے کساں کی دسترس میں یوں
وہ جس سانچے میں بھی ڈھالا کیا ڈھلتا رہا میں بھی

بدن ملبوس میں شعلہ سا ایک لرزاں قریبِ جاں
دلِ خاشاک بھی شعلہ ہوا جلتا رہا میں بھی

فہیم جاوید

O

اندر اندر، مت سوچا کر
بن جا پتھر، مت سوچا کر

زخم ملا ہے، زخم ملے گا
کس کا خنجر، مت سوچا کر

کانٹے ہیں یا انگارے ہیں
اب بستر پر، مت سوچا کر

کل کا چہرہ، آج الگ ہے
حیراں ہوکر، مت سوچا کر

گرنا بھی ہے، اٹھنا بھی ہے
ہر ٹھوکر پر، مت سوچا کر

سوچوں میں جینا ہے لیکن
حد سے باہر، مت سوچا کر

O

لال گلابی پیلی خاک
دنیا رنگ رنگیلی خاک

عین جوانی کے موسم میں
لگتی ہے چمکیلی خاک

اپنی مٹی میں اب گھولو
شبنم ایسی گیلی خاک

نیلی نیلی آنکھوں میں
ڈوب گئی شرمیلی خاک

اڑنے لگی ہے ذہنوں میں
کالی اور زہریلی خاک

میرے اندر اب جاوید
چبھتی ہے، نوکیلی خاک

شاہد اختر

O

پھر رہی تھی ہوا کے گھر میں خاک
بس گئی آ کے بام و در میں خاک

عیب ہی عیب ہے مرے اندر
پڑ گئی سب مرے ہنر میں خاک

کوئی منظر نہ آنکھ میں ٹھہرا
رنگ کیا آتا چشمِ تر میں خاک

اک ذرا سی صدائے گریہ سے
ہوگیا میں تو رات بھر میں خاک

کوئی جچتا نہیں ان آنکھوں میں
سب ہیں اس شوخ کی نظر میں خاک

اب لچکتی نہیں مری خاطر
بھر گئی اس کی بھی کمر میں خاک

در بدر پھر رہا ہوں میں اختر
جسے اڑتی ہے رہگذر میں خاک

محمد شاہد پٹھان

O

یہاں ملا ہی نہیں کوئی غم گسار مجھے
نہ آیا شہر کا ماحول سازگار مجھے

یہ آسمان تو پہلے ہی دشمنِ جاں تھا
زمیں بھی لگنے لگی اب ستم شعار مجھے

زمانہ مجھ کو مٹا دینا چاہتا ہے مگر
بچائے رکھتا ہے ہر بار کردگار مجھے

بجھے بجھے نظر آتے ہیں ماہ وانجم بھی
شبِ فراق بھی لگتی ہے سوگوار مجھے

رقیبِ جاں سے گلہ کیا کہ وہ تو دشمن تھا
میرے رفیق بھی کرتے ہیں سنگ سار مجھے

عزیز رکھتا ہوں موجِ بلا کو میں شاہد
یہ حادثات سے رکھتی ہے ہم کنار مجھے

خورشید طلبؔ

○

شدید جس میں راحت ہوا سے ہوتی ہے
بحال اپنی طبیعت ہوا سے ہوتی ہے

کوئی چراغ جلاتا نہیں سلیقے سے
مگر کبھی کو شکایت ہوا سے ہوتی ہے

لچک کے ٹوٹ نہ جائے کہیں یہ شاخِ بدن
چلے جو تیز تو وحشت ہوا سے ہوتی ہے

کہیں دھویں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا
کبھی کچھ ایسی شرارت ہوا سے ہوتی ہے

ہمارا دھیان بٹاتی ہیں دستکیں اس کی
خلل ہماری عبادت ہوا سے ہوتی ہے

ازل سے اس کی طبیعت میں سرکشی ہے طلبؔ
کہاں کسی کی اطاعت ہوا سے ہوتی ہے

حارث خلیق

○

تم ہو اہلِ حَکم
ہم ہیں اہلِ قلم

پھر وہی جنگ ہے
پھر وہی ہاؤ ہو

پھر وہی درد ہے
پھر وہی جستجو

پھر وہی مسئلہ
پھر وہی گفتگو

پھر وہی لاٹھیاں
پھر سے ہم دوبدو

تم ہو نقشِ کہن
ہم ہیں رنگِ چمن

تم بجھاؤ دیے
ہم جلائیں لہو

تم نے پیاسا کیا
ہم بنے آب جو

تم ہو ننگِ وطن
ہم سے ہے آبرو

ہوگے تم دربدر
ہوں گے ہم سرخرو

۳۔ ارشد کمال

O

کہا یہ کس نے کہیں سائباں نہیں ملتا!
جہاں پڑاؤ میں ڈالوں وہاں نہیں ملتا

کچھ اس طرح سے ہیں برپا بشر کے ہنگامے
کہ اب تو شہر میں شورِ سگاں نہیں ملتا

ہمارے بیچ جو دریا تھا اک تعلق کا
ہنوز ہے تو سہی، پر رواں نہیں ملتا

ہزار صلح کا پرچم بلند کرتے رہو
کسی زمیں سے کوئی آسماں نہیں ملتا

مزاج دہر کا پہچانیے میاں ارشدؔ
یہ وہ ندی ہے جہاں بادباں نہیں ملتا

O

امیرِ شہر ہے کیوں ہم سے برہم
بھٹکتے ہیں اگر آشفتہ سر ہم

سفر کی بات کب تک ہم نشینو!
چلو اب باندھ لیں رختِ سفر ہم

گھسے ہم وقت کی بسل پر کچھ ایسے
سراسر ہوگئے تیر و تبرّ ہم

اُسی دھن پر تھرکتا ہے زمانہ
کہ رقصاں جس پہ ہوں دینار و درہم

بہت کوتاہ بیں دنیا ہے ارشدؔ
ذرا دے دیں اسے اپنی نظر ہم

اوم پربھاکر

O

شام کے ساحل سے اٹھ کر چل دیئے
دن سمیٹا، رات کے گھر چل دیئے

ہر طرف سے لوٹ کر آخر سبھی
تیرے مقتل کی طرف سر چل دیئے

اک اذان چاروں طرف ایسی اٹھتی
جھوم کر مینار ومنبر چل دیئے

ہے افق کے پار سب کا آشیاں
اتنا سن کر سارے بے گھر چل دیئے

چھوگئے گر تیرے دامن کو کبھی
خار بھی ہو کر معطّر چل دیئے

رباعیات

نور محمد یاسؔ

جلتی ہے زمیں دھوپ میں سائے بھی کہاں
دم لے تو مسافر کوئی دم لے بھی کہاں
بے برگ درختوں نے کہا یہ سن کر
ہم بھی تو ہیں! چھت سر پہ ہمارے بھی کہاں

نقش اپنے کیے جائیں مہ وِمہر نو کیا
تحسین سے دیکھے نگہ دہر تو کیا
ہم آج یہاں کشتۂ ناقدری ہیں
کل ناز کرے ہم پہ یہی شہر تو کیا

اب بحر سے بر تک ہی نہیں ہے تگ وتاز
جاری ہے ستاروں سے بھی آگے پرواز
جب آئیں وہ دن یاد، ہنسی آتی ہے
ہم چاند کو دیتے تھے زمیں سے آواز

آوازے کسیں، خندہ گزاری بھی کریں
ناوک فگنی، نیش نگاری بھی کریں
گل آئیں حریفوں کی طرف سے، مجھ پر
پتھر ہوں تو کچھ آئینہ داری بھی کریں

وہ چیز

عبدالصمد

• وہ چیز کب سے میرے ساتھ تھی، یہ مجھے بالکل یاد نہیں تھا۔ یقیناً اس کی پیدائش کے ساتھ اس کا میرا ساتھ ہو گیا تھا، پھر اس سے بھی پہلے۔ بہر کیف اب وہ یوں میری زندگی کے ساتھ تھی کہ اسے کسی قیمت پر مجھ سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا، شاید شروع شروع میں اس کی کوشش بھی کی گئی ہو اور ناکامی کے بعد تسلیم کر لیا گیا ہو کہ اس کا میرا ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس طرح مجھے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا، یا اسے میرے حال پر، بات ایک ہی تھی۔

میری پریشانی یہ نہیں تھی کہ اس کا میرے ساتھ کوئی ابدی رشتہ کیوں تھا بلکہ یہ کہ اس چیز کو میری پہچان تسلیم کر لیا گیا تھا اور میری اپنی پہچان بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ لوگ مجھے بھول گئے تھے یا بھولتے جا رہے تھے۔ انہیں یاد تھا تو صرف وہ۔ شاید اسی کی وجہ سے مجھے کچھ پہچانتے تھے۔ اس کے وسیلے سے میری پہچان میری کوفت کا اصل باعث تھی۔

مجھ پر جب بھی کسی کی نگاہ پڑتی تو اس پر نگاہ پڑنے کے بعد ہی۔ یعنی وہ اسے پہلے پہچانتے اور مجھے بعد میں۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں ہوتا کہ وہ صرف اسے ہی دیکھ کر مطمئن ہو جاتے۔ پھر مجھ پر نظر ڈالنے کی انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

میری وہ ساری کوششیں ابھی تک بیکار گئی تھیں جو میں نے اسے در کنار کر کے اپنی پہچان بنانے کے لیے کی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوا کہ جو لوگ مجھے بالکل نہیں پہچانتے تھے وہ کبھی کبھار ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالنے لگے۔

میں نے کئی بار سوچا، کیا میرے پاس اپنی پہچان کو قائم کرنے کا کوئی راستہ نہیں بچا— ؟ یہ راستہ بھی گویا بند ہی تھا۔ ادھر میری پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ لوگوں کا اسے یاد رکھنا اور مجھے بھولتے جانا...... کوئی دن گزرتا کہ لوگ مجھے بھول ہی جاتے، صرف اسے یاد رکھتے۔ ایسی صورت میں اشد ضروری تھا کہ میں یوں ہی بیٹھا صرف سوچتا نہ رہ جاؤں اور کچھ کروں۔ کچھ...... لیکن کیا— ؟

یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ سارے راستے تو بند نظر آتے تھے دو راستوں کے سوا، ایک راستے سے میں جاتا گیا تھا دوسرے راستے سے وہ یعنی بات، گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ ایک طرح سے میرے اندر، میرا رقیب بن گیا تھا۔ میری بدنصیبی کی انتہا تھی کہ اس کا وجود میرے اندر

یوں وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا کہ لوگ اس سے مخاطب ہوتے۔ مخاطب تو وہ مجھ سے ہی ہوتے تھے لیکن ان کی نگاہوں کا مرکز وہی ہوتا تھا۔ بھلے وہ اس سے بات نہ کریں لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ دراصل وہ اسی سے بات کررہے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنا وجود اور بیکار دکھائی دینے لگتا۔ مجھے صاف محسوس ہوتا کہ میں اس کے وجود کو اپنے اندر ڈھونڈھ رہا ہوں۔ میں اس کا لباس ہوں۔ میں ایک تابع مہمل کی طرح اس کے سامنے سرنگوں ہوں۔ اگر بھولے بھٹکے کوئی مجھ سے مخاطب ہوتا تو وہ دراصل اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں کسی بات کا جواب ہی نہیں دوں۔ ایک دوبار میں نے ایسا کیا بھی، لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ اس طرح یا تو لوگ مجھے پاگل سمجھیں گے یا پھر مجھ سے مخاطب ہونا بالکل ہی چھوڑدیں گے۔ اس طرح میری وہ پہچان بھی ختم ہوجائے گی جو کم از کم اس کے وسیلے سے قائم تو ہے۔

اس چیز نے مجھے بالکل توڑ مروڑ کے رکھ دیا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یا تو میں کوئی چیز ہوں ہی نہیں یا پھر کوئی ایسی چیز ہوں جو پردے کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ ایسے دبیز پردے کے پیچھے جس کے اندر کسی کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ جو نگاہ اٹھتی ہے وہ پردے ہی تک جاتی ہے اور اس میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ یہ احساس مجھے کھائے جارہا تھا۔

میں جب بھی اپنے بستر پر جاتا تو دیر تک اس سوچ میں غلطاں رہتا کہ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

عجیب بات یہ تھی کہ یہ مسئلہ صرف میرے ساتھ تھا اور کسی کے ساتھ نہیں، یا اگر کسی کے ساتھ تھا تو میری نگاہیں ابھی تک وہاں پہنچنے سے قاصر رہی تھیں۔ یا پھر یوں کہ دوسروں نے اپنے مسئلے کو اس طرح حل کرلیا تھا کہ سب کی نگاہوں میں سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ اجتماعی مسئلہ ہوتا تو شاید دوسروں سے مدد لی جاسکتی تھی۔ میں کسی سے مشورہ بھی نہیں مانگ سکتا تھا، کیا کہتا کہ یہ چیز مجھے پریشان کررہی ہے۔ وہ پوچھتے کہ کیا پریشانی ہے تو کیا جواب تھا میرے پاس۔ اصل پریشانی تو یہی تھی کہ یہ چیز نہ تو پریشان نظر آتی تھی نہ بظاہر پریشان کرتی تھی۔ یہ تو صرف محسوس کرنے کی چیز تھی اور یہ چیز دوسروں کے اندر کیسے ڈالی جاسکتی تھی۔ میں جدید سماج کا سچ مچ تنہا آدمی بن گیا تھا اور یہ بات سچ تھی کہ محض میری سوچ اور میرے احساسات نے مجھے اس حالت کو پہنچادیا تھا ورنہ اس چیز کے رہتے ہوئے بھی میں دوسروں کی طرح ہنستا کھیلتا رہتا، مجھے بھی دوسروں کی طرح کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

یہ چیز کاٹ کر پھینک دینے کی ہوتی تو میں کب کا اس کام کو انجام دے چکا ہوتا۔ چھپا دینے کی ہوتی تو اسے ایسی جگہ چھپاتا جہاں آسمان کی پرچھائیں بھی اس پر نہ پڑتی۔ لیکن یہ چیز تو میرے ساتھ یوں چپکی تھی کہ کیا جینا اور کیا مرنا، میں تھا اور یہ...... میں نہ ہوتا تو شاید یہ چیز بھی نہ ہوتی، یا کم سے کم میں اس پریشانی کو تو نہ جھیل رہا ہوتا۔

سب طرح سے ہار کر، مایوس ہوکر، مجبور ہوکر میں نے فیصلہ کیا کہ اب چونکہ اس چیز کو میرے ساتھ ہی رہنا ہے، اسلئے کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے کہ یہ چیز میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ نظر نہ

آئے۔ ساتھ چپکے رہنے کا جو دکھ ہے، وہ تو میں کسی طرح برداشت کرلوں گا، لیکن دوسروں کی نگاہوں میں میرے لئے جو بے شمار، پراسرار، معنی خیز اور مشتبہ اور کبھی کبھی بالکل بے معنی سوالات جنم لیتے رہتے ہیں، ان کی دکھائی نہ دینے والی نوک کی چبھن سے جو میں ہردم زخمی رہتا ہوں، کم سے کم اس سے تو محفوظ رہوں گا۔

میں نے اپنا انداز یوں کرلیا کہ وہ چیز میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ دکھائی نہ دے۔ چال ڈھال، لباس وغیرہ ایسا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکے کہ میرے ساتھ وہ بھی ہے۔ ایسا کر کے مجھے ایک گونہ چین نصیب ہوا اور مسلسل تناؤ کی جو ایک کیفیت تھی، اس میں کمی آ گئی۔ اب جو نگاہیں اٹھتی تھیں، وہ سیدھی مجھ پر پڑتی تھیں۔ ان نگاہوں میں اب میری ایک پہچان بنتی جارہی تھی۔ لوگ مجھ ہی سے مخاطب ہوتے تھے، میرے بہانے کسی اور چیز سے نہیں۔ ابھی اس اعتماد نے اپنی جڑیں مضبوط بھی نہیں کی تھیں اور چبھن کا احساس بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ لوگوں کی نگاہیں اندر اندر کچھ اور ڈھونڈتی ہیں، صرف مجھے دیکھ کر ان کی مکمل تشفی نہیں ہوتی۔ میں نے اس احساس کو اپنے آپ سے دور کرنے کی کوشش ضرور کی، لیکن جتنی مضبوطی سے میں نے کوشش کی، اتنی ہی شدت سے یہ احساس جڑ پکڑتا گیا۔ بلاشبہ اس چیز کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی میں نے کامیاب کوشش کی تھی، لیکن یہ احساس تو اتنا تناور ثابت ہوا کہ اس نے میری ہر کوشش کو ناکام بنادیا۔

لوگوں کی نگاہیں مجھ پر اٹھتی تھیں اور میں ان نگاہوں میں اس تجسس کو ڈھونڈتا تھا جو اس چیز کی تلاش میں پوشیدہ ہوتی تھی۔ پہلے پہل تو مجھے صرف ان نگاہوں میں تجسس کا شبہ ہوتا تھا جو کچھ دیر کے لئے مجھ پر جم جاتی تھیں اب مجھے ہر نگاہ تجسس سے بھری نظر آتی تھی۔ یہ جستجو اور تلاش مجھے کانٹوں بھرے لباس پہنا دیتے تھے اور فرار کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس نے میری تمام فکر اور کاوشوں پر پانی پھیر دیا تھا اور میں پہلے سے زیادہ پریشانیوں میں گھر گیا تھا۔

لوگوں کی نگاہوں میں تلاش کی جو جستجو ہوتی ہے، میں اس کی تلملاہٹ صرف محسوس کرسکتا تھا۔ زبان نہ ادھر استعمال ہوتی تھی نہ ادھر۔ الفاظ تو دونوں طرف پہلے ہی سے گونگے ہو چکے تھے۔ لیکن یہ خاموشی چنگھاڑتے ہوئے طوفانوں سے زیادہ خطرناک تھی۔ میرا جی چاہتا کہ ایک بار جی کڑا کے پوچھ ہی لوں کہ آخر وہ کسے ڈھونڈتے ہیں۔ پھر اس خیال سے دل کی بات کو دل کے اندر ہی مار ڈالتا کہ جواب میں انہوں نے اسی کا نام لے لیا تو ـــ؟

اس سے آگے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ آگے سوچنے کو میرے پاس کچھ تھا بھی نہیں جو کچھ بھی تھا، بس سامنے تھا۔ آخر وہ کیوں اسے ڈھونڈنا چاہتے ہیں ـــ؟

کس چیز کی تلاش ہے ان کو ـــ؟

وہ اسے بھلا کیوں نہیں دیتے ـــ؟

آخر میں اور صرف میں انہیں کیوں نظر نہیں آتا ـــ؟

آخر کیا کمی ہے مجھ میں، جو وہ اسے مجھ سے جوڑ کر مجھے مکمل سمجھتے ہیں ـــــ؟

کیا اس کے بغیر میرا کوئی وجود نہیں ـــــ؟

میرے ذہن میں ایک سوال جنم لیتا تو ابھی اس کا جواب تیار بھی نہیں ہوتا کہ اس کے بطن سے پھر دوسرا سوال جنم لے لیتا۔ دوسرے سے تیسرا، پھر...... یہ سلسلہ اتنا لامتناہی تھا کہ کہیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔

میرے جواب کا کشکول ہمیشہ خالی رہ جاتا۔ اسے بھرنے کی ساری کوشش ناکام ہو جاتی۔ اس کشکول کی پینندی میں ضرور کوئی ایسا دکھائی نہ دینے والا سوراخ بھی تھا کہ اس میں ڈالنے والی چیز کبھی ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ میں اسے ہزار بار بھرنے کی کوشش کرتا پھر بھی......

ممکن تھا کہ پینندی میں سوراخ والے کشکول میں، میں اپنے آپ کو گم ہی کر دیتا کہ وہ نگاہ...... جو مجھ پر ٹھہری تو ٹھہری ہی رہ گئی۔۔ اس نگاہ میں سوالوں کا اتنا بڑا آتش فشاں پوشیدہ تھا کہ اگر پھٹ جاتا تو یقیناً میرے پرخچے اڑ جاتے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پا کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پیدا کی اور پوچھا۔

''آپ شاید کچھ......؟''

''ہاں...... یہ...... یہ چیز......؟''

سوالوں کی پٹاری ذرا سا کھلی۔

میں بڑے زور سے ہنس پڑا۔

''یہ تو...... میری اپنی ہے...... بالکل میری خاص چیز......''

آتش فشاں اچانک بجھ گیا

میں نے اپنے آپ کو اتنا ہلکا پھلکا اور اعتماد سے بھرپور پایا کہ پہلے کبھی نہیں پایا تھا●●●

عزاداریاں

حسین الحق

● نہایت ہی گندہ، بدبو کے بھبکے اڑاتا، سڑا رند میں اٹا، اُس سے بھرا ایک دن میرے چاروں طرف بے حیائی سے پسرا ہوا ہے۔ میں پیٹھ پر شدید قسم کی کھجلی محسوس کر رہا ہوں، اور ایک خارش زدہ کتا یاد آ رہا ہے جس کا زخم اس کے سر پر تھا۔ یاد آتا ہے، اپنے گھر کے اطراف دیکھا تھا۔ تقریباً سارے جسم کی کھال ادھڑی ہوئی۔ جگہ جگہ سے پیپ مگر ایک دن کتے کو ننگی کا ناچ ناچتے دیکھا۔

اس دن صابر علی نام کا ایک آدمی بھی اسی کتے کی دھن پر تال بے تال ناچ رہا تھا۔

اصل میں ہوا کچھ یوں کہ صابر علی کی ایک بہن تھی۔ بہت پیاری سی، سارے گھر کی آنکھ کا تارا، اسمارٹ پڑھی لکھی، ابھرتی ہوئی جرنلسٹ، اس کی شادی جس آدمی سے ہوئی وہ بھی، خاصا خوب رو مرد تھا، دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر واری فدا میاں بزنس مینجمنٹ کا آدمی تھا اس لئے کمپنیوں کی طرف سے بہتر سے بہتر پیش کش اس کا نشانہ تھی۔ اور چوں کہ با صلاحیت تھا اس لئے ایک کمپنی کے بعد دوسری اور دوسری سے پہلے تیسری اس کے لئے اپنا دروازہ نہیں، دل کھلا رکھتی تھی۔ دونوں میاں بیوی نوکری کے واسطے سے کلکتہ، ممبئی، دہلی غرض ہمیشہ کسی نہ کسی کوسمو میں ڈیرا ڈالے رہتے۔ اور بیوی کا کیا، وہ تو فری لانس جرنلسٹ تھی، جہاں جاتی وہاں سے اس کا رائٹ اپ راخبارات ورسائل تک پہنچ جاتا۔

ایسی مطمئن اور پر بہار زندگی پر خزاں چھا گئی۔

بچی کی بیماری کی خبر ملی۔ معلوم ہوا یرقان ہو گیا ہے، ہسپتال میں داخل کی گئی ہے۔ صابر علی بھاگم بھاگ ماں باپ کو لے کر ممبئی پہنچے۔ مگر پہنچتے پہنچتے وہ پیاری سی بچی جو ابھی ایک ماہ پہلے ماں بنی تھی، مر گئی۔ صابر علی ہک بک اسباب وعلل پر سوچتے رہے اور جو ہونا تھا ہو گیا!

اس کے سوئم کے دن اس کتے پر نگاہ پڑی تھی۔ وہ اپنے چاروں طرف ناچ رہا تھا اور چھٹپٹا رہا تھا۔

اصل میں زخم بڑھتے بڑھتے جب سر تک پہنچ جاتا ہے، پھر تو ننگی کا ناچ ناچنا ہی پڑتا ہے۔

صابر علی کسی کے بھی سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا حالاں کہ لوگوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ چھ ماہ پہلے جب یہ نوزائیدہ بچی پیٹ میں تھی تبھی اس کو یرقان ہوا تھا اور یرقان کے اس حملے کے بعد جو احتیاط برتنی چاہیے وہ برتی نہیں گئی۔ بیمار پڑنے سے پہلے کئی محفلوں میں وہ خاصی ایکٹیو رہی اور کھانے میں احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لیے یہ حادثہ ہو گیا۔ پھر بھی صابر علی کو کسی صورت چین نہیں آ پا رہا تھا۔

اس کے باوجود فرض کرلیا جائے کہ صابر علی کو صبر آ گیا۔

مگر اس کتے کا کیا ہوا؟ مر گیا، یا سرکاری عملے نے گولی ماردی، اسے پکڑ کر لئے گیے۔ پتہ نہیں۔ بس کتے کا پھرکی طرح ناچنا یاد ہے۔ سنا ہے کہ جب سر کا زخم بجھاتا ہے، اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں، اور کیڑے کتے کی کھوپڑی کھانے لگتے ہیں تو کتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

خود میری پیٹھ پر، بالکل بیچوں بیچ شدید قسم کی کھجلی محسوس ہو رہی ہے۔

مگر سر ور پیٹھ کا رونا کیا رویا جائے، یہاں تو شاید اس سے بھی آگے کوئی کھڑاگ ہے۔

زندگی......زندہ رہنا......زندہ ہونا......خود یہ "ہونا" کیا کم بڑا کھڑاگ ہے۔

کتے کے سر کا زخم بھی تو ہونے ہی کا کھڑاگ ہے......یا بھگتان ہے؟

میں پناہ مانگتا ہوں کہ کُکُر متے کی اس بیل سے جو جگہ بے جگہ اپنے پنجے گاڑتی ہے اور رخ کرتا ہوں صابر علی کی طرف جس کے بارے میں عرض کیا گیا کہ اس کو صبر آ گیا۔ مگر یہ تو گویا پہلے ہی سے طے تھا کہ صابر علی صبر کرلے گا۔ اصل معاملہ کیا ہے؟

وہ ذرا......اس صبر آزما مرحلے میں......مشکل یہ آن پڑی ہے کہ وقت کے جس فریم ورک میں یا کال کھنڈ میں یا جس زمانِ رواں میں صابر علی نام کا کردار پایا جاتا ہے، اسی زمان میں ناظر علی قسم کا بھی کوئی نہ کوئی کردار کہیں نہ کہیں موجود رہتا ہے۔

صابر علی کی آسانی یہ ہے کہ وہ صبر کرلیتا ہے یا اس کے بارے میں فرض کرلیا جاتا ہے کہ اسے صبر آ گیا مگر ناظر جھگڑ پڑتا ہے، کہتا ہے۔ الو نہ بناؤ، صابر علی کی بہن کے حوالے سے تم ایک مخصوص قسم کا نان سنس پیدا کرنا چاہتے ہو۔ آدمی کے حواس اب اتنے بھی باختہ نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ صابر علی کی بہن کے واقعے کو سامنے رکھ کر کوئی کلیہ بنالے گا۔ کُکُر متے کی بیل جب موجود ہی ہے تو لالے کی حنا بندی کا ڈرامہ کیا ہے؟

میرا جی چاہا کہ جب اسے اقبال یاد آ ہی گئے ہیں تو اسے چپ کیوں نہ کرا دیا جائے......"زمانہ ایک حیات ایک......"۔

مگر نفس پر مجھے اپنے ایک ہمدرد دانش ور کی یاد آ جاتی ہے جو بعد میں وزیر بھی بنے اور شہید بھی ہوئے۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی بھی واقعہ بیان کیا جائے اس کا کوئی کال کھنڈ، کوئی عہد تو بہر حال ہوگا۔

میری مشکل یہ ہے کہ کال کھنڈ کے پوائنٹ پر میری ہوا نکل جاتی ہے......تو اکھالی اور العریش سے اجودھیا اور گجرات تک......اس کال کھنڈ کی دلدل میں اب صابر علی کو بھی دھنسا دیا جائے......جی نہیں مانتا۔

مسئلہ تو اپنے جسم کے کوڑھ کا ہے۔ کوڑھی کا ساجھے دار کون ہے؟

پیٹھ کے بیچوں بیچ پھنکار مارنے والی کھجلی!

صابر علی کی طرح ناظر علی میں صبر کی طاقت نہیں ہے ...... شاید...... ناظر علی کی بیٹی بھی کچھ کم دلاری پیاری نہیں تھی، پہلوٹھی کی اولاد سارے گھر خاندان کی آرزؤں منتوں کا ثمر، پیدا ہوئی تو چراغاں ہوا، ذرا بڑی ہوئی تو گھر گویا گلستاں بن گیا، جیسے بہار کا وجود اسی کے دم سے قائم ہو۔ اسکول جانے لگی تو اس کے اندر جو ہر بھی کھلنے لگے۔ اسکول کالج کی تعلیم انتہائی امتیازی نمبروں کے ساتھ مکمل کی اور پھر کمپیوٹر کی دنیا میں کود پڑی تو ایسا لگا جیسے اس کا دماغ خود ایک کمپیوٹر ہو۔ اتفاق سے شوہر بھی ذہین اور ہم ذوق ملا، خود انجینئر تھا اور دنیا کے بدلاؤ سے پوری طرح باخبر بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پورا پورا تعاون دیا۔ ارد گرد کی دنیا ہی نہیں، خاندان اور محلے میں بھی دونوں کی محبت مثالی کہی گئی۔ پھر اس محبت کا ثمر بھی سامنے آیا۔ ایک گڑیا، پری جیسی چھب والی، ننھی منی بیٹی دونوں کی زندگی میں داخل ہوئی اور گویا ان کی کائنات مکمل ہو گئی۔

مگر یہاں بھی وہی ناہنجار کتے کے سر کا زخم...... چھپاتے رہو!

ایک شام میاں بیوی اسکوٹر سے کہیں جا رہے تھے۔ آگے باپ بیچ میں بیٹی بیٹھی پیچھے ماں، اچانک ایک موڑ پر پیچھے سے ایک ٹرک آیا۔ اسکوٹر کو ایسا دھکا دیا کہ اسکوٹر الٹ گیا۔ اصل چوٹ ماں کو پہنچی، وہ گری اور دم توڑ دیا۔

پھر وہی ہاہا کار مچی، ناظر علی اور اس کی بیوی یعنی مرنے والی کے ماں باپ کی تو دنیا تاریک ہو گئی۔ اب کے بھی لوگ جمع ہوئے اور سبھی نے متفقہ طور پر یہی کہا کہ حادثات تو بہانہ ہیں۔ موت کا ایک دن معین ہے!

میں ایک معمولی بیان کنندہ میں کیا کر سکتا ہوں، میں تو اپنی پیٹھ بھی نہیں کھجا سکتا، میں کسی اور کا درد کیا بیان کروں خود میرے اٹ پٹے پن کا کون ساجھے دار ہے؟ ایک ٹنڈ منڈ خزاں آشنا موسم میرے چاروں اطراف کبھی سر پٹختا ہے کبھی دانت نکوستا ہے کبھی تانڈو ناچتا ہے اور کبھی میرے سینے میں چھپ چھپ کر روتا ہے۔ اور خود میں عزیزی یاصر علی سے آنکھیں نہیں ملا پاتا کہ یہ عزیز تو ناظر علی کی طرح جھگڑا نہیں کرتا۔ مگر مجھے پتہ ہے اس کے اندر اس بوڑھے کا جو اس کا آپا سراپا تہس نہس کرتا رہتا ہے۔

مجھے پھر میرے وہ ہمدرد دانش در یاد آئے جنھوں نے سمجھایا تھا کہ لکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ خراب سے خراب صورت حال کو ایک کال کھنڈ سے جوڑ دے اور چپ بیٹھے کہ وہ لمحہ تو بہر حال گذر چکا۔ فرض کیا جا چکا کہ صابر علی نے بھی کیا مگر ناظر علی تو جھگڑا کرنے پر تل جاتا ہے...... پیٹھ کی کھجلی

کا کیا علاج ہے؟

باصر علی سوچتا ہے کہ گزرے ہوئے کسی لمحے کو کس موجود لمحے سے کاٹ کر الگ کرے۔

میں سنتا ہوں: طوفان کی آمد کی ہسہاس، پر شور بھیانک اور اہنت لہروں کا ہاہا کار...... پھر اندر اندر پنجے گاڑنے لگتی ہے: دل دہلا دینے والی ہیبت، کپکپی طاری کر دینے والا جلال...... پور پور میں چبھنے اور سرسرانے لگتی ہے: اپنے آپ سراپے کو متواتی، ایک بے چہرہ دہشت...... آنکھوں کے آگے چھا جاتی ہے: چکا چوندھ کرتی روشنی، گہری وشال تاریکی...... کُکُرمتے کی بیل!

پہلے قلم، پھر بانس کا ٹوٹو، چھوٹی لکڑی، سب استعمال کیا، پھر پاگلوں کی طرح کواڑ کی چوکھٹ سے پیٹھ رگڑنے لگا۔ اپنی پیٹھ کا زخم...... باصر علی کی کائنات!

ایک بیوی، دو بچے۔ ایک اوسط درجے کی پرسکون زندگی گزارتا ہوا ایک خاندان۔ اچانک بیوی کے پیٹ میں درد اٹھا اور ناقابل برداشت ہو گیا۔ شوہر بیٹے اسے لے جا کر بھاگم بھاگ ڈاکٹر کے یہاں پہنچے اور دو دن کی جانچ پڑتال کے بعد پتہ چلا کہ اس عورت کو آنت کا کینسر ہے۔

باصر علی کی عورت تین ماہ کے اندر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

میں نے تو پہلے ہی عرض کیا کہ باصر علی سوچتا ہے، ایسا فرض کر لیا جائے!

تو پھر......؟

تو پھر یہ کہ ایک بہت ہی کم اوقات رقیمہ نویس، صابر علی، ناظر علی اور باصر علی کے احوال و آثار کا ایک انتہائی ادنیٰ بیان کنندہ اس موڑ تک پہنچ کر، دانش وروں کے مشورے کے مطابق، خود کو عہد و زمان کے حوالے سے جوڑنا چاہتا ہے تو ایک کتا اپنے سر کے زخم سے حیران پریشان اپنے ہی اردگرد اچھل اچھل کر پھرکی اور جوکر کی طرح ناچتا ہے اور تھک کر رونے لگتا ہے، ایک کُکُرمتے کی بیل جگہ بے جگہ اپنے پنجے گاڑنے لگتی ہے، اور ایک آدمی پیٹھ پر، بالکل بیچوں بیچ بھیانک قسم کی خارش محسوس کرتا ہے۔

پڑھنے والے عابد علی کے نام اس بد بخت ماتم گزار کو معاف کریں، یہ کتا کوڑھی، خارش زدہ، آدمی نما موجود، اس سارے ابسٹرڈ ڈرامے میں کوئی معنویت پیدا نہیں کر پا رہا ہے۔ پھر بھی یہ بتانا ضرور ہے کہ یہ بخت مارا عابد علی مذکورہ تینوں بھائیوں صابر علی، ناظر علی اور باصر علی کا باپ ہے۔ اور یہ باپ نوے کے پیٹے میں پہنچ چکا ہے مگر مرنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔

●●●

بولتا بدن

جیتندر بلو

● ایک دوست انڈیا جا رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ دسویں روز وہاں اس کی شادی قرار پائی تھی۔ ہتھیرو ہوائی اڈے پر پہونچ چکے تھے۔ ٹرمنل پر ہر قوم رنگ نسل اور شہریت کے لوگ ہر سو دکھائی دے رہے تھے بہت بڑا ہال تھا روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ہر طرف مختلف ایر انڈیا کے کاونٹر تھے جہاں مسافر اپنا اپنا سامان ٹرالی میں ڈالے قطار لگائے کھڑے تھے میرا دوست اپنا سامان چیک ان کروا کر فارغ ہوا تو ہم بغل گیر ہوئے اپنائیت سے مسکرائے دل قدرے بھاری ہوئے آنکھیں نم سی ہوئیں پھر میں اسے گڈ لک اور رب راکھا کہکر لفٹ کی طرف بڑھ گیا جس کے ذریعے مجھے کار پارکنگ تک پہونچنا تھا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا تو پیگی دیگر مسافروں کے ساتھ نکلتی ہوئی دکھائی دی اس کے ہمراہ مناسب قد مگر تیکھے مین نقش اور سنہری بالوں والا کوئی رومن شہزادہ بھی تھا اسے سامان سے بھری ٹرالی تھام رکھی تھی میں پیگی کو وہاں دیکھ کر سخت حیران ہوا دل نے چاہا کہ تیزی سے لفٹ میں داخل ہو کر یہ تاثر دوں کہ میں نے اسے دیکھا ہی نہیں مگر یہ ممکن نہ رہا تھا کہ پیگی سے نظریں ٹکرا چکی تھیں چیروں کے تاثرات بھی بدل چکے تھے اس قبل کہ وہ کچھ کہتی میں نے ہی پوچھ بیٹھا کہاں جا رہی ہو؟''

''مالٹا''

''سنا ہے بڑی رومینٹک جگہ ہے؟''

''یہ تو دیکھنے پر ہی پتہ چلے گا'' پھر اس نے اپنے ساتھی کو گہری نظروں سے دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئی: یہ ٹام ہے۔۔۔میری زندگی۔۔۔میری دنیا۔۔۔میرا سب کچھ۔''

ٹام نے جھک کر اپنے ہونٹ اس کے جنس زدہ ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

اور یہ ہے میرا انڈین فرینڈ پرکاش ۔۔۔جو ہمیشہ میرے کام آیا ہے ۔۔۔ اس سے مل کر ایمگرانٹس (immigrants) کے بارے میں میری رائے بدل گئی ہے اب تو چاہوں گی کوئی انہیں یہاں سے نہ نکالے۔''

ہم دونوں ہنس دیئے لیکن ٹام کے ہونٹ ساکت رہے بلکہ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کر جاننا چاہا کہ پیگی کے ساتھ میرے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟ محض دوستی کی حد تک یا اس سے کہیں آگے؟ لیکن میں نے فوراً ہی ایک مشاق اداکار کی طرح اصلی چہرے پر نقلی چہرہ چڑھا لیا تھا اور لاتعلقی سے پیگی کو دیکھتا رہا ٹام کا متوجہ دوت ہوا تو وہ جیب سے سفری ٹکٹ نکال کر اور 'ایکسکیوزمی' کہہ کر کاونٹر کی طرف بڑھ گیا

پیگی نے اشتیاق تجسس اور فخر سے مجھ کو دیکھا۔
ٹام کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ تمہاری پسند کی داد دیتا ہوں وہ مجھ سے زیادہ جوان خوبصورت اور پرکشش ہے لیکن۔۔۔۔؟ اچانک میری آواز میں سنجیدہ پن ابھر آیا اور بلا سوچے سمجھے میرے منہ سے بے ساختہ نکلا: ''سنو پیگی اگر اس بار بھی ڈور کسی کارن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو فکر مت کرنا میں ابھی زندہ ہوں۔'' وہ مکمل حیرت زدہ، نا قابلِ اعتبار نظروں سے مجھ کو دیکھنے لگی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میرا کہا سچائی کا کوئی پہلو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا۔ مگر اس نے مجھے سنجیدہ پایا تو اس کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں چونکا، قدرے گھبرایا۔ پرخوف میرے اندر سر اٹھانے لگا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور اسے گڈ لک کہہ کر لیفٹ میں داخل ہو گیا۔ مگر اس سے الگ ہوتے ہی یہ احساس میری تکا بوٹی کرنے لگا کہ میں نے اسے اپنی زندگی میں پھر سے شامل ہونے کی دعوت کیوں دے ڈالی ہے؟ بار بار دلدل سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہوا کرتا؟ ہمارے تعلقات تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔ میں نے اسے ایک لمبے عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ اس دوران میری ذہنی پریشانی تو کب کی ختم ہو چکی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اور اپنی شامیں کس کے ساتھ بسر کر رہی ہے؟ لیکن کسی اجنبی کی صحبت میں اسے دیکھ کر جانے میری عقل کہاں چرنے چلی گئی تھی؟ میں نے جانے کیوں اپنے جیون کے بند کواڑ پھر سے کھول ڈالے تھے؟ میں غصے میں بھنایا ہوا سوچ رہا تھا کہ لب سڑک ہرا کری (جاپانی خودکشی) کرلوں یا اپنی بھاگتی دوڑتی کار کو کسی دوسری کار سے ٹکرا کر خود کو ختم کرلوں۔ لیکن میں ایسا کچھ بھی نہ کر پایا۔ بلکہ موٹر وے پر اپنی کار کی رفتار کو کم کر کے بائیں ہاتھ کی سلو لین میں چلا آیا۔ میرا مخدوش ذہن اپنے آپ پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ کسی غیبی طاقت نے میری کار کی رفتار مزید کم کر ڈالی تھی۔ وہ شام رہ رہ کر میرے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگی۔ جب میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ جو میری ہی طرح انڈیا سے بہتر زندگی کی تلاش میں لندن آن بسے تھے اور میری ہی طرح جوان اور مجرد بھی تھے، بانڈ اسٹریٹ کی ایک نائٹ کلب میں موجود، اس کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کلب کا ہر گوشہ جوان لڑکے، لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈانسنگ فلور پر جواں جسم موسیقی کی تر لے پر ناچ رہے تھے۔ روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ چند جوڑے کھمبوں کا سہارا لئے محوِ بوس و کنار تھے اور چند شب باشی کی خاطر پر تول رہے تھے۔ اس ماحول میں پہنچ کر مجھے ایک ہی خیال آیا کرتا تھا کہ یہ تفریحی ادارے اخلاقیات کے دائرے سے بالکل آزاد ہیں۔ لیکن ساتھ میں اخلاقیات کے معنی اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ بار کاؤنٹر پر کئی لڑکے لڑکیاں کھڑے، ڈرنک خریدنے کی خاطر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں ایک پرکشش لڑکی سے میری نظریں ٹکرائیں تو وہ وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ وجدان سا ہوتا کہ ہو نہ ہو آج میں اس حسینہ کی خاطر یہاں وارد ہوا ہوں۔ ہم نے بیئر کے گلاس تھامے اور اپنے اپنے گروپ کی طرف چل دیئے۔ لیکن کچھ دیر بعد اس لڑکی کا نرم گرم ہاتھ میرے مضبوط ہاتھ میں تھا اور ہم ڈانسنگ فلور پر دیوانہ وار ناچتے ہوئے، ایک دوسرے کی خارجی شخصیت کا جائزہ بھی لئے جا رہے تھے۔ وہ سرو قد، ڈینم کے چست ملبوس تھی۔ بدن کا نچلا حصہ زیادہ ہی کسا ہوا تھا، جو میرے باطن میں ہلچل مچانے کو کافی تھا۔ اس کے

گول چہرے پر پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ہر بار میرے کسرتی بدن سے ہو کر میرے سینے کے بالوں پر آ کر ٹھہر جاتیں۔ وہ بلوری آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ پل پل ہماری پسند، ہمارے دل اور دماغ اپنی اپنی زبان بول رہے تھے۔ میرے یار دوست رشک سے مجھ کو دیکھ رہے تھے کہ میں نے آتے ہی رات کا پنچھی پھانس لیا ہے۔ جب کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ماہر تھے۔

دیر تک میں اور پیگی پینے پلانے کے ساتھ ساتھ موقع بہ موقع ناچتے بھی رہے۔ ہماری آنکھوں میں آزاد دنیا کے نئے نئے خواب جاگ رہے تھے اور ہم اُن کو عملی شکل دینے کی سوچ رہے تھے۔

پھر "وقت" نے اپنے پر پھیلا دیئے تو کلب میں موجود ہر شخص کو اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جلد ہی پیگی ٹیکسی میں میرے برابر بیٹھی میری رہائش گاہ کی طرف ہم سفر تھی۔

میں نے دھیرے سے مکان کا عقبی دروازہ کھولا اور چپکے سے پیگی کا ہاتھ تھامے، دبے پاؤں اپنی منزل پر پہنچ کر اپنے فلیٹ نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ تاکہ میرے ایشیائی مالک مکان اور اُس کے خاندان کے دیگر افراد کے اخلاقی اصولوں میں دراڑیں نہ پڑ جائیں؟

رات گئے ہمارے جوان بدن ایک دوسرے کو کھنگالتے رہے۔ ہر حصے کی واقفیت ہر حصے سے ہوتی چلی گئی۔ میرا گٹھا ہوا بدن جو اپنے دیس میں ہاکی کا معروف کھلاڑی ہونے کے کارن اور پردیس میں بھاری کام کرنے کے کارن جاذبِ نظر بن چکا تھا۔ پیگی کو کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ اکثر لڑکیاں مجھ سے کہا کرتیں کہ میں بدنی کھیل کے دوران بولوں یا نہ بولوں، لیکن میرے بدن کا انگ انگ اپنی زبان خود بولا کرتا ہے۔ یہی حال پیگی کا بھی تھا۔ اس کے نازک ہاتھ میرے بدن پر پھیل کر اسے لگاتار سراہتے رہتے۔ کبھی اُس کے جنس زدہ ہونٹ اسے چوم بھی لیتے اور کبھی اس کا کوئی حصہ دانتوں کی زد میں آ جاتا تو میں تڑپ اٹھتا۔ لیکن چیخنے چلانے کے بجائے وار و پی جاتا کہ کہیں میری آواز مالک مکان کے کمرے تک نہ جا پہنچے؟ مجھے پیگی کی حرکات سے بڑا آنند مل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی ڈھنگ سے میرے بدن کے پٹھوں اور بازوؤں کی مچھلیوں کو چومتی، چاٹتی اور کاٹتی رہے اور رات کبھی ختم نہ ہو؟

صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی تو کائنات روشن تھی۔ مگر پیگی چھپکلی کی طرح مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کا آسودہ اور پرسکون چہرہ رات کی داستان بیان کر رہا تھا کہ وہ اپنے نئے تجربے اور ایڈونچر سے صرف مطمئن ہی نہیں رہی، بلکہ اس کے بدن کا ہر انگ، ہر مسام مدتوں بعد سرشار ہوا ہے۔

موسم بدل گیا تھا۔ لیکن پیگی کے ساتھ یہ سلسلہ کم و بیش مستقل شکل اختیار کر بیٹھا تھا۔ وہ ئی شامیں میرے ساتھ گزارنے لگی۔ مالک مکان کے ساتھ میرا ایک معاہدہ ہو گیا تھا جو اپنی ہی نوعیت کا تھا۔ جس رات میری گرل فرینڈ میرے کمرے میں قیام کرے گی، مجھے الگ سے رقم ادا کرنی ہو گی۔ رقم طے ہوتے پر اس نے ایک دوسری شرط بھی عائد کی تھی کہ ہم ہمیشہ مکان کے پچھلے دروازے سے آیا جایا کریں گے۔ تاکہ اس کی اسکول جاتی بچیاں بُرا اثر قبول نہ کریں۔ میں نے اس کی یہ شرط بھی مان لی تھی کہ مجھ کو پیگی سے اُنس ہو چلا تھا۔ جو روز

بروز بڑھ رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی ڈگری یافتہ تھی۔ بیدار مغز، روشن خیال اور دنیاوی امور سے خوب خوب واقف۔ ابتدا میں اس کے ساتھ ایک دو شامیں بسر کرنے پر میں اس خیال میں تھا کہ وہ بھی ان جوان لڑکیوں میں سے ہوگی جو گزرتے بادل کی طرح برس کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ون نائٹ اسٹینڈ (One Night Stand) یا نئے ایڈونچر یا فری سیف سیکس کی خاطر کسی بھی اجنبی کے ساتھ رات بسر کرنا معیوب نہیں سمجھتیں۔ مگر دوبارہ اس شخص سے ملنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اگر اتفاق سے ملاقات بھی ہو جائے تو اس کے ساتھ ایک اجنبی کی طرح پیش آتی ہیں۔ لیکن پیگی شائد الگ الگ مقام پر برس کر تھک چکی تھی۔ وہ ایک ہی مقام پر تھم کر برسنا چاہتی تھی۔ یہ احساس مجھے اس شام ہوا، جب ہم ساؤتھ بینک پر دریائے ٹیمز کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اجلی شام تھی۔ سورج ڈھلنے کی فکر میں تھا۔ ہم ایک بنچ کے قریب سے گزرے تو پیگی بنچ پر بیٹھے ہوئے جوان کو پلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اچنبا ہوا کہ وہ گذرے ہوئے ایام میں کیا تلاش کر رہی ہے؟ لیکن اس کا عمل جاری رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل رہے تھے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ دریافت کیا: ''کیا تم اس جوان کو جانتی ہو؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''

''مگر جس ڈھنگ سے تم اس کو دیکھ رہی ہو۔ تمہارا اس کا سمبندھ ضرور رہا ہے۔''

اس کا چہرہ بے معنی مسکراہٹ سے اتنا بھر گیا کہ وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے مجھ کو تکتی رہی۔ پھر اس نے مجھے احساس دلانا چاہا کہ میں یہاں کے آزاد معاشرے اور طرزِ زندگی کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا۔ وہ تیور بدل کر گویا ہوئی:

''یہاں کسی لڑکی سے اس کی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا کرتے۔۔۔ اگر تم اس کے Past کو جاننا چاہتے ہو تو اس کی ڈائریاں پڑھو۔۔۔ جس میں ہر نیا جنسی تجربہ یا ون نائٹ اسٹینڈ کا ذکر ہوتا ہے''۔

یہ سننا تھا کہ اس کی کمر کے گرد پھیلے ہوئے میرے بازو نے اتنی تیز حرکت کی کہ وہ میرے سینے سے آن لگی۔ ہونٹ چھو کر میں اس کی آنکھوں میں اتر گیا۔

''بُرا مت ماننا...... تم نے آج تک اپنی کسی ڈائری کا ذکر نہیں کیا؟''

''ہاں یہ سچ ہے۔۔۔ میں ڈائری بہت پابندی سے لکھا کرتی تھی۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا، میں لکھتے لکھتے اکتا گئی اور میں نے ڈائری لکھنا بند کر دی۔''

''کیوں؟ کوئی خاص وجہ تھی؟''

''ہاں۔ تم جو مل گئے تھے۔''

میرے ہاتھ آکاش کی طرف اٹھ گئے۔ میں بے پناہ خوش تھا کہ وہ ایک ہی مقام پر ٹھہر کر اور کھل کر برسنا چاہتی ہے۔ وہ برابر برستی رہی اور میں برابر بھیگتا رہا، وہ بھی ہڈیوں تلک، اور سے اپنی گتی سے چلتا رہا۔ مگر

یہ احساس بھی میرے ساتھ ساتھ میرے اندرون تک رہا کہ وہ ہر اعتبار سے میرے لیے وقف ہوتی جارہی ہے۔ میں اپنے لئے کم، اس کے واسطے زیادہ زندہ ہوں۔ ہمہ وقت اس کے لئے میرے دل، جیب اور گھر کے دروازے کھلے رہتے۔ وہ کسی بھی در پر دستک دینے سے ذرا بھی نہ چوکتی۔ ایک دو شام میں میرے ساتھ گزارنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ مگر اگلی صبح وہ اپنی ملازمت سے اکثر غیر حاضر رہا کرتی۔ بلکہ مجھے بھی مجبور کرتی کہ میں اس روز کام کو گول کر جاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ آدمی کو اتنا ہی کام کرنا چاہیے، جس سے اُس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں، اسے اڑوس پڑوس یا ریاست کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ لوگ باگ پاگل ہیں کہ صبح اٹھتے ہی پیسے کی ہوس میں بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک میں تھا کہ پردیس میں پاؤں جما لینے پر روزانہ کام پر حاضر ہونا میرا ایمان بن چکا تھا۔ ایک شام وہ میرے ٹھکانے پر ہی تھی کہ میں نے اسے سمجھانا چاہا:

''پیگی مائی ڈارلنگ۔ ہر ہفتے تم کام سے ایک یا دو دن غائب رہتی ہو...... پے پیکٹ (Pay Packet) کا کونہ بھی کٹ جاتا ہے۔ کتنا نقصان ہوتا ہے تمہارا؟ تو کیا ہوا...... میری ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ جب زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے میں پورا ہفتہ کام کرتی ہوں۔''

''مگر تم کو اپنے Rainy Days کا بھی خیال رکھنا چاہئے؟ کچھ بچاؤ گی تو وہ پیسہ مصیبت اور مشکل وقت میں کام آئے گا؟''

''بلیڈی کالونیل تھینکنگ'' وہ الفاظ کو چبا کر اٹھ بیٹھی میز پر وہسکی کی بوتل رکھی تھی۔ وہاں کچھ ریزگاری بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گلاس تیار کئے اور ریزگاری میں سے ایک پونڈ کا سکہ اٹھا کر مجھے دکھایا اور بولی:

''اس کے بغیر اس دنیا میں جینا مشکل ہے۔ مگر شادی کرنے پر میرا ہسبنڈ میرے ساتھ میرے بچوں کی پروا بھی خود کرے گا۔ میں کیوں کروں؟''

''اور اگر اس نے کسی کارن تم کو چھوڑ دیا تو......؟''

''کوئی فرق نہیں پڑے گا مجھ کو؟...... میں کوئی دوسرا شخص ڈھونڈ لوں گی، اپنی پسند کا...... اور جب تک وہ نہیں ملے گا، میری اور میرے بچوں کی ذمہ داری اسٹیٹ (ریاست) کی ہوگی۔''

مغربی تہذیب کی آزاد عورت اور اس کی جیتی جاگتی تصویر میرے سامنے براجمان تھی۔ لیکن میرا ذہن تو مشرقی لڑکیوں اور ان کے رویوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔

پیگی جس رفتار سے میری شخصیت کا حصہ بن چکی تھی اور میں بھی تن من اور دھن اس پر نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اکثر سوچا کرتا کہ اس آفیر (Affair) کا انجام کیا ہوگا؟ میرا اٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا، پیگی اور اس کے دوستوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے دل سے قبول کر لیا تھا کہ جوان طبقہ نسلی بھید بھاؤ سے قریب قریب پاک تھا۔ دنیا تیزی سے بدل رہی تھی۔ ویت نام جنگ میں امریکہ کی شکست فاش امپریلزم کی جڑوں کا کہیں ہلنا کہیں اکھڑنا۔ غلام ملکوں کا یورپی آباد کاروں کے استبداد اور استحصال سے آزاد ہونا۔ یوروپین

عورتوں کا مساوی حقوق پانے کی خاطر تحریکِ نسواں کا اس قدر زور پکڑنا کہ جوان طبقے کا سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنا۔ ان سب حقائق نے جوان نسل کی سوچ ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ آزاد خیالی کی دلدادہ بلا کسی وکٹورین قدر پابندی، بندش اور قدغن کے جینا چاہتی تھی اور وہی اُن کی طرزِ زندگی بن کر رہ گئی ہے۔ مگر پیگی اور اُس کے دوست احباب تو کب کے زمانے کی رفتار سے آگے نکل چکے تھے۔ میں ان کی قربت میں برطانوی معاشرے کی روایات، تضادات، طبقاتی تفریق اور نو آبادیاتی تاریخ کو سمجھ کر اپنا ذہن بناتا رہا۔ لیکن دوسری طرف میں اپنے دیرینہ دوستوں سے کٹتا بھی چلا گیا جس کا مجھے افسوس بھی تھا اور دکھ بھی۔ انہوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ میں بے گانوں میں گھر کر اپنوں کو بھلا بیٹھا ہوں اور اب سفید چمڑی کا نوشہ بردار اُن کے تلوے چاٹ رہا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ درحقیقت میں پیگی کے ساتھ اتنا دور نکل گیا تھا کہ میری دنیا حسین اور رنگین بن چکی تھی۔ واپس لوٹنا اب میرے واسطے مشکل تھا۔ لیکن پیگی کے ساتھ ایک ہی ڈگر پر چلتے ہوئے بھی، یہ احساس ضرور ساتھ رہا کرتا کہ ہم ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے تو بہت ہیں، مگر ہماری منزل ایک نہیں ہے؟ یہ سوالیہ نشان اتنا گہرا اور نمایاں تھا کہ میرا اندرون اسے نصف بہتر تسلیم کرنے کا تیار نہ تھا۔ بلکہ میں اس تصور سے ہی کانپ اٹھا کرتا تھا کہ میں اپنا پورا جیون اس کے لئے تج دوں؟ چند بنیادی نکات میری سمجھ میں آچکے تھے۔ ملی جلی شادی میں تہذیبی تصادم تو ہوا ہی کرتا ہے کہ یہ فطری امر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن شوہر اور بیوی کے نزدیک اپنا اپنا کلچر، زبان، تہذیب، خورونوش اور مذہب نہایت اہم جگہ پاتے ہیں۔ پھر اولاد کس کلچر اور مذہب کے سہارے پروان چڑھے گی؟ مسئلہ سنگین تھا۔ میں جتنا سوچتا، اتنا ہی الجھ جاتا۔ لہذا میں نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ پیگی میرے بدلتے ہوئے رویوں کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ مگر اس کی ہر چھوٹی بڑی مسکراہٹ اپنے ساتھ کئی، کئی جہتیں لئے ہوتی، جن کو سمجھنا واقعی میرے واسطے مشکل تھا۔ ایک شام اس نے ایک ایسی تجویز پیش کی کہ اسے سن کر میرا دماغ چکرا گیا۔

"میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں، اپنا سامان اٹھا کر تمہارے پاس رہنے کو چلی آؤں...... پھر اپنی ہر صبح، دوپہر، شام اور رات تمہارے ساتھ گزار دوں...... کیا خیال ہے تمہارا؟"

میرا لہو خشک ہو گیا تھا۔ میں ہکا بکا بوکھلایا ہوا، اس سوچ میں گم کہ اگر ایسا ہو گیا کہ وہ اگلے روز ہی اپنی ملازمت چھوڑ بیٹھے گی اور میرے گلے میں سفید ہاتھی لٹک کر میری ریڑھ کی ہڈی بھی صاف کر ڈالے گا اور بینک کا ادھار بڑھتا ہی رہے گا۔ محتاط ہو کر میں نے چالاکی سے کام لیا۔ "اس مکان کا مالک میں نہیں، کوئی اور ہے؟...... بدقسمتی سے وہ انتہائی مذہبی آدمی ہے...... اور تم کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتا...... اگر تم یہاں آگئیں تو وہ ہنگامہ کھڑا کر ڈالے گا اور ہم دونوں سڑک پر ہوں گے۔"

لیکن میری باتوں نے اُس پر کوئی اثر نہ چھوڑا۔ وہ نپی تلی نظروں سے مجھ کو دیکھتی رہی۔ پھر یکبارگی قہقہہ لگا کر زور سے ہنس پڑی اور مجھے یہ تاثر دینے لگی کہ میں کوئی پیدائشی بونا ہوں اور دنیا سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بولی You are nothing, but a chicken (تم ایک مرغ کے سوا کچھ بھی

نہیں ہو) میں گلے میں طوق پڑنے سے ضرور بچ گیا تھا، مگر یہ ذلت میری برداشت سے باہر تھی۔ لیکن چپ سادھنے میں ہی دانشمندی تھی اور عافیت بھی۔

میری حالت اس پرندے کی طرح ہو چکی تھی، جو رہائی کی خاطر پنجرے میں پھڑ پھڑاتا ہو، مگر موقع ملنے پر اڑنے سے اس واسطے ڈرتا ہو کہ دوبارہ اسے اس معیار کا دانہ پانی نصیب ہوگا یا نہیں؟ میری سائیکی میں یہ ڈر بھی بیٹھ چکا تھا کہ پیگی کا اگلا قدم شادی کے متعلق ہوگا، جسے میں خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر ٹال تو سکتا ہوں، مگر انکار کرنے کی جرأت نہیں رکھتا۔ اور واقعی یہی ہوا۔ ایک ڈھلتی شام میں ہم لیسٹر اسکوائر کر کے اوڈین سنیما سے فلم ''الزبیتھ فرسٹ'' دیکھ کر نکلے تھے۔ فلم کمال کی تھی۔ پیگی پر اس کا اثر زیادہ تھا کہ وہ یونیورسٹی میں تاریخ کی طالب علم رہ چکی تھی۔

ہم ڈنر کے واسطے ریسٹورینٹ میں داخل ہوئے۔ کشادہ ہال گاہکوں سے قریب قریب بھرا ہوا تھا۔ باہر اندھیرا اتر کر کافی گہرا ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی زندگی ہر سو تھرک رہی تھی۔ رنگ برنگی روشنیاں۔ جلتے بجھتے نیون سائن۔ مسکراتے چہرے، مقامی لوگ، بھانت بھانت کے سیاح، حسین جوڑے اور اُن کی آمد و رفت۔ شائد اسی منظر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ London Never Sleeps میں دلکش ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ پیگی نے میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ میری زندگی کے چند نئے پہلو جاننے کی خواہشمند ہو۔ تحقیقی لہجے میں بولی: ''شادی کب کر رہے ہو؟'' غیر متوقع سوال ایک صدمے سے کم نہ تھا۔ سن ان سنی کر کے میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر خود کو تیار کیا: ''اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا۔''

''شائد تم اس خیال میں ہو کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں؟'' آنکھ ملائے بنا ہی میں گلاسوں میں وائن انڈیلتا رہا۔ مگر اُس نے اپنی بات کو جاری رکھا ''مگر ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا۔۔ اور نہ ہی سوچ سکتی ہوں۔''

وائن انڈیلتے ہوئے میرے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اُس نے بوتل میرے ہاتھ سے لے کر اسے میز پر رکھا اور صدقِ دل سے کہا: ''ہاں۔ یہ سچ ہے۔''

میں بوکھلایا ہوا من ہی من میں خوشی بھی ہوا جا رہا تھا کہ اب راستہ بالکل صاف ہے اور میں طویل مدت کے بعد کھلی فضا میں کھل کر سانس لے پاؤں گا۔ لیکن میرا ذہن یہ قبول کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ پیگی کے کہنے میں کوئی صداقت بھی تھی؟ وہ گذشتہ ڈھائی برسوں سے میرے گرد مضبوط زنجیر بنی لپٹی ہوئی تھی۔ کیوں؟ کس لئے؟ ممکن ہے یہ اُس کی کوئی نئی چال ہو؟ کوئی نیا کھیل ہو؟ اور صداقت وہی ہو جو اکثر میں سوچا کرتا تھا۔ رہائی پاتے ہوئے بھی میرے ''میں'' کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھے تو سنجیدگی سے گوش گزار ہوئی:

''بہت پہلے تم سے ایک بات کہنا چاہتی تھی...... مگر ان دنوں تم کافی جذباتی ہوا کرتے تھے...... اب تمہاری سوجھ بوجھ میں گہرائی پیدا ہو چکی ہے...... ہر شے کو صحیح روشنی میں دیکھ سکتے ہو۔ پرکھ سکتے ہو۔''

''تم وہ کہو جو کہنا چاہتی ہو...... گھما پھرا کر بات مت کرو۔''

''میں نے ہمیشہ تم کو پسند کیا ہے...... مگر کبھی اپنی اندر کی ذات سے یا یوں کہہ لو کہ اپنے ریل سیلف (Real Self) سے تم کو پیار نہیں کیا۔''

یہ بول ایک میزائیل سے کم نہ تھے۔

''ہاں یہ سچ ہے۔ میں تم سے زیادہ تمہارے بدن کو پسند کرتی رہی ہوں...... وہ میری ضرورت تھا اور ہے...... یقین کرو میں ہر رات تمہارا بدن ساتھ لئے سویا کرتی ہوں۔''

میں فنا ہو گیا۔ مگر میرے دل کا تقاضا کچھ اور ہی تھا کہ میں بھرے ریستورنٹ میں اس کی پٹائی دل کھول کر کروں...... دنیا بھر کی گالیاں دوں اور اتنا پیٹوں کہ وہ لہولہان ہو جائے۔ مگر میں بپھرا ہوا بس اتنا ہی کہہ پایا:

''تو آج تک مجھ کو استعمال کرتی رہی ہو؟''

''بالکل اسی طرح، جیسے تم مجھ کو استعمال کرتے رہے ہو...... فرق صرف اتنا ہے کہ میری ضرورت تمہارا بدن رہا ہے...... اور تمہاری ضرورت میں مکمل ہوں۔''

میں فوراً کھڑا ہو گیا کہ اپنے سخت ہاتھوں سے پیگی کی بھرے ریستورینٹ میں مرمت کروں۔ مگر عین اسی وقت میرا اندرون بول اٹھا کہ پیگی کی ہر بات میں سچ کے علاوہ کوئی دوسرا عنصر شامل نہیں ہے۔ وہ روزِ ازل سے مخلص اور پر خلوص رہی ہے۔ اس نے آج تک اپنی محبت کا اظہار کبھی براہِ راست یا دبے دبے لفظوں میں بھی نہیں کیا۔ وہ تو ہمیشہ تمہارے بدن کی دیوانی رہی ہے اور وہی اس کی منزل ٹھہری تھی اور ہے تم نے اسے غلط سمجھا ہے لیکن میری انا میری مردانگی، میرا دماغ کچھ بھی ماننے کو تیار نہ تھا۔ میں چیخ سا اٹھا:

شائد تم سوچتی ہو، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تمہاری بھول ہے...... غور سے سنو پیگی۔ اب تمہیں اپنی ضرورت کے واسطے کوئی دوسرا آدمی تلاش کرنا ہوگا...... آج کے بعد میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہوں گا۔''

مگر اس نے میری طرح اپنے اعصاب نہ کھوئے تھے۔ مہذب طریقے سے مجھے سمجھانا چاہا:

''تمہارا غصہ تمہاری سوچ پر بھاری ہوا جا رہا ہے...... تم سچائی کو ماننے کو تیار نہیں ہو...... سمجھنے کی کوشش کرو پر کاش...... ہمیں ضرورت ہے ایک دوسرے کی...... بہتر ہوگا کہ ہم کوئی نئی جگہ لے کر صاف ستھرے ماحول میں باہمی سوچ سمجھ کے ساتھ اکٹھے رہیں؟''

''اور جب تمہارا دل مجھ سے بھر جائے تو تم مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ؟''

''شائد اُس کی کبھی نوبت ہی نہ آئے؟''

''یہ سوچ تمہاری ہے میری نہیں؟''

میرا لہجہ اتنا اونچا تھا کہ آس پاس کھانا کھاتے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر پیگی کی

طرح میں ذرا بھی محتاط نہ ہوا۔ غضب ناک نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ سر تھام کر رہ گئی تھی۔ ویٹر میرے کہے بغیر ہی بل لے کر چلا آیا تھا۔ میں نے اسے چیک تک نہ کیا۔ نوٹ نکال کر پلیٹ میں پھینکے اور پیگی کو وہیں چھوڑ کر ریسٹورینٹ سے چلا آیا۔

یار دوستوں کے دل، دماغ اور گھر کے دروازے بند ہوتے ہوئے بھی میرے لئے بند نہ تھے۔ چند گلے شکوے، ناراضگی اور برا بھلا کہنے سننے کے بعد زمین ہموار ہوگئی اور ہم نئے سرے سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو گئے۔ میری ہر شام ان کے ساتھ ہی گزرنے لگی۔ لیکن میں خود کو بہت ہی اکیلا اور زندگی سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ پیگی کی غیر موجودگی نے ایسا خلا پیدا کر دیا تھا کہ زندگی خالی خولی ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی بھی شئے میرے دل کو نہ بھاتی تھی۔ دوستوں کو میری دلی کیفیت کا پورا پورا علم تھا اور اُن کی شعوری کوشش رہا کرتی کہ میں پیچھے مڑ کر ہرگز نہ دیکھو بقول اُن کے دنیا یہاں ختم نہیں ہوتی۔ وقت تو دنیا کا عظیم ترین ڈاکٹر ہے۔ وہ ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ ہر خلا پُر کر دیتا ہے اور ہر دکھ کا مداوا بھی فراہم کرتا ہے۔ مگر ان کے نیک مشورے، نصیحتیں اور ہمدردیاں مددگار ثابت نہ ہوا کرتیں۔ میں اندر سے واقعی ٹوٹ چکا تھا۔

لندن شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ "وقت" نے ایک پرندے کی صورت یہاں اختیار کر رکھی ہے۔ وہ مقامی لوگوں کے سروں پر سے کب، کہاں اور کیسے گزر جاتا ہے کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ہر گزرتا دن میرے لیے مسیحا ثابت ہو رہا تھا۔ زندگی کے ہنگاموں میں دھیرے دھیرے کھو جانے سے، پیگی کی دوری اور جدائی کم پریشان کرنے لگی تھی۔ پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ وہ محض ایک حسین یاد بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن یاد بھی کچھ ایسی کہ جب کوئی ایسا چہرہ یا بدن دکھ جاتا، جو پیگی سے مشابہت رکھتا ہو تو میرے سینے میں میٹھا میٹھا درد ابھر آتا اور گھنٹوں میرے ساتھ رہتا۔ ہر شے بدرنگ دکھائی دیتی۔

ایک سہانی شام میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک پب میں بیٹھا پی پلا رہا تھا۔ وہاں اتفاقاً پیگی کی ایک قریبی سہیلی سے ملاقات ہوگئی۔ سرسری باتوں کے بعد اس نے بتلایا کہ ان دنوں پیگی کا افیئر (Affair) فرینگ نام کے ایک جوان کے ساتھ زوروں پر چل رہا ہے۔ وہ پیار محبت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ جلد ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ہنی مون سویڈین میں منانے کی سوچ رہے ہیں۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ لیکن میں لاتعلقی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ مگر ابھی اگلا پل بھی نہ گزرا تھا کہ میرے ہاں فرینگ کو دیکھنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ من میں آیا کہ فرینگ کو پیگی کی موجودگی میں قریب سے دیکھا جائے اور کھلے بندوں اُس کا خود سے موازنہ کیا جائے کہ وہ کس زاویے سے مجھ سے بہت بہتر اور برتر شخص ہے؟ یقیناً اس میں کوئی خاص بات رہی ہوگی، جس کی وجہ سے پیگی جیسی تجربے کار اور دانا عورت اُس سے شادی کرنے کو راضی ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مجھ میں جلن اور حسد کا جذبہ کیوں کر ابھر آیا ہے؟ پیگی میری جائیداد، میری جاگیر تو نہیں کہ اسے میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ جیون گزارنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے؟ میں نے فوری طور پر اپنی خواہش کا گلا دبا ڈالا۔ لیکن میں اپنے باطن سے زیادہ خوش نہ تھا۔

ایک روز کام سے فارغ ہو کر میں نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ مالک مکان نے آگاہ کیا کہ پیگی پچھلے ایک گھنٹے سے وقفے وقفے سے متواتر فون کرتی چلی آرہی ہے اور جلد ہی مجھ سے ملنے کو آرہی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا اسے دروازے سے ہی چلتا کردوں گا۔ لیکن ایسا کرنا تو اخلاقاً اور تہذیباً غلط ہوگا؟ در پر تو دشمن بھی چلا آئے اس کا سواگت کرنا فرض سمجھا گیا ہے۔ پھر پیگی کے ساتھ تو برسوں رفاقت رہی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں اور پیگی ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر خاموش، مہر بہ لب، لاتعلق، وہ کچھ زیادہ ہی تھکی تھکی، بجھی بجھی سی تھی۔ بکارڈی کا جام اس کے سامنے جوں کا توں دھرا تھا۔ سگریٹ کے کش پہ کش لئے جارہی تھی۔ وہ آس پاس کی ہر شے سے بے نیاز خود میں اسقدر کھوئی ہوئی تھی کہ مجھ سے بھی آنکھ نہیں ملا پارہی تھی۔ میرا ذہن بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرح ادھر ادھر بھٹک کر جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ ایک طویل خاموشی کے بعد آج اچانک یہاں کیوں آن دھمکی ہے؟ کوئی وجہ تو ضرور رہی ہوگی؟ لیکن میں کوئی نجومی تو تھا نہیں؟ اسی کی زبانی اس کے آنے مقصد سننے کو بے تاب تھا۔ آخرش مجھ سے آنکھ ملائے بنا اور کرسی پر پہلو بدل کر اس نے لب وا کئے:

''میں تھوڑی خودغرض ہوں...... اسی لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔''

میں انجان بنا رہا۔

''اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے یہاں آنے کہ وجہ صرف تم ہو؟''

''میں...... بھلا میں کیسے وجہ ہو سکتا ہوں...... تم نے آج تک مجھ سے پیار نہیں کیا۔؟''

''ہاں یہ سچ ہے......اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تم سے کبھی پیار نہیں کر سکتی...... ہماری ذہنی سطح الگ الگ تھی اور ہے''۔

''مگر اب تمہیں اپنی سطح کا پرنس چارمنگ مل گیا ہے؟''

اس نے میرے لہجے کی کڑواہٹ اور طنز کو محسوس کر لیا تھا۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ گلاس کا سہارا لیا، ایک دو گھونٹ بھر کر افسوس سے بولی:

''فرینک کی ذہنی سطح مجھ سے بھی بڑھ کر ہے...... بلا کا ذہین ہے...... آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری یافتہ ہے۔ گھنٹوں دنیاوی موضوعات پر بات کرتے نہیں تھکتا...... یقین کرو میں نے اس کی صحبت میں ہر پل کا لطف اٹھایا ہے''۔

''اچھا......؟ یہ تو خوشی کی بات ہے۔''

''مگر یہ سن کر تم کو حیرت ہوگی کہ پچھلے ہفتے میں نے اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے۔''

''کیا......؟ یہ انکشاف میرے لئے ایک صدمے سے کم نہ تھا۔ مجھے پیگی کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ممکن ہے دو ڈگری یافتہ شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئی ہوں اور انجام علیحدگی...... علیحدگی۔

''میں فرینک کی بڑی قدر کرتی ہوں...... اور کرتی رہوں گی۔''

''تو پھر اسے چھوڑا کیوں؟...... کیا کمی تھی اس میں؟''

وہی جو خوبی تم میں پائی جاتی ہے۔

''مجھ میں......؟''

''ہاں۔ وہ تمہاری طرح جاندار نہیں تھا۔ اس کی مردانہ قوت کم تھی اور جنسی بھوک بھی۔''

مجھے لگاتار برقی جھٹکے لگ رہے تھے اور میں پیگی کے انوکھے تجربات سے الگ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مگر اچانک مجھے ہنسی آگئی اور میں دیر تک ہنستا رہا۔ وہ دم بخود پریشان مجھ کو دیکھتی رہی۔ لیکن پیگی کی ٹریجڈی اس دوران میری سمجھ میں آچکی تھی۔ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ''تو تمہیں مکمل آدمی کی تلاش ہے؟''

''ہاں۔ کیوں نہ ہو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟...... میں جوان ہوں۔ خوبصورت ہوں۔ ذہین ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں۔ مکمل آدمی کی تلاش کیوں نہ ہو؟''

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس دنیا میں ہر شخص کے ہاں کوئی نہ کوئی کمی پائی جاتی ہے۔ پورا آدمی تو ڈھونڈتے پر بھی نہیں ملتا؟ پھر جو شخص واہموں کے سہارے زندہ رہتا ہے، وہ اپنی قبر بھی خود کھودنے لگتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں، تمہارا حشر بھی ویسا نہ ہو؟ مگر یہ سب کہنے کے بجائے میں نے اس سے کہا: ''مجھے افسوس ہے کہ فرینک کے ساتھ تمہارا سلسلہ ختم ہو گیا ہے...... مگر تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟''

''میں پریشان ہوں، انتہائی حد تک...... آج مجھ کو تمہاری ضرورت ہے...... صرف آج کی رات...... انکار مت کرنا۔ ورنہ میں تم کو دنیا کا سب سے بڑا مجرم سمجھوں گی۔'' اور میں واقعی انکار نہ کر پایا۔

شب بھر وہ میرے بدن سے لپٹی رہی۔ جیسے وہ ہی اس کی زندگی کا مرکز رہا ہو۔

وہ ہی اس کی دنیا کا محور تھا اور اب وہ اُس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا انگ انگ چوم کر وہ چھوٹی بڑی سسکیاں بھی بھرتی رہی۔ سے اپنی گتی چلتا رہا۔ مگر پیگی کی کوئی بھی سسکی، کوئی بھی حرکت میرے جذبات کو چھو نہ پائی۔ میں دل کڑا کیے پڑا، سوچتا رہا کہ عقل بھی آدمی کو کیسے کیسے دھوکے دیتی ہے؟ کبھی وہ اپنی ذہانت کا غلام بن جاتا ہے، کبھی اپنی خواہشات کا اور کبھی اپنی جبلتوں کا۔ لیکن میرے دل پر رکھا پتھر اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ سرکا۔

کار موٹر وے کو چھوڑ کر میری رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ میں پیگی کے ساتھ بیتے ہوئے ماہ و سال کے تمام اوراق پلٹ کر بھی خود کو اُس سے الگ نہیں کر پایا۔ وہ میرے نظام میں کہیں نہ کہیں ضرور اٹکی ہوئی ہے؟ اسے اپنے جیون میں پھر سے آنے کی دعوت دے کر میں خود ہی اپنے پھینکے ہوئے جال میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ مجھے خوف سے زیادہ اب یقین ہو چلا ہے کہ پیگی جلد ہی اپنے نئے عاشق کو چھوڑ بیٹھے گی اور ایک شام میں گھر میں قدم رکھوں گا تو مالک مکان مجھے بتائے گا کہ پیگی اوپر کمرے میں بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہے جانے اس وقت میری حالت کیا ہوگی؟

اسٹرینگ میرے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا تھا۔

●●●

کارڈ بورڈ کے انسان

صدیق عالم

• میں جوان تھا اور آسمان میں ان دنوں تمام ستارے چمکتے تھے جو صرف ایک جوان شخص کو نظر آتے ہیں جب ایک دن میں نے کالج اسکوائر پر کارڈ بورڈ پہنے ہوئے کچھ انسان دیکھے۔ انھوں نے تاریک عینک سے اپنی آنکھیں ڈھک رکھی تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ان میں سے میں کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا، مگر مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ اس طرح کے لوگ ان دنوں شہر میں نظر آنے لگے ہیں۔ وہ جب میرے قریب سے گذرے تو میں نے سوچا، وہ شاید رک کر اپنے اس عجیب وغریب لباس کا جواز پیش کریں گے۔ مگر انھوں نے کمال خوبی کے ساتھ مجھے نظر انداز کر دیا اور عین ممکن تھا کہ میں پیچھے رہ جاتا کہ میں نے یا شاید میرے اندر کے دوسرے انسان نے انھیں مخاطب کر لیا۔

''اس عجیب وغریب لباس کے ذریعے آپ لوگ شاید کوئی خاص پیغام دینا چاہتے ہیں؟''

''کیسے؟'' ان میں سے ایک نے میری طرف سر موڑے بغیر کہا اور رک گیا۔ جس کے ساتھ ہی ان کے پاؤں تھم گئے تھے جیسے اس کا اس طرح رکنا دوسروں کے لئے کسی ملٹری افسر کے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔

''شاید اس ملک کو، شاید کچھ خاص لوگوں کو، یا شاید آپ کا اپنا یہ خاص طریقہ ہو ہر چیز کو درگذر کر دینے کا۔ کارڈ بورڈ، اس کے ساتھ جینا آسان تو نہیں۔''

''آپ نے تو اتنا کچھ کہہ دیا کہ ہمارے لئے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔'' سامنے کھڑی چھدری داڑھی والے آدمی نے کہا۔ وہ میری آنکھوں کے اندر تاک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کارڈ بورڈ کے سوراخوں سے بڑے ہی مضحکہ خیز انداز میں باہر لٹک رہے تھے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی جس کے سینے کو کارڈ بورڈ سپاٹ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ''اور مشکل یہ ہے کہ آپ نے آخر میں ہماری جھولی میں ایک ایسا سوال ڈال دیا ہے جس کا جواب ہم دینا نہیں چاہتے۔'' یہ اس عورت کی آواز تھی۔

سڑک پر رات کے لیمپ کی مناسب روشنی تھی پھر بھی وہ لوگ صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے یا ممکن ہے وہ ایک خاص ڈھنگ سے۔ چلتے ہوئے ایک دوسرے کے سائے میں چھپنے پر قادر ہو گئے ہوں۔ اچھی طرح پہچان میں آجانا، یہ اپنی طرح کے مسئلے تو کھڑا کر ہی سکتا ہے۔

''آپ چپ ہیں؟'' عورت کی کارڈ بورڈ سے آواز آئی۔ ''شاید ہماری گفتگو ختم ہو گئی ہے۔ تو ہم جا سکتے ہیں؟''

''نہیں نہیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر ان سے قریب ہونے کی کوشش کی۔ شاید میرے اس عمل کو

انھوں نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ کارڈ بورڈ کے سائے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر سے تھم گئے تھے۔ ہمارے درمیاں فاصلہ پہلے کی طرح برقرار رہا۔

''آہ!'' میں نے اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا دم گھٹ رہا ہے۔ آپ اپنے پیچھے ایک ایسی خاموشی چھوڑے جا رہے ہیں جو کسی دبی ہوئی چیخ کی طرح میرے پرخچے اڑا دے گی۔''

صاف ظاہر تھا، میں مسخرے پن پر اتر آیا تھا۔ انھوں نے اسے محسوس تو کیا تھا، مگر ان کی خاموشی اور سنجیدگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ آخر کار داڑھی دار شخص نے ایک لمبی سانس لی اور کہا۔ ''آپ بھی شاید اس شہر کے دوسرے لوگوں کی طرح ایک صاف باطن انسان بننے کی اداکاری کر رہے ہیں''

''تو آپ لوگ اس شہر کے نہیں اور آپ لوگوں کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔''

''بیشک ہم نے یہیں جنم لیا۔ مگر ایک صبح جو اور دوسری صبحوں سے کچھ الگ نہ تھی ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ گرچہ ہم شہر کے مختلف مقامات میں رہتے آئے ہیں اور زندگی میں ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان کچھ قدریں تو مشترک ہیں جن کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کو جان سکتے ہیں۔ تو ہم نے ان نشانات کی تلاش کی جو ہمیں ایک دوسرے تک لے جا سکتے تھے اور آپ دیکھ رہے ہیں، ہماری ایک مخصوص تعداد بن چکی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ اپنی مخصوص شناخت کا دعویٰ پیش کر سکیں۔ لیکن یہ آپ کس نقطۂ نظر کی بات کر رہے ہیں؟ کیا انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نقطۂ نظر کا قیدی بن کر جئے۔ کیا صرف انسان بننا کافی نہیں؟''

''پھر یہ کارڈ بورڈ؟'' میں نے اپنی زمین کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ نشانات جنھوں نے آپ لوگوں کو ایک جگہ جمع ہونے پر مجبور کیا۔ اور وہ مخصوص شناخت جس کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں۔ کیا اتنا سب کچھ کہہ کر میں نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے؟''

''شاید!'' ایک دوسرے شخص نے اپنی تاریک عینک کے اندر سے کہا۔ ''ممکن ہے آپ جو کہہ رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ مگر یہ آپ بھی تسلیم کریںگے کہ ہر شخص کا چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا اپنا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم جو دیکھتے ہیں وہ کسی حد تک خود ہماری ایجاد ہوتی ہے، وہ چیز نہیں ہوتی جسے ہم دیکھتے ہیں۔''

اور وہ دھیرے دھیرے کشادہ سڑک پر آگے بڑھتے گئے، دور تک ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے جیسے وہ اتنی دوری سے بھی ایک خاص اشاراتی زبان میں مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔

اور پیارے قارئین! لگے ہاتھوں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں کارڈ بورڈ کے اس ہجوم میں بے شمار عورتوں کو بھی دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، آخر کار، کیا واقعی عورتوں کو ان کی زبان مل گئی ہے!

میں گھر لوٹا تو تھک چکا تھا۔ مجھے پتہ تھا آگے بھی ان لوگوں سے میری ملاقات ہونے والی ہے اور میں ابھی سے سوچ رہا تھا کہ شاید آگے ہمارے بیچ گفتگو کے لئے کچھ ٹھوس زمینیں تیار ہو جائیں، یا ہماری گفتگو

کے موضوعات بدل جائیں۔ میں اپنے کمرے میں دیر رات تک جاگتا رہا۔ اور رات جیسے جیسے گہری ہوتی گئی باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی رک رک کر چلتی ٹرینوں کا شور بھی سنائی دینے لگا جو دن کے وقت سنائی نہیں دیتا تھا۔ ان ٹرینوں کی پٹریاں کبھی شہر کی سرحد پر واقع تھیں جس کے دوسرے طرف بنجر میدان یا تاریک کھائیاں تھیں۔ لیکن شہر اب اس قدر پھیل گیا ہے کہ یہ پٹریاں اب اس کے عین وسط میں آ گئی ہیں۔ میں نے اپنے پرانے دنوں کے ان لمحوں کو کھنگالنے کی کوشش کی جن میں ان کارڈ بورڈ کے انسانوں جیسی کوئی بات کبھی پیش آ چکی ہو۔ میں تیس برس کا ہو چکا تھا اور ایک طرح سے میرے پاس پیچھے مڑ کر تاکنے کے لئے بہت کچھ بن چکا تھا۔ مگر میں نے دیکھا، میرے ماضی میں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ایک میکانیکی انسان، ایک روبوٹ جس نے گھڑی کے کانٹوں کے ساتھ جینے کی کوشش کی، سوچ کے ان ڈھانچوں کو قبول کیا جو وراثت میں اسے ملے تھے اور اب جب کہ دور کتے بھونک رہے تھے اور رہ رہ کر ٹرین کے گذرنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں دیکھ رہا تھا کہ میں ایک روبوٹ بننے کے حق سے بھی محروم ہو گیا جو ایک پروگرام کے تحت عمل کرتا ہے۔

رات جانے کب میں سو گیا، جانے کب صبح ہو گئی۔ میری آنکھیں کھلیں تو مجھے لگا میرا جاگنا خود میرے لئے حیرت کا ایک نیا ماحول لے کر آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا، آسمان آج ضرورت سے زیادہ نیلا تھا اور کوے ضرورت سے زیادہ کالے، گھر کے لوگ کچھ زیادہ ہی گھر کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ مگر پھر جانے کیوں ان کی گفتگو میں مجھے کچھ ایسی بات محسوس ہوئی جس نے میرے کان کھڑے کر دیئے۔

صبح کے اخبارات میں کچھ لوگوں کو زندہ جلائے جانے کی خبریں تھیں جنھیں کارڈ بورڈ پہنے پایا گیا تھا اور حکومتِ وقت نے، جس کے جبڑے کسی لکڑ بگھے سے کم تیز نہیں ہوتے، اس نے دعویٰ کیا کہ ان کارڈ بورڈ کے انسانوں کو زندہ جلا دیا جانا ضروری تھا کیونکہ انھوں نے اپنے جسموں سے ڈائنامائٹ لگا رکھے تھے۔

ہاں، میں نے تائید میں سر ہلایا، ڈائنامائٹ تو انھوں نے اپنے وجود سے لپیٹ رکھا تھا جو ان لکڑ بگھوں کے جبڑوں کو چور کر دینے کے لئے کافی تھے، مگر تھے تو وہ کارڈ بورڈ کے انسان۔ ان کا جلا دیا جانا بالکل فطری تھا۔ اور یہ دیکھ کر کہ میں ایک ایسے ملک میں جاگا تھا جس پر لکڑ بگھوں کی حکمرانی تھی میں نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک کارڈ بورڈ کا ڈبہ جس کا جوتا نکال لیا گیا تھا، اٹھا کر اس میں انسانی منہ اور آنکھوں کے لئے سوراخ بنائے جو بالکل مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے اندر انسانوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ تو میں نے قدِ آدم آئینے کے اندر بیٹھے اس دوسرے آدمی سے کہا جو میری طرح ہی ایک دوسرا کارڈ بورڈ کا انسان بنانے میں مصروف تھا۔

''یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اب کارڈ بورڈ تو نظر آئینگے مگر اندر کا انسان جل چکا ہوگا۔''

●●●

ورثہ

یوسف عارفی

● جنرل باڈی میٹنگ میں شرکت کے لئے مجھے جس شہر جانے کا حکم ملا تھا، وہ شہر میرا قطعی دیکھا بھالا نہیں تھا۔ مگر اس شہر کے بارے میں، میں نے یہ سن رکھا تھا کہ اس شہر کے قریب فصیلوں اور گنبدوں والا شہر بھی واقع ہے۔ پرانی اور نئی طرح کی چیزوں سے سجے سجائے بازار ہیں —— منہدم ہوتی حویلیاں، اور لمبے لمبے دالانوں والے بھائیں بھائیں کرتے محل ہیں جن کی چاردیواریاں زمین دوز ہوگئی ہیں اور اپنی حد بندیاں کھو چکی ہیں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس شہر میں ایک ایسا بازار بھی ہے جہاں ایسی نادرونایاب چیزیں ملتی ہیں جن کا استعمال آج کی زندگی میں معدوم ہو چکا ہے مجھے ایسے پرانے شہروں اور ان کے ایسے بازاروں سے دلچسپی نہیں ہیں ہاں میری بیوی نے جب اس شہر کا نام سنا تو اس کا چہرہ جیسے کسی اندرونی شادمانی سے دمک اٹھا اس نے فرمائش کی میں اس کے لیے ویسی کمر پیٹی خرید کر لاؤں، جس کا استعمال اس کی دادی ماں کیا کرتی تھیں اور جا خالص چاندی کے دھات سے بنائی جاتی تھی۔

شہر پہنچ کر جنرل باڈی میٹنگ سے فراغت کے بعد میں نے دفتر کے ایک ساتھی سے پرانے شہر کی سڑکوں اور بازاروں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے مشورہ دیا۔

”پہلے اس شہر کا وہ ماڈرن اور خوبصورت علاقہ دیکھ لو جس میں سافٹ ویر اور کال سنٹرز کے شاندار دفاتر ہیں۔ شاپنگ مال کی رنگین جگمگاتی روشنیوں میں سجا کر رکھی گئی ان اشیا کو دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے کہ آج کل کتنی حیرت انگیز اور کارآمد چیزیں ایجاد ہونے لگی ہیں۔“

میں نے اکتا کر کہا۔ یار ایسا سب کچھ تو میرے شہر میں بھی نظر آنے لگا ہے۔“

جواب میں اس نے کہا۔ ”تم چاہو تو میں تمہیں پرانے شہر کے لال دروازے تک چھوڑ سکتا ہوں جس کی فصلیں ڈھے گئی ہیں۔ وہاں سے تم آگے جانے کے لئے کوئی سواری لے سکتے ہو۔“

جب ہم لال دروازہ پہونچے تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ یہ کوئی معمولی دروازہ نہیں تھا بلکہ شہر کا باب الداخلہ تھا، کائی زدہ، منہدم ہوتا ہوا، اجڑا اجڑا سا۔ اس سے قبل کہ میں اپنے ساتھی سے اس دروازے کے بارے میں کچھ پوچھتا، اس نے دفتر میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لال دروازے میں پیدل آنے جانے والوں کی ایک بھیڑ تھی۔ ایسا لگتا تھا پرانے شہر میں کوئی نمائش یا میلہ لگا ہے۔ مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ سڑکیں اتنی تنگ تھیں کہ انہیں دیکھ کر گلیوں کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے لگا یہاں سے بازار جانے کے لئے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ اس شہر میں پرانا بازار کہاں واقع ہے اس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں

نے قریب سے گذرتے ہوئے ایک بزرگ سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"قبلہ، اس علاقے میں نایاب چیزوں والا بازار کہاں ہے؟
نادر اشیاء کا بازار، انہوں نے اپنی کمزور بینائی والی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا اور پوچھا۔
کیا خریدنا چاہتے ہو؟"
"کمر پیٹی!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا
"کیا کیجئے گا اس کا اب تو اس کے پہناوے کا رواج نہیں رہا"، بزرگ کے لہجے میں قدرے اداسی تھی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ کمر پیٹی اور اس کے رواج کے زمانے سے یہ بخوبی واقف ہیں" یہ اب کسی بھی دکان میں دستیاب نہیں ہے"۔ بزرگ نے مجھے جسے آگاہ کیا اور آگے بڑھ گئے مجھے یاد آیا پرانی چیزوں کے روزمرہ کی زندگی سے غائب ہو جانے کا ملال تو میری ماں کو بھی تھا وہ یا کرتی تھیں اس زیور اور اس پوشاک کو جوان کے عمر رسیدہ ہوتے ہوتے صندوقوں میں مقفل ہو گیا تھا میں نے بزرگ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں وہ بھیڑ میں گم ہوتے جا رہے تھے میں بھیڑ میں جلدی جلدی اپنا راستہ بناتا بزرگ کے قریب جا پہونچا اور بے ربط سانسوں کے درمیان اُن سے درخواست کی کرم ہوگا اگر آپ مطلوبہ چیز حاصل کرنے میں میری مدد فرمادیں"
انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پوچھا کس کے لئے چاہئے؟
میں کہا یہ میری بیوی کی فرمائش ہے انہوں نے مجھ پر اپنائیت بھری نظر ڈالی اور پوچھا آپ نے جی نہیں میں نے اپنی ماں سے سن رکھا تھا کہ اسے میری دادی اماں استعمال کیا کرتی تھیں
دادی اماں کے زمانے کی چیز اب آپ کی اہلیہ استعمال کریں گی؟ پتہ نہیں ان کے لہجے میں طنز تھا یا مسرت؟ انہوں نے میرا کندھا تھپتھپایا اور مجھے ساتھ لیکر چل پڑے
ایک قدرے ویران چوڑی سڑک پر چلتے چلتے جب ہم دائیں جانب گھومنے لگے تو میں نے دیکھا بستی کے اطراف کھڑی فصیلوں کا سلسلہ یہاں آتے آتے منہدم اور معدوم ہو چکا ہے وہ درخت جو کبھی گھنے رہے ہوں گے ان کی بے برگ و بار شاخیں اس بستی کی ویرانی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں کچھ دور چل کر بزرگ لکڑی کے ایک بلند و بالا وسیع عریض پھاٹک کے سامنے پہونچ کر رک گئے اور اس کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتے ہوئے کہا
"احتیاط کے ساتھ اپنا سر جھکا کر اندر داخل ہو جائیں بڑا پھاٹک ایک عرصے سے بند پڑا ہے" اتنا بڑا پھاٹک شاید ہاتھی شکراموں کے آنے جانے کے لئے بنایا گیا ہوگا میں نے سوچا اور پوری احتیاط کے ساتھ سر جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔
سامنے ایک محل نما شکستہ رنگ و روغن سے عاری عمارت کھڑی تھی اس عمارت کے اندر پہونچنے کے لئے جو راستہ جاتا تھا اس میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے راستے کے دورویہ کناروں پر شاید طرح طرح کے خوشنما درخت رہے ہونگے جو اب سوکھ کر ٹھنٹھ ہو گئے تھے ان کی پشت پر مہندی کے پودوں کی کھڑی باڑھ دیکھ کر

مجھے بے اختیار ماں یاد آ گئیں جو ہر مہینہ اپنے ہاتھوں میں مہندی رچانے کے لئے ایسی ہی مہندی کی باڑھ سے مہندی کے پتے توڑلا ایک دن میں نے ان سے مہندی کا پودا دیکھنے کی ضد کی تھی تو وہ سفید براق جیسی چاندنی میں نہائی عمارت کی پشت پر واقع باغیچہ میں لے گئی تھیں اور میں بڑی دیر تک حیرانی سے اس سفید اُجلی عمارت کو دیکھتا رہ گیا تھا خوبصورت دریچوں پر بنے نقش ونگار دروازوں پر پڑی خس کی چلمنیں اور اندر باہر ہر طرف ایک خوابناک خاموشی!

''اس گھر میں میری ایک دور کی رشتہ دار بیاہی گئی ہیں'' عمارت کو حیرانی سے دیکھتا ہوا پا کر ماں نے مجھے بتایا تھا۔

یہ دور کی رشتہ دار کون تھیں کیا تھیں میں نے جاننے کی کوشش کبھی نہیں کی مگر اب جب کہ ایک کائی زدہ نہایت اداس بلکہ اپنی اصل ہیت کھوتی اس عمارت کو دیکھ رہا ہوں تو نہ جانے یہ گماں سا کیوں ہونے لگا ہے کہ کہیں یہ وہی عمارت تو نہیں جس کی خوابناک پلکوں کے سائے میں.........

''آپ چاہیں تو جوتے سمیت اندر آسکتے ہیں''۔ بزرگ نے دروازے پر پڑی بوسیدہ سی چلمن ہٹاتے ہوئے کہا۔''قالین جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اس لئے میں نے اٹھوا دیئے۔ اب وہ پہلے جیسے رہن سہن، طور طریقے اور ادب وآداب باقی نہ رہے کہ ان سے وابستہ چیزوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔''

میں نے خاموش کے ساتھ جوتے اتار دیئے اور گہری لمبی سانس لیتا، دروازے پر جھولتی چلمن ہٹاتا اندر داخل ہو گیا۔ اندر بھائیں بھائیں کرتے وسیع عریض دیوان خانے میں کسی ذی روح کو نہ پا کر میں کچھ لمحوں کے لئے گم سم سا کھڑا رہا۔

''آپ بلا جھجک میرے ساتھ آتے رہیں۔'' بزرگ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔'' یہ ہماری آرام گاہ ہے، اطمینان سے یہاں بیٹھ جائیں۔''

اس سے قبل کہ میں اپنے بیٹھنے کے لئے کسی جگہ کا انتخاب کرتا، میں نے محسوس کیا دیواروں پر بڑے بڑے فریموں میں مصورانہ عمل کی حامل تصویروں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے چہرے بھی تھے جو جاہ وجلال کے حامل تھے۔ میں نے سوچا جاگیرداروں اور منصب داروں کے حویلیوں کی دیواروں پر ایسے ہی تمکنت والے چہرے آویزاں ہوتے ہیں ـــ مگر مجھے یہاں لانے والے بزرگ کا کوئی سلسلہ ان آسودگانِ خاک سے ملتا نظر نہ آتا تھا جن کا جاہ وجلال اب بوسیدہ تصویروں کی صورت دیواروں پر آویزاں تھا۔

''اس آرام گاہ کی صفائی کو ایک لمبا عرصہ ہو گیا آپ یہاں ہماری اس روزمرہ استعمال میں آنے والی کرسی پر بیٹھ جائیے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

میں قدرے جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے لمبی چوڑی میز کی ایک جانب 'اردو اخبارات' رسائل اور کتابوں کا ڈھیر [illegible] تھا۔ مضبوط جلد والی ضخیم کتابیں نہایت بے ترتیبی کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب والی دیوار کے منظر نے مجھے کچھ زیادہ ہی حیران کر دیا۔ قطار سے کھڑی ہوئی الماریوں میں ڈھیر ساری کتابیں بھری پڑی تھیں۔ کچھ الماریوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور کچھ دھندلا سے گئے تھے۔ اتنی ساری ڈھیر ساری

کتابیں یکجا دیکھ کر مجھے اس آرام گاہ پر کسی لائبریری کا شبہ ہونے لگا۔

''یہ ہمارے بزرگوں کا دارالمطالعہ تھا، جسے میں نے آج کل اپنی آرام گاہ بنالیا ہے۔ ان کتابوں کے بارے میں آج بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ علم وادب، تہذیب وتمدن اور فنون لطیفہ کا وہ خزانہ ہے جسے ہمارے اجداد نے سرمۂ نظر بنایا تھا۔ یہ گزرے زمانے کے نایاب حافظے ہیں جن کو محفوظ کر لینے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ جب میں نے ان نادرونایاب کتابوں پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا ہے کہ ان کتابوں نے اپنی حفاظت اور پڑھے جانے کے لیے ایک لمبا زمانی سفر طے کیا ہے اس سفر نے ان کے اوراق کو بوسیدہ اور پژمردہ کردیا ہے اب ان کی ورق گردانی کی مہلت بھی نہیں رہی کہ کہیں ہاتھوں اور انگلیوں کے لمس سے چورا چورا نہ ہوجائیں انہوں نے اچانک ہی اپنی بات کا رخ بدل ڈالا۔ ''افسوس کہ آپ ایک ایسے وقت میں یہاں آئے ہیں جب آپ کی عمر کا کوئی بھی فرد یہاں موجود نہیں۔ ہمارے بیٹے بیٹیاں اور ان کے بچے ایک ساتھ اس گھر میں اکٹھا ہوجائیں تو ایک جشن سا بپا ہوجائے، مگر—— ''بزرگ نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی، شاید انہیں یہ خیال آیا ہو کہ اپنا ذاتی حال احوال کسی اجنبی کے سامنے بیان کرنا خود کو بے لباس کرنا ہے۔

میرا جی چاہا، اٹھ کر الماریوں کے دھندلے اور ٹوٹے پھوٹے شیشوں سے نظر آتی ایک ایک کتاب کھول کر دیکھوں کہ آخر گذرے ہوئے زمانے کے حافظے کتنے زرخیز تھے۔

''آپ نے جامعہ تک تو تعلیم حاصل کی ہوگی'' بزرگ نے اچانک پوچھا۔

''میں نے ایم بی اے تک پڑھائی کی ہے۔ یعنی ....''

''جانتا ہوں، ہمارے بچوں نے بھی ایسا ہی کچھ پڑھ رکھا ہے، خدا آپ لوگوں کو خوش رکھے''۔

کچھ دیر بعد کسی نے آرام گاہ کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دستک کی آواز سن کر بزرگ نے کہا'' آج آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہوجائیں اور ان سے بھی مل لیں جو آپ کی مطلوبہ چیز کی فراہمی میں مددگار بن رہی ہیں''۔ ان کے لہجے میں اپنائیت اور شفقت کی پھوار تھی۔

''یہ ہماری بیگم ہیں''۔ میں نے بیگم صاحبہ کے قدوقامت، وضع قطع اور لباس کو دیکھے بغیر نہایت ادب سے تسلیم کیا، اور سر جھکائے کھڑا رہا اور یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ میری بلائیں لینے لگی ہیں اور بغور مجھے دیکھے جارہی ہیں۔ پھر وہ اپنی شیریں آواز میں پوچھنے لگیں۔ ''بیٹے۔ تمہاری کچھ شباہت ہمارے بڑے لڑکے سے ملتی جلتی ہے۔ کہیں تم——؟ ان کی سوالیہ نظریں شاید مجھ پر اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے قدرے جھجکتے ہوئے انہیں دیکھا۔ وہ اپنے دھنکی ہوئی روئی والے سفید سر پر ہلکا آسمانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں اور اپنی نم آلود پلکوں کے کنارے صاف کررہی تھیں۔

''آج یہ سارا دن یادوں کے کوچوں میں بھٹکتی رہیں گی اور ان سے کوئی کام نہ ہوگا۔ میں نے محسوس کیا بزرگ کے اس شائستہ مذاق میں ڈھیر ساری ان کہی باتیں اور کچھ کھودینے کا ملال شامل ہے۔

کھانے سے فراغت کے بعد بزرگ پھر ہمیں آرام گاہ کی جانب لے کر چل پڑے اور چلتے چلتے

بتانے لگے "بہت دنوں بعد آج ہماری بیگم صاحبہ کی آنکھ سے آنسو چھلک پڑے ہیں اور یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب غیر کے پردے میں اپنا کوئی عزیز دکھائی دینے لگے۔" پھر انہوں نے آرام گاہ میں بے ترتیبی سے بکھری چیزوں پر نظریں دوڑائیں اور کہا — "یہاں گزرے زمانے کی کوئی چیز آپ کے آرام میں خلل نہیں ڈالے گی۔ کچھ دیر آرام کیجئے پھر رخصت۔

ان کے جاتے ہی میں نے محسوس کیا اس آرام گاہ میں پھیلا گرد آلود سناٹا میرے ذہن میں الجھن پیدا کر رہا ہے اور بے تحاشہ شور مچانے لگا ہے۔ الماریوں کے دھندلے شیشوں سے نظر آتی پرانی کتابوں کے بارے میں میں نے سوچا نئے زمانے کی کتابیں انھیں اپنی الماریوں میں کیوں جگہ دینگی؟

میری سوچ کا دھارا اس وقت ٹوٹا جب کوئی گلوگیر نسوانی آواز میں کہہ رہا تھا "ہماری طرف سے یہ چاندی کی سو برس پرانی کمر پیٹی "دلہن" کو دیدینا" اس بھیگی ہوئی آواز میں ایک دوسری نوحہ کرتی ہوئی آواز ان بزرگ کی تھی۔

"دلہن سے کہیئے گا کہ اسے مسلسل استعمال کرتی رہیں کیونکہ چیزوں کے استعمال ہی سے ان کی آب و تاب باقی رہتی ہے ورنہ ان کا حشر...... یہ کہتے کہتے ان کی آنسوؤں سے نم آنکھیں دیواروں پر آویزاں عظمت رفتہ کی یاد تازہ کرنے والی تصویروں کو چھوتی ہوئی ان الماریوں کے شیشوں پر آکر رک گئیں جن میں صدیوں کا حافظہ پنجرے میں بند پرندے کی طرح تازہ ہوا اور فضا میں اڑنے کے لئے اپنے پر پھڑپھڑانے کی سکت کھو چکا تھا۔

میں نے سر اٹھا کے رخصت ہونے کی اجازت مانگی تو ورثے میں ملی ویران حویلی کو اپنی تنہائی سے آباد رکھنے والی خاتون نے خدا حافظ کہتے ہوئے یاد دلایا کہ زندگی کی نئی رونقوں میں اگر کسی کو نادر و نایاب علمی اثاثے کی تلاش ہو تو اسے اس شکستہ حویلی کا پتہ دیدیجئے گا۔ خدا حافظ ●●●

● پچھلے دنوں امریکہ کے ایک درجن سے زائد شہروں میں عراق پر امریکی قبضے کو جاری رکھنے کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے بوسٹن سے نیویارک اور شکاگو سے لاس اینجلز تک ان مظاہروں میں عراق پر قبضے اور ایران پر امریکی حملے کی دھمکی کی بھی مذمت کی گئی۔

درد کے خیمے کے آس پاس

(کچھ دیر مغنی تبسم کے ساتھ)

حسین الحق

- ادب عالیہ کا سب سے خوب صورت استعارہ شاعری ہے۔

فنونِ لطیفہ میں جو مقام شاعری کو حاصل ہے وہ بلند مقامی اور جامع الاحوالی مصوری، بت گری، موسیقی، رقص کسی کو میسر نہیں کیوں کہ حواسِ خمسہ کا احاطہ کرنے اور مطمئن کرنے کی صلاحیت شاعری کے علاوہ کسی فن کی تقدیر نہیں مگر شاعری کا حال بھی انسان کا ہے کہ جہاں اس کی بہترین بنیاد میں مختلف زبانوں کے بہترین شعراء شامل ہیں وہیں کمترین وتجاہ صفت نا ہنجار متشاعروں نے اس کے ساتھ کافی ظلم اور جہالت پروری کی ہے۔ جہالت تو ان کی جنھوں نے تنگ بندی کو شاعری سمجھا یا شاعری کے موضوعات کا جنہیں علم نہیں اور ظلم انھوں نے کیا جنھوں نے صرف بیان کو شاعری کا ہنر جانا۔ مغنی تبسم صاحب کا ایک شعر میں ذرا سی لفظی تبدیلی کے ساتھ پیش کرنا چاہوں گا کہ۔

سودا جو شاعری کا تھا سر سے نکل گیا
ذوق کلام اب تو ہنر ہی میں رہ گیا

میں تمام لسانی صیقل گروں کی صیقل گری کا معترف ہوں مگر فی زمانہ بیان منظوم کے عادی متشاعروں (بروزن عادی مجرموں) کی تعداد جس طرح بڑھتی جارہی ہے، اس سے خوف زدہ بھی ہوں، یہ دراصل شعریات کا آگے آنا اور شعریت کا پیچھے جانا ہے۔ تنقید میں بھی گفتگو متن کی ساخت پر زیادہ مرتکز ہے، جب کہ "نہ ہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی" کا اعلان ہی معنی اور بیان دونوں کے انکار کا اشاریہ ہے، غالب کے دامن چھڑانے کی اس کیفیت کو اگر "شعر مرا بمدرسہ کے برد" کے ساتھ جوڑ کر پڑھے تو اعتراف کرنا ہوگا کہ کلاسکی شعراء کے یہاں بیان اور معنی کے علاوہ ایک تیسری چیز کیفیت ہوا کرتی تھی، بڑے شعراء اس کیفیت سے مکیف ہونے پر فخر محسوس کیا کرتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ سامع بھی اس کیفیت میں شاعر کے ہم کیف ہوجائے۔

مغنی تبسم صاحب کی شاعری میں بھی اسی لیے لپک محسوس ہوئی کہ ان کے یہاں کیفیت کی صورت گری کا احساس ہو:

دل سے جاتی نہیں ٹھہرے ہوئے قدموں کی صدا	آنکھ سے سوانگ رچا رکھا ہے بینائی کا
کیا سحر تھا رفیقو اس دعوتِ نظر میں	پل بھر میں زندگی سے بچھڑے بھی اور جلے بھی
اڑتی ہے راکھ درد کے خیمے کے آس پاس	تنہائیوں کی آگ میں جلنے لگا ہے کچھ

میں تکتا تھا اس کو پیاسے ہونٹوں سے　　بادل میری ناؤ ڈبونے آیا تھا
مجھے یاد آیا بچھڑ کے اب　　کوئی درد اس کی نظر میں تھا
میکدے میں نگاہِ یار لئے　　رات آتی ہے اک ادا سے ابھی
سونپ دی ہے اسے تنہائی بھی　　اب مجھے اپنی ضرورت نہ رہی
اس کو جاتا ہوا دیکھا گھر سے　　رنگ دنیا کا بدلتا دیکھا
شام کا تارا، نجم سحر　　دونوں تیرے پیاں سے

مذکورہ بالا اشعار میں کیفیت ہے اور صرف کیفیت ہے، صورتِ حال واقعہ، مشاہدہ، تجربہ، کچھ بھی تو نہیں ہے۔ لمحے جو قید کئے گئے ہیں، کیفیت جو بیان کی گئی ہے، ان کو بیان کے اسی ارتکاز اور شدت کے ساتھ نثر کیا ہے جسے صنفِ نظم میں بھی نہیں بیان کیا جاسکتا یہ اعلیٰ مرتبتی صرف غزل کو حاصل ہے کہ وہ ناقابل بیان کیفیات کو بھی بیان کرجاتی ہے۔ خسرو کی پوری غزل [نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم] صنفِ غزل کے اسی کمالِ فن اور کمالِ بیان کا روشن استعارہ ہے۔ مگر نشان خاطر رہے کہ خسرو کی غزل میں بھی اصل چیز بیان نہیں ہے بلکہ کلیدی نکتہ وہ کیفیت ہے، جس کے تحت لامکان میں بھی ایک میر محفل موجود رہتا ہے۔

یہاں سے دراصل آرٹ اور کرافٹ کے درمیانی رشتوں کی بحث شروع ہوتی ہے۔

لہٰذا میں گفتگو مختصر کرتا ہوں اور پھر مغنی تبسم کی طرف لوٹتا ہوں۔

بڑی شاعری کے اوزاروں میں فطرت ایک بہت ہی اہم اوزار ہے۔

اچھے اور اہم شعراء نے اس اوزار (فطرت) سے اپنے کام کا خام مواد خوب خوب حاصل کیا ہے، میر سے ناصر کاظمی تک یہ سلسلہ دراز ہے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شعراء نے یہ میکانزم آسمانی صحائف سے سیکھا ہے، خاص طور پر قرآن کریم کا تو یہ بہت ہی پسندیدہ طریقہ ہے کہ وہاں تمام تر موضوعی (Subjetive) خیالات ونظریات کو ثابت کرنے کے لئے معروضی (objective) مثالیں دی گئی ہیں۔ مغنی تبسم بھی فطرت (Nature) کو صناعانہ طور پر نہیں بلکہ تخلیقی طور پر استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں:

کس آسماں کے لئے مشت خاک تھی بے تاب　　ہوا کی راہ میں گردوغبار کیسا تھا
جس نے چمن اجاڑا، شاید خزاں نہ تھی　　شاید کہ تھی بہاراں، کچھ پھول تو کھلے بھی
برس رہی تھی جہنم کی آگ صحرا میں　　مگر وہ اک شجر سایہ دار کیسا تھا
جلتی دھوپ کے لشکر کے خیمے کس نے توڑ دیئے　　جھلمل کرتے تاروں کی بارات کہاں سے آئی
صبحیں کیسی آگ لگانے والی تھیں　　شامیں کیسی دھواں اٹھانے والی تھیں
برساتیں زخموں کو ہرا کردیتی تھیں　　اور ہوائیں پھول کھلانے والی تھیں
چمن میں جو کھلے تھے گل کی صورت　　صبا کے ساتھ رخصت ہوگئے ہیں
لوٹ کر شام کو طائر سارے　　جانے کیوں اپنے ہی گھر جاتے ہیں
ایک اک پیڑ اکھڑتا دیکھا　　زور جنگل میں ہوا کا دیکھا
پاس آتے ہوئے صحرا میں کہیں　　دور جاتا ہوا دریا دیکھا
دیواروں سے پھر سائے نکلے　　سورج نے پھر بات نہ مانی

پھر ہر ذرے میں دھرتی کے نکھرے جلوے کا ہکشانی
شام کے دل میں تارا ہے دیکھو کیسا نظارہ ہے
اب یہ رستہ منزل ہے اب یہ موج کنارا ہے
شعلے تو بجھ جائیں گے آگ دبی رہ جائے گی
سوکھے پتے بکھریں گے شاخ ہری رہ جائے گی

مذکورہ اشعار کی ایک دو نہیں تین طرفیں ہیں جو قاری کے متوجہ ہونے کا ناگزیر سبب ہیں ان اشعار کی اوپری سطح [Surfacial Structure] مکمل طور پر فطرت کا ایک خود ممتاز عکس پیش کرتی ہے مثلاً ہوا کی راہ میں گردوغبار کے ساتھ برس رہی تھی جہنم کی آگ صحرا میں زور جنگل میں ہوا کا دیکھا تمھیں کیسی آگ لگانے والی تھیں۔سوکھے پتے بکھریں گے۔شاخ ہری رہ جائے گی۔تقریباً ہر مصرع اور ہر شعر اپنے آپ میں فطرت کی ایک مکمل عکاسی ہے متن کی اس ساخت کو سمجھنے کے لیے شعر یا غزل کے شعر کی ایمائی کیفیت سے آشنائی شرط نہیں ہے۔اشیاء و مظاہر کے سلسلے میں ایک بیان ہے اور اس بیان سادہ کے ذریعہ بھی فطرت کے بارے میں ہمیں علم حاصل ہو جاتا ہے۔مگر اس سے آگے بڑھیے اور غزل کی ایمائی کیفیت کو پیش نظر رکھئے تو میر سے ناصر کاظمی تک کی شاعری کے پس منظر میں فطرت سے متعلق مذکورہ تمام بیانات کے پس پردہ شعر کی بنت اور بطن میں موجود مگر چھپا ہوا دوسرا معنی بھی چلمنِ تعبیر کی تیلیوں سے چھن چھن کر باہر آتا محسوس ہوگا۔اور جب متن کے اندر موجود معنی کا آپ پر انکشاف و انشراح ہو جائے گا تو پھر اچانک شعر کی تیسری جہت بھی گویا جھما کہ کرے گی کہ جب بیان کو" بیان سادہ " کہا جا رہا تھا، وہ سخن تو دراصل رازِ نشاط و غم کا پردہ ہے، شعر کے بلند قامت ہونے کے لئے جس رمز و کنایہ اور استعارہ کی بات کی جاتی ہے وہ تو یہاں بڑی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ متن کی ساخت بافت میں پرویا ہوا ہے۔

بات اگر صرف کیفیت کی صورت گری اور فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے اختصاص تک آکر رک جاتی تب بھی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ مغنی تبسم صرف سخن ساز ہی نہیں سخن شناس بھی ہیں اور اس رمز سے کما حقہ واقف ہیں کہ شعر کے متن اور بیانِ منظوم کے متن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا بات صرف یہاں تک آکر رکتی نہیں۔شاعر کا اصل اختصاص تو اس کا وہ آشوب ہے جو بغیر کسی ادارے کے اس کے اندر آتش فشاں بنتا ہے اور شاعر کی خواہش کے بغیر اس کو جلاتا بھی ہے اور بناتا بھی ہے۔مغنی تبسم کے یہاں بھی یہ آشوب عجب عجب تماشے کرتا ہے، کبھی ذاتی (Personal) ہوتا ہے کبھی غیر ذاتی (Impersonal) بن جاتا ہے مگر دونوں حالتوں میں ان کے بیان کا سارا علاقہ قاری پر پوری طرح اور ایک بار گی نہیں کھل جاتا۔

اڑتی ہے راکھ درد کے خیمے کے آس پاس
اس آسماں کے لئے مشتِ خاک تھی بیتاب
آبگینے کے ادھر باب طلسمات کھلا
اب نہیں رونے رلانے والے

تنہائیوں کی آگ میں جلنے لگا ہے کچھ
ہوا کی راہ میں گردوغبار کیسا تھا
غم کے صحرا میں تیری یاد کے آہو نکلے
رائگاں کیسے ہنر جاتے ہیں

راکھ کے ڈھیر میں پوشیدہ شرر ہے کتنا
اور اس آگ میں جل جانے کا ڈر ہے کتنا

ہے نفس تا بہ نفس مشغلہ بیتابی
خاک تا خاک بگولے کا سفر ہے کتنا

شام کے دل میں تارا ہے
دیکھو کیا نظارہ ہے

یہ بادل جو برستے ہیں
اس میں کسی کا اشارہ ہے

یادوں کا پھیلا ہے جنگل
جنگل میں بنجارہ ہے

ہجر کی شب سے ایسی تو امید نہ تھی
پہچانے گی مجھ کو اور انجان رہے گی

طناب خیمہ کے ٹوٹنے تک قیام میرا
کہ شاخ آہو پہ آج بھی ہے برات میری

مذکورہ اشعار کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ ان میں ذاتی اور غیر ذاتی [Personal and Impersonal] کی تفریق بہت مشکل ہے، مفتی تبسم کی شاعری بڑی شاعری ہو یا نہ ہو لیکن بڑی اور اچھی شاعری کی خصائص ان کی شاعری میں دستیاب ہیں۔ کیا یہ کم بڑی بات ہے؟

میں نے شاعر کے جس آشوب کا تذکرہ کیا ہے وہ آشوبِ ذات بھی ہے اور عالم آشوب بھی، یہ عالم آشوب ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی صورت ہیجان پیدا کرتا ہی ہے، اسے جی چاہے تو ترقی پسندوں کی زبان میں عصری شعور، طبقاتی کشمکش، سماجی آویزش مزاحمتی یا احتجاجی ادب کہہ لیجئے۔ اور اگر آپ پسند فرمایئے تو اسے نئے معاشرے کے تنہا آدمی کا کرب، ترسیل کی ناکامی کا المیہ، نظریئے کی موت، بازار واد اور فرد کی بے بسی، وجود کی بے مائگی، اقدار کی شکست کا المیہ، تبدیلی کی دہلیز پر کھڑی نئی صدی کی چھٹپاہٹ، کچھ بھی کہہ لیجئے مگر مسئلہ تو اسی آشوب کا ہے جو آشوبِ ذات ہو یا عالم آشوب ہیجان تو وجود ہی میں پیدا کرتا ہے، اور اس ہیجان کے پیدا ہونے کی بنیادی وجہ نوبل پرائز یافتہ چینی ادب گاؤ شنگ ژیان کے مطابق یہ ہے کہ:

> ''ادب بنیادی طور پر انسا کی اپنی اقدار کا مظہر یا منظوری ہے اور لکھنے کے دوران اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ادب بنیادی طور پر قلمکار میں اپنی روحانی تکمیلی کی ضرورت کو جنم دیتا ہے۔ اس کا معاشرے پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے، اور وہ اثر بھی قلم کار کی اپنی خواہش سے تو بالکل طے نہیں ہوتا''
>
> (سال ۲۰۰۰ کا ادب نوبل انعام حاصل کرتے وقت]

گاؤ شنگ ژیان ادب کو انسان کی جن اقدار کا مظہر یا منظوری قرار دے رہا ہے، یہ اقدار کسی منشور کا مظہر نہیں ہوتیں اور کسی خاص رویے کی منظورِ نظر نہیں ہوتیں، یہ عصر و حالات، آشوبِ ذات یا عالم آشوب کے تحت پیدا ہوتی ہیں اور پھر اولین منزل پر اس کا اظہار قلمکار کی اپنی روحانی تکمیل کا سبب بنتا ہے اور ثانوی منزل پر اس کا امکان ہے کہ معاشرے کے ادب پسند افراد ان اقدار اور رویوں سے متاثر ہو کر سوسائٹی کی بہتری کے لئے کچھ خطوط متعین کریں مگر گاؤ شنگ ژیان زور دے کر یہ بات کہتا ہے کہ ان اقدار یا رویوں کا کوئی اثر قلمکار کی اپنی خواہش سے تو بالکل طے نہیں ہوتا۔

بہر حال! ذرا دیکھا جائے کہ فنکار کا یہ آشوب اس کے فن میں اپنا اظہار کیسے کرتا ہے۔

حیرت عشق سے تدبیر کہیں ہوتی ہے
راہبر پاؤں کی زنجیر کہیں ہوتی ہے

عمر گذری ہے خریداروں کے بیچ
زندگی کرتے ہیں بازاروں کے بیچ

کانٹوں نے دعائیں دیں پھولوں نے جلایا ہے
رستے میں مسافر پر وہ وقت بھی آیا ہے

یہ اور بات ہے دنیا کو ہم بدل نہ سکے
مگر ہے یہ بھی کہ دنیا بدل ہی جاتی ہے

سرگرمیِ حیات ہے بے مقصدِ حیات
سب رہ نوردِ عشق ہیں محمل نہیں رہا

قافلے شام وسحر جاتے ہیں
جانے یہ لوگ کدھر جاتے ہیں

روز کچھ خواب جنم لیتے ہیں
اور پھر شام کو مر جاتے ہیں

ملنا سفر کا اور بچھڑنا سفر کا ہے
دنیا تو رہ گزار ہے محفل نہ کہہ اسے

ہواس ے واسطے آگے نہیں ہے
نفس کا سلسلہ آگے نہیں ہے

ٹھہر جاتا ہے بس وہ گام چل کر
یہاں سے راستہ آگے نہیں ہے

سر جھکاتا ہے کہاں تیرا مقدر ہے الگ
گھر کی دیوار جدا راہ کا پتھر ہے الگ

ایک سورج پسِ دیوار چمکتا ہے جدا
ایک سایہ اسی دیوار سے ہٹ کر ہے الگ

آسماں پر ہے عجب چاند ستاروں کا جہاں
دل میں دیکھو تو یہاں رات کا منظر ہے الگ

پاس تیرے ہوں کہ قطرہ ہے نہاں دریا میں
دور تجھ سے ہوں کہ صحرا سے سمندر ہے الگ

فرصتِ عمر ہے کم، حرفِ تمنا سن تو
بات شکووں کی نہ پوچھو کہ وہ دفتر ہے الگ

صفحاتِ بالا میں مذکور جن اشعار کے حوالے سے (مثلاً) بات کی گئی ان کا سب سے اہم امتیاز یہ ہے کہ ان اشعار کے آہنگ میں ایک خاص قسم کی نرمی اور مدہم پن ہے جو غزل کے آہنگ کی ایک بہت ہی اہم ضرورت ہے، حالاں کہ میر سے عہدِ حاضر تک بلند آہنگ بھی مسلسل غزل کا حصہ رہا ہے لیکن ناصر کاظمی، منیر نیازی، شہریار اور مغنی تبسم کے یہاں آہنگ کی نرمی [اور کسی نہ کسی حد تک اس کی سریت بھی] یہ احساس دلاتی ہے ہے کہ مبارزت طلبی کے بجائے جب کائنات سے دوستی کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور اس کے اشیاء و مظاہر کی تفہیم کی طرف طبیعت رجوع ہوتی ہے تو پھر آہنگ کی نرمی ہی کام دیتی ہے۔ اس ضمن میں کلیم عاجز کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مجھے اس مجموعہ کلام کے ایک اور اختصاص نے مہمیز کیا کہ یہاں ایک دو نہیں، تقریباً ایک درجن غزلیں [سر جھکاتا ہے کہاں تیرا مقدر ہے الگ صفحہ ۴۲ (۲) ایک ایک پیڑ اکھڑتا دیکھا صفحہ ۵۰ (۳) قافلے شام وسحر جاتے ہیں صحہ ۶۰ (۴) شام کا تارا نجم سحر صفحہ ۷۱ (۵) بس اتنی سی ہے اپنی کہانی صفحہ ۸۴ (۶) تپتے صحرا میں یہ خوشبو ساتھ کہاں سے آئی صفحہ ۸۰ (۷) شام کے دل میں تارا ہے صفحہ ۹۰ (۸) صبحیں کیسی آگ لگانے والی تھیں صفحہ ۹۲ (۹) پورا چاند اور آدھی رات صفحہ ۹۷ (۱۰) ہر سود سے ہر زیاں سے گزر صفحہ ۱۰۳ (۱۱) ایسی ہیں جنہیں غزلِ مسلسل تو کہا ہی جاسکتا ہے مزید برآں یہ کہ ان میں تسلسل کے ساتھ حزن کا ایک بہت ہی مدھم مگر دل کو بے چین کردینے والا راگ سنائی دیتا ہے۔ عام زبان میں کہا جائے تو ہر شعر میں ایک ہوک اٹھتی ہے

اور درد کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رواں ہے۔

مغنی تبسم کو جس نے صرف دیکھا ہوگا پڑھا نہیں ہوگا وہ اس آگ کو محسوس ہی نہیں کر سکے گا جو ان کے اندر بہت دور تک نفوذ کئے ہوئے ہے۔

مغنی تبسم کا ایک امتیاز خاص یہ بھی ہے کہ انہوں نے چھوٹی بحر میں خوب شاعری کی ہے، تقریباً ۷۰ غزلوں میں ۴۵ سے زیادہ چھوٹی بحر میں ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعہ کلام کا تیس فی صد حصہ چھوٹی بحر میں شاعری پر مشتمل ہے، یاد آیا کہ حسن عسکری نے چھوٹی بحر کے بارے میں کچھ لکھا ہے ان کی کتاب ''ستارہ یا بادبان'' کھولی تو پورا مضمون ہی پڑھ ڈالا، میرے مطلب کی باتیں یہ ہیں کہ:

(۱) چھوٹی بحر میں دل کا معاملہ ایسی بے ساختگی سے کھلتا ہے کہ سارے تکلفات ہر طرف ہو جاتے ہیں۔

(۲) چھوٹی بحر تو لوہے کا کولھو ہے، گلاب ڈالو تو عطر نکلے گا، یہاں آدمی کی اصلیت چھپائے نہیں چھپتی۔

بحمد اللہ کہ میرے ممدوح مغنی تبسم صاحب کی چھوٹی بحر والی غزلوں کا کم از کم ساٹھ فی صد حصہ تو ضرور ہی عسکری صاحب کے قول و خیال کے مصداق ہے۔

اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ یہ شاعری ایک آشوب آشنا فرد کا اظہار یہ ہے اور اس اظہار کو آپ المیہ یا طربیہ شاعری کے خانوں میں فٹ نہیں کر سکتے یہ تو حزنیہ ہے اور کہیں کہیں سریہ بھی مگر یہ سارا اظہار مہذب اور ڈسپلنڈ ہے، کسی مقام پر بھی یہ اظہار چیلنج نہیں بنتا یہ ایک طرح کی خود کلامی ہے، شاید شاعر کی نظر میں اس کا قاری اس کا وہ گہرا دوست اور ہم راز ہے جس سے راز کی باتیں آہستہ آہستہ کی جاتی ہیں۔

نصابی یا علمی تنقید کے پیمانے پر کھا جائے تو یہاں بیان و ابلاغ کی خوبیاں بھی بیش از بیش دستیاب ہیں۔ مثلاً ایک شعر سامنے رکھئے۔

آبگینے کے ادھر باب طلسمات کھلا
غم کے صحرا میں تیری یاد کے آہو نکلے

اب جو شخص طلسم و طلسمات کی مخصوص اصطلاح سے واقف ہے اور اس میں آبگینے، آئینے اور شیشے کا جو کردار ہے، اور تندی صہبا سے آبگینے کے پگھلنے کی جو روایت ہے، اس پس منظر میں اگر واقف طلسمات ایک ایسے آدمی کا تصور کرتا ہے جس نے جام اٹھایا تو جام غائب ہو گیا اور ایک جادوئی نگر کا دروازہ کھل گیا۔ اور پھر وہ آدمی اس جادوئی نگر کی سیر کرنے لگتا ہے تو مختلف مناظر اس کی حیرانی اور الم کا سبب بنتے ہیں۔

درماندہ تخیل میں ویرانے بھٹکتے ہیں — ہر سمت دھند لکا ہے، شعلہ ہے نہ سایہ ہے
صدائے پا بھی نہیں اب کہ ٹوٹے سناٹا — یہاں تو شہروں کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں
فضا میں نغمۂ آوازِ پا ہے میرے لئے — کراں سے تابہ کراں ایک ندا ہے میرے لئے
ہر ایک سمت سے سنگ صدا کی بارش تھی — میں چپ رہا کہ یہی کچھ مال میرا تھا
دل سے جاتی نہیں ٹھہرے ہوئے قدموں کی صدا — آنکھ نے سوانگ رچا رکھا ہے بینائی کا

رستہ تکتے رہنا ساری رات کبھی　　آہٹ سن کر قدموں کی ڈر جانا بھی
خجالت در گزر سے لب پر دعا نہ ٹھہری　　دیر ساعت سے لوٹ آئی ہے رات میری
رستوں میں زندہ تھی قدموں کی چاپ　　دستک ہوئے وفا سے اب کیوں خالی ہے
شاید کہ سراغ اپنا پالے　　آئینے کے گھر میں دیکھ جا کر
برس رہی تھی جہنم کی آگ صحرا میں　　مگر وہ ایک شجر سایہ دار کیسا تھا

اس جادوئی نگر کے مختلف مناظر میں ویرانہ ہے اور سناٹے، اور اس سناٹے میں منطقی طور پر جو عنصر خواہش سب سے زیادہ طاقت اور فعال ہے، وہ بس آہٹ اور دستک ہے۔ یہ آہٹ کبھی آتی ہی نہیں، آتی ہے تو ڈراتی بھی ہے، اور پھر اسی آہٹ کے سہارے شاعر زندہ بھی رہتا ہے، صحر کے جہنم میں یہی ایک شجر سایہ دار ہے، اور اس مقام سے پھر اس شعر کی طرف لوٹتے ہوئے اندازہ ہوگا کہ آبگینے مین جب باب طلسمات کھلا تو وہاں جادوئی مناظر اور خیالی ہیولے تو بہت تھے مگر اس جادوئی نگر میں جب شاعر کسی آہٹ کے پیچھے چلتا ہے تو بالآخر معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ تو ایک ہرن کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ یہ ہرن یاد کا تھا یہ خاص بات نہیں ہے سوال یہ ہے کہ صحرا میں ہرن کیسے آ گیا، دراصل شاعر باب طلسمات کے سہارے جس جادوئی نگر میں داخل ہوا وہاں اسے وہ پری زاد نظر آ گیا جس کے لئے قیس صحرا چھانتا تھا مگر اشکال اب بھی باقی ہے کہ صحرا میں ہرن کیسے نظر آ گیا، مجھے فراق یاد آ رہے ہیں:

اتنی وحشت؟ اتنی وحشت؟ صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری، دور بہت کیوں بھاگو ہو؟

اور اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے؟ جادو ہیں تیرے نہیں غزالاں سوں کہوں گا۔ عرض یہ ہے کہ شاعر کے لئے تو غم کا صحرا مقدر ہے مگر چوں کہ بات باب طلسمات کی ہے اس لیے بلاغت کے نقطہ نظر سے طلسمی ماحول میں غزالی آنکھوں کے عاشق کو تو ہرن ہی ہرن نظر آئے گا۔ میں نے گزشتہ صفحات میں کہیں عرض کیا ہے کہ مغنی تبسم کے بیان کا سارا علاقہ قاری پر پوری طرح اور یک بارگی نہیں کھل جاتا۔ میں اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مغنی تبسم قاری اور سامع پر بہت آہستہ آہستہ کھلتے رہیں مقابل میں جوہر قابل کو ہونا شرط ہے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ مغنی تبسم کی شاعری نہ تو کسی امی شاعر کی شاعری ہے اور نہ ہی کسی علم زدہ پروفیسر یا ناقد کا شعری بیانیہ ہے۔ یہ ایک آشوب آشنا فرد کا اظہار یہ ہے جو شعری اور ادبی نظام کے تمام تر سیاق و سباق سے واقف ہے اور جس کے آفاق بھی وسیع ہیں۔

یہ اعتراف ادبی ایمانداری کے مترادف ہے کہ ''درد کے خیمے کے آس پاس'' کی شاعری کو اور خود مغنی تبسم کو کسی طور پر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اردو کی اچھی، قابل مطالعہ، یاد رکھے جانے کے لائق، شاعری کے مخصوص (نرم) آہنگ میں رل مل کے سامنے آنے والی شاعری کا جب بھی تذکرہ ہوگا تو مغنی تبسم کی شاعری کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔

●●●

میرے بعد میری کتابوں کا کیا ہوگا

بیدار بخت

● پچھلے دنوں 'ذہن جدید' نے اردو دنیا کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی تھی کہ اردو معاشرے اور افراد خاندان کی بے خبری کا اور کم علمی کی بناء پر کئی ادیبوں کا کتابوں کا ذاتی ذخیرہ ان کی موت کے بعد تتر بتر ہو کے ضائع ہو گیا یہ زیاں آج بھی ہو رہا ہے اور ذاتی کتب خانوں کے خرد برد ہو جانے یا ان کے ردّی خانوں کا حصہ بننے کا خطرہ آج بھی موجود ہے سی می ناروں اور اردو عالمی کانفرنسوں جیسی سرگرمیوں پر روک لگا کے "قومی اردو لائبریری' کی تجویز پر اردو دنیا سنجیدگی سے غور کرنے اور اسے ٹھوس صورت دی جائے تو اب بھی ذاتی کتب خانوں کو بچایا جاسکتا ہے ہم نے سارے دروازوں پر دستک دے کر دیکھ لی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی ہماری تجویز اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دی۔

ہندوستان کی اردو دنیا سے باہر غیر اردو داں ملک کس ہمدردی اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے یہاں اردو کے ذاتی کتب خانوں کو اپنا اثاثہ سمجھ کر اسے محفوظ کرنے کا جتن کرتے ہیں اس کا اندازہ جناب بیدار بخت کی اس تحریر سے بخوبی ہو سکے گا۔ (مرتب)

کچھ سال پہلے جب آپ ٹورنٹو تشریف لائے تو میرے کتب خانے کی اردو اور فارسی ادب کی کتابیں دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہندو پاک سے باہر اتنی کتابیں جمع ہو گئیں۔ آپ نے ایک اہم سوال کیا کہ میرے بعد میری کتابوں کا کیا ہوگا۔ آپ نے یہ بھی اصرار کیا کہ اس سوال کا جواب میں زبانی نہ دوں بلکہ لکھ کر دوں کہ اسے شائع بھی کیا جاسکے۔ اس سوال نے مجھے مدت سے پریشان کر رکھا تھا۔ ہمارے بچے بس واجبی سی اردو جانتے ہیں۔ انھیں میری اردو فارسی کی کتابوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اپنے جیسے کئی لوگوں کی کتابوں کا انجام میں دیکھ چکا ہوں۔ سنا ہے کہ کراچی کے مرحوم حکیم محمد سعیدی کہا کرتے تھے کہ ان کا بڑا کتب خانہ ان لوگوں کی ناخلف اولادوں کی وجہ سے تھا جو اپنے والدین کے جانے کے بعد ان کی کتابیں کباڑیوں کو بیچنے کو تیار تھے۔ جیسے ہی حکیم صاحب کو ان کتابوں کے بارے میں خبر ملتی تھی، کباڑیوں سے پہلے وہ کتابیں اونے پونے داموں میں خرید لیتے تھے۔

خود ہمارے صوبے میں ایک عبرت ناک مثال پروفیسر مقبول عزیز کے کتب خانے کی ہے۔ پروفیسر موصوف اونٹیریو، کینڈا، کی مکماستر یونیورسٹی (McMaseter University) میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ان کے پاس انگریزی اور اردو کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ دو چار سال پہلے ان کی بے وقت

وفات کے بعد ان کے بچوں نے ان کی کتابوں کو میکماسٹر یونیورسٹی کو دینا چاہا، مگر اس نے انکار کر دیا، اس لیے کہ جنوبی امریکہ کی لائبریریاں عام طور سے بن مانگی کتابیں لینے سے گریز کرتی ہیں۔ اور اگر لے بھی لیں تو ایسی کتابیں جلد ہی سستے داموں میں 'سیل' پر بیچ دی جاتی ہیں۔ کوئی پندرہ سال پہلے مجھے ایک کینڈین لائبریرین نے بتایا تھا کہ ہر کتاب کو لائبریری کی شیلف میں رکھنے کے لیے لائبریری کو کوئی بیس ڈالر، کتاب کی قیمت کے علاوہ، خرچ کرنے پڑتے تھے۔ اب تو یہ خرچ اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔ ان کے بعد پروفیسر مقبول کی کتابیں ان کے گھر کے باہر فٹ پاتھ پر رکھ دی گئیں کہ کوئی بھی اٹھالے، یا ریسائکلنگ (recycling) والے انھیں لے جائیں۔

پہلے میں نے بھی سوچا تھا کہ وصیت چھوڑ جاؤں گا کہ میرے مرنے کے بعد میری کتابیں کسی لائبریری کو دے دی جائیں، یا ہندوستان پاکستان کی کسی لائبریری کو بھیج دی جائیں۔ پروفیسر مقبول کی مثال کے بعد یہاں کسی لائبریری کو بغیر معاہدے کے کتابیں دینے کا خیال تو فضول ہو گیا۔ ہندوستان، پاکستان کتابیں بھیجنے کا خرچ کون دیگا؟ وہاں بھی قبولیت ہوگی یا نہیں؟

جنوری ۲۰۰۵ء میں، میں نے اور کاموں کو پس پشت ڈال کر ایک روز اپنے کتب خانے کی ہر شیلف کی تصویر لی۔ ہر تصویر کے نیچے مختصراً لکھا کہ کتابیں کس نوعیت کی ہیں۔ تصویروں کے ساتھ ایک خط یونیورسٹی اوف ٹورونٹو (University of Toronto) کی روبارٹس (Robarts) لائبریری کو ۹ جنوری ۲۰۰۵ء کو لکھا کہ میں اپنی کتابیں اپنی وصیت میں لائبریری کے نام کرنا چاہتا ہوں۔ خط ملنے کے کوئی ہفتہ بھر بعد لائبریری کے ایک افسر کا فون آیا کہ ان کے کچھ اراکین میرا کتب خانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد لائبریری نے فیصلہ کر لیا کہ وہ میرا 'تحفہ' Gift of residual interest کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ کئی شرائط میں ایک میرے لیے سب سے مشکل یہ تھی کہ میں سب کتابوں کی تفصیلی فہرست (catalogue) تیار کروں۔ 'مگر لائبریری یہ کام کیوں نہیں کر سکتی؟' 'اس لیے کہ اس میں خرچ بہت آئے گا'۔ فہرست اس لئے ضروری تھی کہ معاہدے سے پہلے لائبریری کو یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون سی کتابیں لے رہی ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں اپنے انجینرنگ اور یونیورسٹی کے کاموں میں بہت مصروف رہتا ہوں، مگر میں نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور طالب علموں کی اجازت سے کتابوں کی تفصیلی فہرست پر سارا وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔ طریق کار یہ تھا، کہ میں نے اپنے کتب خانے کی طرح فہرست کو بھی کئی خانوں میں تقسیم کر دیا، اور ہر خانے کی کتابوں کی یہ تفاصیل کمپیوٹر پر درج ہونے لگی: (۱) مصنف یا جس کے بارے میں کتاب لکھی گئی ہو، اس کی ولادت کا سال۔ اور وہ شخص زندہ نہ ہو تو اس کی وفات کا سال بھی، (۲) کتاب کا نام، (۳) پبلشر کا نام اور پتہ، (۴) کتاب کی اشاعت کا سال، اور (۵) کتاب کی صفحات۔ یہ سب تفاصیل لائبریری نے تو نہ مانگی تھیں، مگر میں نے سوچا کہ اگر فہرست بنانی ہی ہے تو کیا حرج ہے کہ اس میں یہ معلومات

بھی شامل کر لی جائیں۔ پوری فہرست بنانے میں مجھے کوئی تین مہینے لگے۔

کتب خانے کی کتابیں ۲۳ خانوں کے ذیل میں آتی ہیں۔ مثلاً پہلے خانے میں ان اردو شاعروں کی یا ان سے متعلق کتابیں ہیں جو ۱۹۳۰ سے پہلے پیدا ہوئے۔ پہلی کتاب جمیل جالبی کی ترتیب دی ہوئی مثنوی نظام دکنی۔ نظام دکنی پندرویں صدی میں پیدا ہوا تھا۔ کتاب کو جالبی صاحب 'اردو زبان کی پہلی تصنیف' کہتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی کی کتاب 'اردو کا ابتدائی زمانہ' کے بعد تو شاید اس کتاب کو 'اردو' کی کتاب نہ مانا جائے، مگر یہ کتاب ہے اسی زبان کی ایک شکل میں جسے ہم آج اردو کہتے ہیں۔ خانہ نمبر ایک کی آخری کتابیں مظہر امام کی ہیں، جن کی پیدائش ۱۹۳۰ کی ہے۔ اس خانے میں ۱۳۱۵ کتابیں ہیں، جن میں سے ۲۸۶ کتابیں غالب کی یا غالب پر ہیں۔ ان میں سے بہت سے غالب کے دیوانوں کے مختلف ایڈیشن اور اس کی اشعار کی شرحیں بھی۔ پہلے خانے کی کتابیں، کتب خانے میں ایک جگہ رکھی ہیں سوائے اس کے کہ کچھ شاعروں کی کتابوں کے شیلف الگ ہیں، مثلاً پرانے شاعروں میں غالب، میر اور انیس اور بعد کے شاعروں میں اقبال اور فیض۔ فہرست کی طرح کتب خانے میں بھی کتابیں شاعروں کے سال ولادت کے حساب سے رکھی گئی ہیں۔

دوسرے خانے میں ان اردو شاعروں کی کتابیں ہیں جو ۱۹۳۰ کے بعد پیدا ہوئے۔ یہ کتابیں تعداد میں ۳۳۵ ہیں۔ فہرست تو کتابیں شاعروں کے سال ولادت کی ترتیب سے درج ہیں، مگر کتب خانے میں حروف تہجی کے اعتبار سے چنی گئی ہیں۔

تیسرے نمبر کے خانے میں ان شاعروں کی کتابیں ہیں، جنھوں نے اپنی شناخت مغرب میں بنائی تعداد میں ۳۸۔ چوتھے خانے میں مزاحیہ اور فحش شاعری کی کتابیں ہیں، تعداد میں ۲۷۔ پانچویں خانے میں اردو شاعری کے گلدستے ہیں، تعداد میں ۱۱۸۔

فارسی کی کتابیں، تقریباً سب قدیم اور جدید شاعری پر، خانہ نمبر ۲۹ میں ہیں، تعداد ۲۸۸۔ اردو فکشن کی ۲۹۳ کتابیں ہیں، تنقید کی ۳۵۶۔ ہندستانی موسیقی پر اردو، ہندی اور انگریزی کی ۴۷ کتابیں ہیں۔ ہندو پاک کی سیاسی ثقافتی اور مذہبی تاریخ پر اردو اور انگریزی کی ۲۸۹ کتابیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے نزدیک میرے کتب خانے کی سب سے اہم کتابیں لغتیں اور انسائکلو پیڈیا ہیں، (بالترتیب خانہ نمبر ب ۲۹ اور ۳۰ میں ہیں، اور جن کی تعداد ۲۸۸ اور ۱۱۹ ہے) یہ سب کتابیں میرے لکھنے کی میز کے سامنے والی شیلف میں رکھی ہیں تاکہ میں ان سے آسانی سے استفادہ کرسکوں۔ سامنے کی شیلف پر ان جدید اردو شاعروں کے مجموعے بھی ہیں جن سے مجھے خاصا شغف ہے مثلاً سینیئر شاعروں میں میراجی، اختر الایمان، راشد، منیب الرحمان اور نسبتاً نئے شاعروں میں شہریار، محمد علوی، زبیر رضوی، شمس الرحمان فاروقی، احمد مشتاق ہیں۔ میں بہک رہا ہوں۔ اس تفصیل سے شاید نہ آپ کو دلچسپی ہوگی نہ آپ کے پڑھنے والوں کو۔

ایک خانے (نمبر ۲۱) میں اردو کے اچھے رسالوں کی فہرست ہے۔ پرانے رسالوں میں ۱۹۱۱ کے

'زمانہ' سے لے کر ۱۹۴۷ کے 'ساقی' تک کے بہت سے شمارے ہیں۔ 'نقوش' کے سب اہم نمبر ہیں۔ ادب لطیف، شاہراہ، سیپ فنون اور اوراق کے بہت شمارے ہیں۔ معیار کے تقریباً سب، یعنی پانچ چھ شمارے ہیں۔ شبخوں کی پوری فائل ہے، جس میں کچھ شماروں کی فوٹو کاپی فاروقی صاحب کی مہربانی سے ملی۔ آج، شعر و حکمت اور ذہن جدید کی بھی پوری فائلیں (پچھلے آٹھ دس سالوں کی) ہیں۔ پورے اردو رسالوں کی تعداد ۷۸۹ ہے۔ ایسے رسالے جن کی نوعیت ہنگامی ہو، میں کتب خانے میں نہیں رکھتا، پڑھ کر دوستوں میں بانٹ دیتا ہوں۔

تفصیلی فہرست میں ۵۴۱۰ کتابیں ہیں۔

۵ مئی ۲۰۰۶ کو یونیورسٹی اوف ٹورونٹو اور میں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے میری سب کتابیں جو تفصیلی فہرست میں درج ہیں اب یونیورسٹی اوف ٹورونٹو کی ملکیت ہیں۔ یہ کتابیں میری تحویل میں جب تک رہیں گی جب تک میں زندہ رہوں یا جب تک میں چاہوں۔ میری ذمہ داری یہ ہے کہ میں کتابوں کو اپنے گھر میں اچھی حالت میں، یعنی مناسب حرارت اور رطوبت کے ماحول میں، رکھوں۔ کتابوں کا بیمہ یونیورسٹی کی ذمہ داری ہے۔ وقتاً فوقتاً یونیورسٹی کا عملہ میرے گھر آ کر کتابوں کی جانچ پڑتال کرے گا۔ اگر میں کسی کو کتاب مستعار دوں تو اس کی اطلاع یونیورسٹی کو ضرور دوں۔

یونیورسٹی نے مجھے اپنی دو مہریں اور ایک ان مٹ سیاہی کا پیڈ دے رکھا ہے کہ ان دونوں مہروں میں سے ایک ہر کتاب پر ایک خاص جگہ ثبت کردوں (مہروں پر ۵ مئی ۲۰۰۵ کی تاریخ ہے) میں نے یہ کام شروع تو کر دیا ہے مگر ابھی تک سب کتابوں پر مہر نہیں لگی ہے۔ یونیورسٹی کی لائبریری کی مہر کے علاوہ میں نے اپنے بچوں کے اصرار پر ہر کتاب کے پہلے صفحے پر اپنے نام کی مہر ثبت کردی ہے۔ یونیورسٹی اوف ٹورنٹو نے اردو فارسی کتابوں کا تحفہ خاص طور پر اس لیے قبول کیا کہ ان کے پاس پہلے سے ہی ان کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔

ان سب سے اہم بات، جس کے لیے میں نے یہ خط لکھنا شروع کیا ہے۔

یونیورسٹی میری کتابوں کی قیمت متعین کرنا چاہتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ قیمت متعین کرنے والا شخص ہر کتاب کو خود دیکھ کر قیمت متعین کرے۔ ٹورنٹو کے کئی اردو والوں سے رجوع کیا گیا۔ کچھ راضی بھی ہوئے مگر کام کا پھیلاؤ دیکھ کر انکار کر دیا۔ آخر میں ایک صاحب نے اس کام کا بیڑہ اٹھالیا۔ انھوں نے دیدہ ریزی سے تخمینہ لگایا کہ تفصیلی فہرست کی تمام کتابوں کی قیمت ۸۳،۳۵۳ کنیڈین ڈالر (آج کی شرح سے کوئی ۳۴ لاکھ روپے) لگایا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے پچاس سال کے ذخیرے کی قیمت زیادہ تھی، مگر کیونکہ میرا مقصد پیسہ نہیں تھا، میں قیمت کے تخمینے پر فوراً راضی ہو گیا۔

یونیورسٹی کا gift of a residual interest کی قیمت کے تخمینہ لگانے کا ایک قاعدہ ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی تحفے کی آج کی قیمت A ہے تحفہ دینے کی عمر B سال ہے، اور اس کی زندگی کا لگ بھگ اندازہ C سال ہے، تو کٹوتی کر کے اس کی عمر کے آخر میں اس کے تحفے کی قیمت آج کے پیسوں میں اس طرح نکالی جائے گی: A/(1+0.045)^(C-B) اس قاعدے میں 0.045 سال کا discount

rate ہے۔ ۲۰۰۵ میں میری عمر ۶۵ سال کی تھی اور اوسط مجھے کوئی ۸۱ سال کی عمر تک جینا چاہئے۔ اوپر لکھے ہوئے قاعدے کی رو سے میرے تحفے کی قیمت آج کے کینیڈین ڈالر میں 44,292 (یعنی تقریباً کوئی ۱۸ لاکھ روپے) ہوئی۔

یونیورسٹی نے مجھے 44,292 کینیڈین ڈالر کی charitable donation (اس اصطلاح کا اردو ترجمہ نہیں مل سکا) رسید دی ہے۔ انکم ٹیکس کے لئے میں donation کی رقم کو پانچ سال پر پھیلا سکتا ہوں۔ اس رقم کو میں اپنی سالانہ کمائی سے وضع کر کے اپنا انکم ٹیکس کم کرا سکتا ہوں، اس شرط پر میری سالانہ کمائی اس سال کی donation کی رقم سے تقریباً ۴۰ فیصدی زیادہ ہو۔

آپ کا سوال کہ میرے بعد میری کتابوں کا کیا ہوگا، بہت اہم ہے۔ ہم اردو والوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کے پاس چالیس پچاس سال کا جمع کیا ہوا اردو کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے، مگر ان کے بچے اردو جانتے نہیں ہیں اردو میں اپنے والدین جیسی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر کتابوں کے ذخیرے کا مالک بہت مشہور ہے اور اس کے وارثوں میں دور اندیشی ہے تو اس کی کتابیں کسی اچھی یونیورسٹی کی لائبریری میں اس کے نام پر قائم کیے ہوئے گوشوں میں محفوظ ہو جائیں گی، جیسا کہ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی کتابیں علیگڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ مگر دوسری صورت میں ان کے ضائع ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ اگر تحفہ دینے کا وہ نمونہ جو میں نے اوپر پیش کیا ہے اپنایا جائے تو ممکن ہے لوگوں کو ترغیب ملے کہ اپنی رخصتی سے پہلے اپنی کتابوں کا انتظام کر دیں۔ یہ واضح ہو کہ کسی لائبریری کو کتابوں کا تحفہ اچانک نہیں دیا جا سکتا۔ اس کام میں سال دو سال تو لگ ہی جاتے ہیں۔

لائبریری کو کتابیں دینے کے باوجود، میری زندگی کے طریقے میں کوئی فرق نہیں پڑا سوائے اس کہ اب کتابیں مجھے زیادہ احتیاط سے رکھنی پڑیں گی، اور کتابیں مستعار دینے میں بھی سخاوت کم دکھانی پڑے گی۔ مگر پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ میرے وارثوں کو کتابوں سے چھٹکارا پانے کے لئے کوئی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ عمر کی شام میں مجھے کم انکم ٹیکس دے کر کچھ پیسے بچ جائیں گے کہ ان سے کچھ اور کتابیں خریدی جا سکیں!

میری معلومات کی حد تک ہندوستان اور پاکستان میں کتابوں کو سرکاری اداروں کو تحفتاً دینے کی وہ سہولت نہیں ہے جو کینیڈا میں ہے۔ اگر ہے تو لوگ اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟ اور اگر نہیں ہے تو اس لئے کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟

مئی ۲۰۰۶ کے بعد سے میں نے یہ وتیرہ اختیار کر لیا ہے کہ کتاب کھولنے سے پہلے اس کی تفصیلات ایک اور فہرست میں درج کر دیتا ہوں۔ اس فہرست میں ۲۰۰ سے زیادہ کتابیں ہو گئی ہیں۔ جب ان کتابوں کی تعداد مناسب حد تک بڑھ جائے گی تو انھیں بھی یونیورسٹی اوف ٹورنٹو کی لائبریری کو پیش کروں گا۔

پس نوشت: یونیورسٹی اوف ٹورنٹو سے میں نے اجازت لے لی ہے کہ اپنی کتابوں کی تفصیلی فہرست (catalogue) کو میں کسی کو بھی دے سکوں۔ فہرست مائکروسوفٹ کے پروگرام Excel میں ہے۔ اگر کسی کو اس کی ضرورت ہو تو مجھے bbakht@rogers.com پر لکھیے، میں اسے بھیج دوں گا۔

ادب کا نوبیل انعام

ڈورس لیسنگ کو انعام تاخیر سے ملا

● 1901 میں نوبیل انعام دیے جانے کی ابتدا سے اب تک دنیا کی گیارہ عورتوں کے حصہ میں یہ انعام آیا ہے۔ ۲۲راکتوبر ۱۹۱۹ء کو ایران کے شہر خرمان شاہ میں پیدا ہونیوالی اور بچپن سیاہ فام افریقہ میں گزارنی والی برطانیہ کی 88 سالہ ادیبہ ڈورس لیسنگ (Doris Lessing) نوبیل انعام پانے والی قطار کی گیارہویں خاتون ہیں سویڈش اکادمی نے ان کے توصیف نامے میں یہ بات بڑے اصرار سے کہی ہے کہ وہ عورتوں کے مسائل کو ایک ادیب کی آنکھ سے دیکھنے والی ایک اہم خاتون ادیبہ ہیں۔

جب انعام کا اعلان ہوا تو برطانوی میڈیا والوں نے اپنا رخ ان کے گھر کی طرف موڑ دیا ڈورس اس وقت بازار گئی ہوئی تھیں جب وہ گھر لوٹیں تو گھر پر میڈیا والوں کا ہجوم دیکھا تو خریدے ہوئے سامان کی ٹوکری زمین پر رکھ دی اور سر پکڑ کے بیٹھ گئیں اور طنزاً بولیں ''یہ تو پچھلے تیس برس سے ہو رہا ہے'' ڈورس کو تاخیر سے دیئے گئے انعام کے بارے میں سویڈش اکادمی کے مقامی سکریٹری نے وضاحت کی'' کچھ فیصلے کرنے میں آپ کو لمبا عرصہ لگ جاتا ہے''۔ برطانوی کیمونسٹ پارٹی میں شامل رہی لیسنگ کی سب سے مشہور تخلیق The Golden Note Book نے 1962 میں انھیں عورتوں کو اپنی تحریروں کا مرکز بنانے والی ادیبہ کے طور پر خاصا مشہور کر دیا تھا اور یہ ان کے لکھے ادب کی پہچان بھی بن گئی تھی لیکن لیسنگ کو اپنے لیے وضع کی گئی اس سیاسی رنگ لیے ادبی پہچان کو قبول کرنے میں ہمیشہ تامل رہا لیکن اسے کیا کہا جائے کہ 'عورت واد' میں سرگرم حصہ لینے والوں کے لیے لیسنگ کی 'گولڈن نوٹ بک' مسلسل فیضان اور ایک تحریک کا سبب بنی رہی اور کہا گیا کہ اس میں عورت اور مرد کے رشتوں پر بڑے موثر انداز میں روشنی پڑتی ہے اس ناول میں لیسنگ نے ایک نئی تکنیک کو اختیار کیا ہے۔ لیسنگ کی سب سے بڑی طاقت اس کے اظہار کی سچائی اور صاف گوئی ہے مصلحت یا کسی بھی حقیقت کے اظہار سے گریز کرنا اس کا تخلیقی مسلک نہیں رہا لیسنگ نے جنوبی افریقہ میں رہ کر اپنی بلوغیت کے دنوں میں جو سیاہ و سفید کا بھید بھاؤ دیکھا تھا وہ بھی اس کے ناولوں میں در آیا ہے ایٹمی دھماکے اور جنگ کے خلاف اس کی مزاحمت اس کے لکھے ادب کا دوسرا موضوع ہے، ہاں، اس کے ادب کا حاوی موضوع

اپنے زمانے کی عورت پر ہونے والے جبر اور زیادتیوں کے خلاف اس کی انصاف طلبی ہے۔ اجتماعی انسانی معاشرے سے ادیب کے تعلقات پر بھی اس کی نظر رہی ہے لیسنگ کی اب تک کی شائع شدہ کتابوں پر نظر ڈالی جائے تو لیسنگ کی تخلیقی سرگرمی بڑی پرہجوم نظر آتی ہے 25 سے زائد ناولوں، کہانیوں اور خاکوں کے کئی مجموعے، ایک ڈرامہ، نظموں کا ایک مجموعہ اور غیر فکشن کی حامل چھ کتابیں لیسنگ نے اپنی ساٹھ سالہ سرگرم ادبی زندگی میں لکھی ہیں اس کی تحریروں میں انسان کی توقیر بڑا اہم درجہ رکھتی ہے معاشرے میں نظر آنیوالی اخلاقی گراوٹ پر اس کا ناول The Grass is Singing کا ذکر ضروری ہے یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو شہر میں پلی بڑھی ہے اس کی شادی ایک کسان سے ہوجاتی ہے اور وہ سیاہ فاموں کی نگرانی اور انھیں قابو میں رکھنے پر مامور کردی جاتی ہے یہاں وہ سیاہ فاموں کے تئیں اذیت پسندی کو اپنا لیتی ہے اور بالآخر قتل کردی جاتی ہے The Children of violence کے نام سے پانچ ناولوں کی سیریز کے مرکزی کردار میں Martha Quest نامی کردار بڑی حد تک مصنفہ کی زندگی کی ایک متوازی تمثیل ہے اس میں انگریز اور افریقیوں کی ایک دوسرے پر عدم اعتمادی کو ڈورس نے نفسیاتی زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

Canopas in Argos Archives کا موضوع سائنس ہے اس میں مختلف معاشروں کے ارتقائی عمل نظر آتے ہیں (Memoirs of Survivor) میں رجعت پسندی، وحشی پن اور جبریت کا وہ بول بالا ہے جو کسی بھی اصول اور آدرش طرز عمل سے خالی معاشرے میں دکھائی دیتا ہے وہ اس ناول کا موضوع ہے ناول کسی حد تک Horor ناول کے قریب آجاتا ہے اور سماجی مقصدیت کی کمی کھٹکنے لگتی ہے ناول کی فضا اداس اور بوجھل کردینے والی ہے مذکورہ ان ناولوں کے علاوہ لیسنگ کے جو اور ناول قابل ذکر ہیں ان میں The fifth child the diaries of jame اور The child in question good tourist شامل ہیں۔

ناولانہ رپورٹنگ کے بادشاہ۔ نارمن ملر

● حال ہی میں 84 سال کی عمر میں وفات پانے والے امریکی ادیب نارمن ملر نے اپنی زندگی کے پر بہار دنوں میں خود کو امریکی ادب کا ضمیر اور ادب کی مختلف اصناف میں ہل چل مچانے والے ادیب کی شہرت دلادی تھی نار[illegible] ملر نے بڑی دلچسپ اور افسانوی [illegible] جی تھی۔ چھ بار شادی رچانے والے [illegible]

سگریٹ نوش نے شراب کی ایک پارٹی میں اپنی دوسری بیوی کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا تو بچوں کے ڈیڈی ملر نے نیویارک کے میئر کا عہدہ بھی سنبھالا تھا ایک سے زیادہ فلاپ فلمیں بنائیں اور صحافت کے پیشے میں بھی اپنے قلم کا لوہا منوایا گلائی ڈر بھی اُڑائے اور ایک پیشہ ور کے طور پر باکسنگ کے رنگ میں قدم بھی رکھا فحش شاعری سنانے پر Man hatton YWHA سے موصوف نکالے گئے اور ایک معاصر ادیب Ore vidal کے ساتھ ایک دن جم کے ہاتھا پائی بھی کی اور عورتوں کی آزادی کی پرزور مخالفت میں اپنی احتجاجی آواز ہمیشہ اونچی رکھی ادبی جرنلزم میں نارمن ملر نے جس کتاب کے ذریعے اپنی دھاک بٹھائی وہ تھی۔ The Armies of the Night ملر نے دوبار Pulitzer انعام بھی حاصل کیا اس کے لکھے ناولوں کی خاصی تعریف ہوئی مگر اس کا کوئی ناول امریکی ادب کا شاہکار ناول نہ بن سکا۔

نیوزویک کے ایک مبصر نے نارمن ملر کے تخلیقی جینئس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ملر کے پاس ایک ایسا قدرتی اسلوب ہے جو کسی دباؤ میں بھی ٹوٹتا یا لچکتا نہیں اس کے کرداروں میں حقیقی خون کی روانی انھیں چاق چوبند رکھتی ہے ملر میں تخلیقی سطح پر تجربات کرنے کا حوصلہ تھا ۳۱ رجنوری 1923 کو نیوجرسی میں پیدا ہونے والے نارمن ملر نے 1943 میں ہارورڈ سے انجینئرنگ سائنس کی ڈگری حاصل کی تھی یہیں وہ فوج میں بھرتی ہوا اور اسے انفنٹری مین کی حیثیت سے فلپائن بھیج دیا گیا یہاں ملر کو فوج کی زندگی کو تفصیل اور گہری نظر سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور یہیں اس نے اپنے ادبی کیریر کا آغاز کرتے ہوئے 1948 میں اپنی پہلی کتاب The Naked and the Dead لکھی یہ وہ سال تھا جب ملر پیرس میں پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھا نارمن ملر کی یہ پہلی کتاب بیسٹ Best Seller گنی گئی جب ملر اپنے وطن اور شہر واپس ہوا تو اسے ایک نیا ہمینگوے اور میل ول کہا جانے لگا تھا The Armies of the night کو Pwlitzer اور نیشنل بک ایوارڈ ملا 1999 میں نیویارک یونیورسٹی کے ایک سروے میں یہی کتاب صدی کی جرنلزم کی بہترین کتاب تسلیم کی گئی نارمن ملر نے بڑی صفائی سے ایک بار کہا تھا کہ اس نے ہمیشہ ہمینگوے جیسا ناول نگار بننے کی تمنا کی تھی مگر اس نے جو ناول لکھے وہ اس کے بعد کی نسل کے لیے مثالی یا تقلید کے لائق نہ بن سکے نارمن ملر کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ بطور ناول نگار یاد رکھا جائے نہ کہ بطور جرنلسٹ 1939 سے امریکی زندگی اور سیاست میں جو بھی اتار چڑھاؤ آئے وہاں کی ممتاز شخصیات نے جو کچھ بھی کیا اس سب کا ذکر ملر کے ناولوں یا پھر اس کی صحافیانہ رپورٹنگ میں پڑھنے کو مل جاتا ہے ملاحظہ ہو Hartoto Ghost-A Novel (CIA کے بارے میں) یا پھر نان فکشن کے طور پر Oswalds Tale ملر نے اس خیال کو مقبول بنایا کہ کہانی لکھنا اور سنانا کسی ایجاد سے کم اہم نہیں ہے۔

ہاول کا نیا ڈرامہ

● کوئی بیس برس کے وقفے کے بعد چیک ڈرامہ نگار اور وہاں کے سابق صدر Vaclav Havel نے ادب اور تھیٹر کی دنیا میں اپنے نئے ڈرامے "Leaving" سے اپنی واپسی درج کرائی ہے ہاول کے اس نئے ڈرامے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شکسپیر کے ڈرامے کنگ لیئر اور چیخوف کے مشہور ڈرامے The Cherry Orchard سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے اسے آنیوالے مہینے جون میں اسٹیج پر کھیلا جائے گا لیکن چیک میڈیا نے ابھی سے اس ڈرامے پر تحسین و تعریف کے پھول برسانے شروع کر دیئے ہیں ہم آپ کو یاد دلا دیں کہ 1988 میں ہاول کا پہلا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا ہاول کے تازہ ڈرامے میں اس کی بیوی اداکار و دوست جان ٹرسکا مرکزی کردار ادا کریں گا۔

ہاول کو چیک عوام اور چیک تھیٹر کی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والوں نے 1960 کے دہے سے جانا تھا ہاول پر ڈرامہ نگاری کے آغاز میں فرانز کافکا کی تجریدیت پسندی کا خاصا اثر تھا تازہ ڈرامے کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ یہ ڈرامہ کسی ایسے کردار کے بارے میں ہے جسے اعلیٰ منصب سے ہٹنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یوں اس کی زندگی تنزل کا شکار ہو جاتی ہے پراگ کے ایک کیفے میں اپنے نئے ڈرامے کا تعارف کراتے ہوئے 71 سالہ ہاول نے کہا کہ ڈرامے کا عنوان ایسا ہے کہ اس سے یہ اشارہ ملنا قرین قیاس ہے کہ یہ ڈرامہ اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے جو تیرہ برس تک لگاتار اپنے ملک کا صدر رہا ہے ہاول نے حاضرین کو بتایا کہ اس نے اپنا تازہ ڈرامہ 1989 کے انقلاب سے پہلے اور صدر کا منصب سنبھالنے سے بھی پہلے 1980 میں لکھنا شروع کر دیا تھا اسے دو تہائی لکھ لینے کے بعد اسے مکمل کرنے کی نوبت نہیں آئی ہاول نے بتایا کہ اسے مکمل کرنے کی نوبت امریکہ جانے کے بعد آئی جہاں اس نے اپنی سوانح حیات Tothe Castle and Back بھی مکمل کی تھی جس کے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں ہاول نے نئے ڈرامے کے متن کے بارے میں کہا کہ ڈرامہ ان لوگوں کے رویے پر روشنی ڈالتا ہے جنھیں چیکوسلوویکیہ پر 1968 کے روسی حملے کے نتیجے میں دار و گیر کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جنھوں نے بدظن ہو کر مخالفانہ راہ اختیار کی تھی۔

چیک اخبارات کے خیال میں اقتدار سے باہر ہونے والے چانسلر اور اس کی جگہ چانسلری کا منصب سنبھالنے والے دوسرے کردار کے درمیان رقابت ویسی ہی نظر آتی ہے جو صدر ہاول اور ان کے دائیں بازو والے وزیر اعظم Vaclav Klans کے درمیان تھی اور جو ان کی جگہ چیک صدر بنا تھا، ڈرامہ نگار ہاول نے اعتراف کیا کہ ان کی صدارت کے زمانے میں واقع ہونے والے کچھ واقعات کا Text کا حصہ بن جانا قدرتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ڈرامے میں شکسپیر اور چیخوف کے مشہور ڈراموں کے اثر اور فیضان کو ڈرامے میں تلاش کر لینا دشوار نہ ہوگا انھوں نے وضاحت کی کہ چیری کے باغ میں پورا خاندان اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو یہ مماثلت نہیں علامتی اظہار ہے۔ ●●●
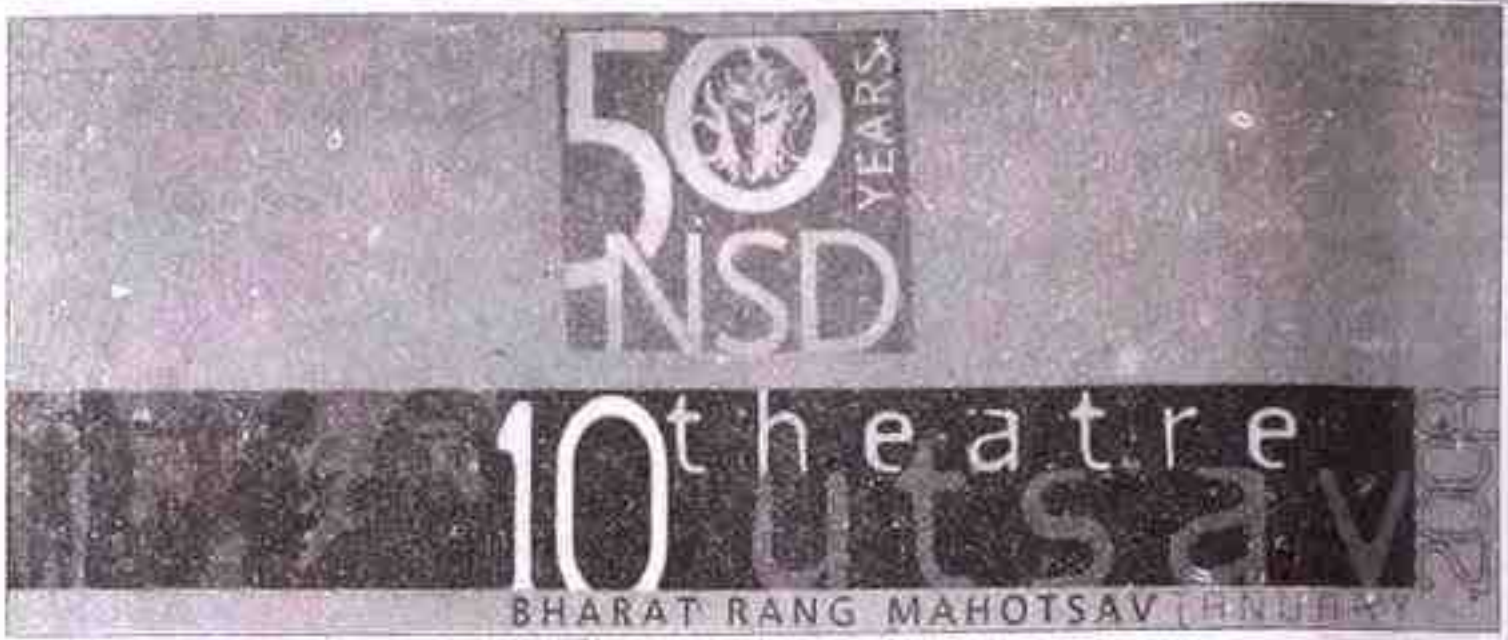
دسواں تھیٹر اتسو

• نیشنل اسکول آف ڈرامہ NSD ان دنوں اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہا ہے اپنے اسی گولڈن جوبلی سال کے دنوں میں اس نے اس بار کا دسواں تھیٹر اتسو NSD کے ہی تربیت یافتہ اداکاروں اور ہدایت کاروں اور تھیٹر میں نئے نئے زاویوں سے تجربہ کرنے کی ہمت اور ذہانت رکھنے والوں کے لئے مخصوص تھا ان کے علاوہ افغانستان، پاکستان، نیپال، بنگلہ دیش، موریشش، سری لنکا، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ، برطانیہ، ناروے، چین، جاپان اور ایران سے بھی تھیٹر منڈلیاں NSD کے تھیٹر اتسو میں آکر شریک تھیں NSD کا ہر سال منعقد ہونے والا تھیٹر اتسو اگر ایک طرف قومی سطح پر مختلف علاقائی زبانوں کے تھیٹر کو دیکھنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف پڑوسی ملکوں میں اور بیرونی ملکوں میں ہونیوالی تھیٹر کی جدید اور تازہ سرگرمیوں سے واقف ہونے کا بھی موقعہ فراہم کرتا ہے اُتسو سے ڈراموں کے Text کی سطح پر ان موضوعات اور رویوں کا بھی علم ہوتا ہے جو قومی اور عالمی تھیٹر میں راہ پا رہے ہیں اسی طرح تھیٹر کے مختلف شعبوں سے جو نئی ذہانتیں اور صلاحیتیں وابستہ ہو رہی ہیں ان سے بھی ہمارا تعارف ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ تھیٹر اتسو کے ان سترہ اٹھارہ دنوں میں دلی کے منڈی ہاؤس کے علاقے میں جو ہندوستانی فنون لطیفہ کی سرگرمیوں کا مرکز ہے خاصی چہل پہل اور رونق رہتی ہے NSD کی ساری عمارت اس کے بام و در اور لان روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں اس روشنی میں اسٹیج ہونیوالے اور اسٹیج ہو چکے ڈراموں کے بلو اپ بڑے سلیقے سے سجائے جاتے ہیں۔

اس بار بھی اپنی پسند کے ڈراموں کے ٹکٹ خریدنے کے لیے شائقین کی قطاریں اتسو کی اخباری تشہیر کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور منڈی ہاؤس کے مختلف تھیٹر ہالوں میں اسٹیج ہونیوالے ہر روز کے پانچ ڈراموں کے ہاؤس فل ہو جاتے رہے تھے اس صورت حال نے تھیٹر دیکھنے کے بہت سے شائقین کو مایوس کیا NSD نے بھی اس بات کا خیال رکھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ خرید کر تھیٹر ہال میں جائیں تاکہ تھیٹر کو نئے نئے ناظر اور شائق میسر آتے رہیں ہم ہمیشہ کی طرح دسویں تھیٹر اتسو کی تصویریں مختصر تعارف کے ساتھ شریک اشاعت کر رہے ہیں۔ مرتب

اسٹیج ہونیوالے ڈراموں کا تعارف

واھو دوک

- اس تمثیل میں چار منظر تھے اور ایک راوی تھا جو آدم زمین، انسانی معاشرہ کے قیام کا جواز پیش کرتے ہوئے یہ کہتا تھا کہ یہ زمین انسان کے لیے بے شمار نعمتوں کا خزنیہ ہے اسے بچائے رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ زمین انسان کے آرزؤں کا گلدستہ بن سکے یہ پیش کش منی پوری Trilogy کا پہلا حصہ تھی۔

رام نام ستیہ ھے

- اپنے خاندان سے در بدر کئے جانے والے ایڈس کے مریض ایک خصوصی وارڈ میں زیر علاج ہیں یہ آپس میں ہنستے بولتے اور دوستیوں کے سہارے جیتے ہیں یہ ایک دوسرے کے شریک غم بھی بنتے ہیں اور ایک دوسرے کو دکھ بھی پہونچاتے ہیں اور دیکھنے والے کو اندر تک ہلا دیتے ہیں۔

تھری سسٹر

- چیخوف کا یہ مشہور ڈرامہ جاپان کے ایک تھیٹر گروپ نے اسٹیج کیا تھا یہ پیش کش ڈانس۔ تھیٹر والی تھی اور فضا سازی 1960 کے دہئی جاپان کے حوالے سے تھی جہاں تین بہنیں اپنی اپنی پہچان کے لیے ایک دوسرے سے الجھتی رہتی ہیں ۔ڈرامہ بنیادی طور پر جاپانی یوتھ کے ثقافتی Obsession کے اظہار کا حامل تھا۔

بغداد برننگ

● ایک عراقی خاتون نے کوئی چار سال پہلے انٹرنیٹ پر اسی نام سے ایک تحریر سرکلولیٹ کی تھی اس ڈرامے کا اسکرپٹ اسی سے ماخذ تھا ڈرامہ میں عراقیوں کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا نیز یہ بھی ڈرامے کا موضوع تھا کہ کس طرح عراقی اپنی خود توقیری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

واپسی کے بعد

● نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے ڈائریکٹر دیوراج انکر کو کہانی کے Text کو ڈرامائی انداز میں اسٹیج کرنے کی خصوصی مہارت حاصل ہے یہ ان کا ایک طرح سے میدان ہے اس بار انھوں نے ایک گھنٹہ تیس منٹ کی اس پیش کش میں دو کہانیاں ہری پرکاش کی 'واپسی' اور کامتا ناتھ کی کہانی 'سنکرامن' لی تھی ایک کا موضوع بڑھاپا اور دوسرے کا موضوع تنہائی اور معاشرے میں فرد کا نظرانداز کیا جانا تھا۔

اکھیاں والیو

● لاہور کے رفیع پیر تھیٹر کی اس پنجابی پیش کش کا تھیم یہ تھا کہ سیاست یا ارباب اقتدار ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کا نعرہ بڑے زور شور سے لگاتے ہیں اور جب عوام کو بے وقوف بنا کر وہ اقتدار میں آجاتے ہیں تو پھر راہ کی رکاوٹ یعنی پتھر کو ہٹانے کا وعدہ بھول جاتے ہیں۔ بھولتے کہاں ہیں اگلے الیکشن تک راہ کے پتھروں کو اسی طرح کاوٹ بنا رہنے دیتے یں تا کہ اگلے سال پھر اس راہ کے پتھر کو ہٹانے کے نام پر ووٹ بٹورا جاسکے۔

آرن دھیاپتی تانتیا

● راجستھان کے بانسواڑہ علاقے کے بھیل قبائل کو لے کر تانتیا ٹوپے نے اپنی فوج بنائی تھی جس کی مدد سے تانتیا نے 1857 کی بغاوت میں انگریزوں کے اقتدار کو للکارا تھا ڈرامے کا مقصد جنگ آزادی کی پہلی لڑائی میں تانتیا ٹوپے کے رول کو اجاگر کرنا تھا۔

عزیزن

- 1857 پر اُتسو کا یہ دوسرا ڈرامہ تھا جو اردو میں تھا اور کان پور کی ایک نشاطیہ محفل سجانے والی عزیز النساء کے کردار پر مبنی تھا عزیزن نے باغیوں کو اپنے کوٹھے پر پناہ دی تھی اور ان کے لئے انگریزوں کے خلاف مخبری کرتے ہوئے جان دیدی تھی۔

تیاگ پتر

- یہ ڈرامہ ہندی ادیب جینیندر کمار کے ناول پر مبنی تھا ڈرامہ ایک ایسے نوجوان کی سوچ کا حامل تھا جو ایک کھلے ذہن کے ساتھ زندگی کا ایک بے حد حساس موضوع ناظرین کے سامنے رکھتا ہے ڈرامہ ایک ایسی عورت کی لڑائی کا بیانیہ بنتا ہے جو سماج کے دیئے ہوئے روایتی رسم ورواج اور سوچ کو کھرچ کے پھینک دیتی ہے اور سماج کے دی ہوئی فرسودہ اور مصنوعی اقدار کو کچل دیتی ہے۔

کاکیشن چاک سرکل

- بریخت کے اس مشہور اسکرپٹ کو افغانستان کے آفتاب تھیٹر نے پیش کیا ہدایت کار نے بریخت کے اس ڈرامے کو اپنے ملک کے موجودہ حالات سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

ڈیر باپو

- خطوط کو لے کر انھیں آمنے سامنے مکالماتی انداز میں اسٹیج پر پیش کرنے کی ڈرامائی تکنیک کو اس بار اتسو میں مہاتما گاندھی اور گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے درمیان ہونیوالی وسیع خیالات اور موضوعات کی حامل خط وکتابت کو بڑی خوبی سے ڈکو۔ ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا گیا۔

بٹر فلائی آر فری (Butter Fly are Free)

● بنیادی طور پر یہ براڈوے کی ایک پر کشش پروڈکشن تھا جسے اتسو میں پولینڈ کے ایک تھیٹر گروپ نے پیش کیا یہ ڈرامہ ایک ایسے نابینا شخص پر مرکوز ہے جو ایک آزاد خیال ہپی کی دوستی میں ڈوبا ہوا ہے اس کی ماں اس کے تعلقات پر معترض رہتی ہے ڈرامہ اسی گھریلو تضاد اور ٹکراؤ کو پیش کرتا ہے۔

دی میٹا مارفیسس

● فرانز کافکا کے اس مشہور ناولٹ کو بنگلہ دیش کے سینٹر آف ایشن تھیٹر نے پیش کیا تھا یہ ایک سیلز مین کی کہانی ہے جو ایک شام جب اٹھتا ہے تو اس کی قلب ماہیت ہو چکی ہوتی ہے۔

زندگی ریٹائر نہیں ہوتی

● تنخواہ پر گزر بسر کرنے والے متوسط طبقے کے آپسی رشتوں اور تعلقات کو موضوع بنانے والا یہ ڈرامہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ایسے خاندانوں میں بزرگ، نیم بزرگ اور نوجوانوں کی نسل کے درمیان رشتوں کا جو تانا بانا تھا وہ آج کے حالات میں کافی جداگانہ صورت اختیار کر گیا ہے اور اسے پھر سے بامعنی بنانا مشکل ہو رہا ہے۔

اورنگ زیب

● یہ اردو ڈرامہ ہندوستان میں ایمرجنسی کے نفاذ سے چند ماہ پہلے 1974 میں لکھا گیا تھا یہ ڈرامہ دراصل ان واقعات کا بیانیہ ہے جو مغل بادشاہ شاہ جہاں کے بعد تخت پر قبضہ کرنے کی سازشوں اور کوششوں سے تعلق رکھتے ہیں ڈرامے کی تہہ داری یہ بھی تھی کہ یہ ڈرامہ ایک قوم۔ ایک زبان اور ایک مذہب والی تھیوری کو نکارنے

پر اصرار کرتا ہوا قومی سوچ کو سیکولر اور جمہوری بنانے پر زور دیتا ہے۔

اینٹی گونی

● ژاں انوئی کا 1942 میں لکھا یہ ڈرامہ دراصل سوفکلیز کے پانچویں صدی قبل از مسیح لکھے ڈرامے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ڈرامہ تھا یہ دراصل ایک فرد کی اقتدار کے خلاف تصادم کی کہانی ہے ڈرامے دو مرکزی کردار اینٹی گونی اور Ceon کے درمیان طویل مکالمہ بازی ہوتی ہے اور دونوں ہی اقتدار، قسمت اور انتخاب Choice پر لمبی بحث کرتے ہیں اسے اداکار نصیر الدین شاہ کے گروپ موٹلے ممبئی نے بڑی کامیابی سے پیش کیا تھا۔

رفتگاں

● شفیقہ فرحت نے ہمارے طنز و مزاح کے ادب میں اظہار کی شگفتگی اور زبان کی شوخی کو اپنی تحریروں کی کلید بنایا تھا یہاں میدان مار لینے کے بعد انھوں نے شاعری شروع کردی تھی ہم سے ان کا اصرار یہی ہوتا کہ ہم ان کی شاعری کو بھی ان کے طنزیہ ادب کی طرح اہمیت دیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے اہم لکھا۔

● فلموں کے ممتاز ادیب سید علی رضا بھی بالی ووڈ سے رخصت ہو گئے علی رضا یقینی طور سے فلم لکھنے کے لئے ہی پیدا ہوئے تھے ان کے لکھے کو سلولائیڈ کا قالب دینے کے لئے محبوب خاں جیسا ماہر ہدایت کار مل گیا اس امتزاج نے انداز اور مدر انڈیا جیسی فلمیں ہمارے سینما کی سنہری تاریخ کے حوالے کردیں وہ ذہن جدید کے باقاعدہ قاری تھے۔

● شاعر احمد کمال پروازی بھی ذہن جدید کے مستقل خریدار تھے اور ہمیں اپنا کلام بھیجتے رہتے تھے ہمیں اپنے ان ادیب دوستوں کے بچھڑنے کا ملال ہے۔

اس سہ ماہی کی فلمیں

کھویا کھویا چاند

● سدھیر مصرا کی فلم 'کھویا کھویا چاند' بھلے ہی باکس آفس پر پیسہ بٹورنے میں کامیاب نہ رہی ہو لیکن فلم کا جمالیاتی پہلو دیکھنے والوں کو ضرور متاثر کرتا ہے فلم کی ہیروئن شرمیلا ٹیگور کی بیٹی سہا علی خاں ہے سہا نے فلم میں ایک ایسی ایکٹرس کا رول ادا کیا ہے جو 1950 اور 1960 کے دہوں میں فلموں میں کام کر رہی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی سنیما سے وابستہ اداکاراؤں کو سماج کے کئی تعصبات کا سامنا کرنا پڑتا تھا فلم کی ہیروئن کو اپنے تنہا کردار میں اس زمانے کی مقبول اداکاروں جیسی مینا کاری، مدھوبالا اور وحیدہ رحمٰن کے پردے پر جیسے کرداروں کو ذہن میں رکھ کر ان کے ETHOS کو آج کے ناظر تک پہونچانا تھا سہا کا اس شکل میں ان کی ماں شرمیلا ٹیگور نے حوصلہ بڑھایا چونکہ شرمیلا نے وہ زمانہ بطور ایکٹرس دیکھا تھا اس لیے سہا کے گٹ اپ میں اس کے سراپے کو شباہت آمیز بنانے میں انھوں نے اپنی تمام تر مشاعلگی سہا پر خرچ کر دی تھی۔

آجا نچ لے

● فلم ساز انل مہتہ نے یہ فلم مادھوری ڈکشٹ کو ذہن میں رکھ کر بنائی ہے جو ایک دھماکہ بن کر فلموں میں آئی تھی پانچ سال پہلے یعنی اپنی شادی اور پھر ماں بننے سے پہلے مادھوری نے لیلا بھنسالی کی فلم 'دیوداس' کے لیے کیمرے کا سامنا کیا تھا ۴۰ سال کی عمر کو پہونچنے والی مادھوری دکشت نے پھر ایک بار فلموں میں کام کرنے کے خیال سے بالی وڈ میں جب اپنی آمد کا اعلان کیا تو مادھوری پھر ایک بار سرخیوں میں تھی فلم آجا نچ لے میں کیمرے نے مادھوری کے پیروں میں تھرکتے مچلتے گھونگروؤں سے لے کر اس کی روشن اور مسکراہٹوں سے لبریز

آنکھوں کے ایسے دلکش اور خوبصورت زاویے تراشے ہیں کہ دیکھنے والے جھوم جھوم اٹھے مادھوری کو بے حد پسند کرنے والے پینٹر حسین نے دوبئی میں ایک پورا سینما ہال مادھوری کی اس تازہ فلم نچ لے کو دکھانے کے لیے بک کرلیا تھا' آجا نچ لے' سیاسی کرپشن کے ارد گرد گھومنے والی کہانی ہے مگر لگتا ہے کہ انل مہتہ نے دراصل بالی ووڈ میں مادھوری کی واپسی کا جشن منانے کے خیال سے زیر حوالہ فلم بنائی ہے ایم ایف حسین کا خیال ہے کہ مادھوری کو ہندوستانی فلم ساز نہیں سمجھ پائے اسی لیے اس کو لے کر ابھی تک کوئی کلاسک فلم نہ بن سکی۔ ان کے خیال میں مادھوری کو کسی ہدایت کار کی ضرورت ہے۔

سانوریا

● کبھی کبھی کوئی ایک افسانہ فلم والوں کے لیے پرکشش کمزوری بن جاتا ہے ایسا ہی ایک افسانہ روسی ادیب دوستووسکی کا Fyodor ہے 1971 میں فرنچ ہدایت کار رابرٹ بریسن نے Quatra Nuits Dur Reveur نامی فلم بنائی تھی 2005 میں یہی فلم ایک اور ہدایت کار ایلین سلور نے White Nights کے نام سے بنائی تھی 1960 میں راج کپور نے 'چھلیا' کے نام سے اس افسانے کا ہندوستانی ورژن بنایا تھا یہ ایک ایسی عورت کی کہانی تھی جو اپنے خاوند اور گود لیے بچے سے بچھڑ جاتی ہے اور راج کپور اس خاندان کو ملانے کا سبب بنتا ہے کوئی پچاس برس بعد راجکپور کے پوتے رنبیر نے دوستووسکی کے افسانے پر یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ 'چھلیا' کا ری میک سانوریا کے نام سے بنانے کی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن بات بنی نہیں لیلا بھنسالی کی ہدایت میں بنی یہ فلم سورج اور اس کی روشن کرنوں سے محروم ہے ہال میں بیٹھے ایک اندھیرے یا پھر ستاروں بھری شاعرانہ رات کا احساس ہوتا ہے۔
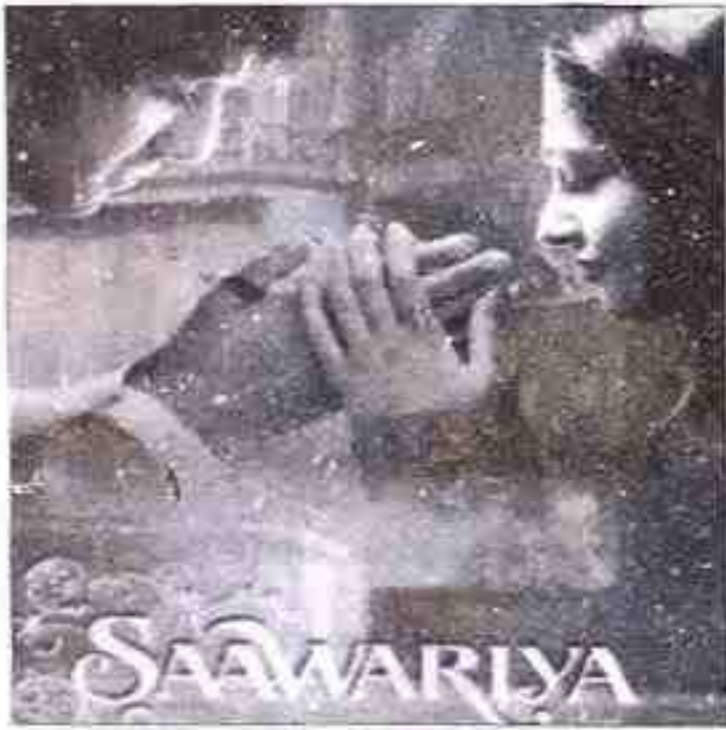
اوم شانتی اوم

● کوریوگرافر فرح خان نے شاہ رخ کی اس فلم کی ہدایت دی ہے دیوالی کے موقع پر 'سانوریا' کے ساتھ ریلیز ہونے والی فلم نے ابتدائی اندازوں اور

قیاس آرائیوں کو ایک طرف کر دیا۔ فلم مجموعی طور پر پسند کی گی حالانکہ سبھاش گھئی کی فلم 'قرض' کا یہ ایک طرح سے ری میک ہی تھی کہانی میں کوئی ندرت نہیں ہے فلم دراصل آواگون کے تصور کو ماننے والی ہے شاہ رخ ایک جونیر اداکار ہے وہ ایک سنئیر اداکارہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے جنم میں عاشق ہی رہتا ہے اب اس کا دوسرا جنم ہے اور وہ ایک سینیر اداکار ہے اور اس کی پچھلے جنم کی محبوبہ اس کی جونیر ہے۔ فلم میں Nostalgia کافی ہے اس سے فلم بوجھل ہوئی مگر شاہ رخ نے فلم کو بکھرنے سے بچالیا یہ پہلی فلم ہے جس میں شاہ رخ نے اپنے اوپر کے دھڑ کو ننگا رکھا ہے شاہ رخ کی اداکاری نے کئی ہفتوں فلم کو اترنے نہیں دیا مجموعی طور پر اوم شانتی اوم اس سہ ماہی میں کافی پسند کی جانے والی فلم شمار کی گئی شاہ رخ کے ساتھ نئی ہیروئن دیپکا پیڈوکون نے بھی اپنے بہتر کام سے متاثر کیا۔ اگر شاہ رخ فلم کے لیے خون اور ہوا بن گئی تھی تو دیپکا فلم کی شادابی کو مرجھانے نہ دینے والا پانی بن گئی تھی۔

دس کہانیاں

● مقبول اور پسند کی جانے والی فلموں سے یہ بڑی حد تک اپنی تکنیک میں ایک الگ سی فلم تھی اس میں کوئی ایک کہانی نہیں تھی فلم دس الگ الگ کہانیوں کو لے کر اس طرح بنائی گئی تھی جیسے یہ کوئی سیریل ہو جس میں ایک کہانی کے ختم ہونے کے بعد بغیر کسی باہمی ربط کے دوسری کہانی شروع ہو جاتی ہے فلم کے ایک نہیں کئی ہدایت کار اور کئی اسکرپٹ رائٹر الگ الگ کہانی کی اداکاروں کی ٹیم بھی مختلف ہے دس کہانیاں فلم ایسا لگتا ہے کہ یہ ملیالم کے ممتاز فلم ہدایت کار اڈور گوپا کرشنن کی تازہ فلم Nallu Pennungal (چار عورتیں) سے تحریک پا کر بنائی گئی ہے اڈور کی فلم میں بھی چار مختلف عورتوں کی کہانیاں ہیں جو کیرالا کے 1960-1940 کے سماجی حالات میں سانس لے رہی ہیں یہ چاروں عورتیں اپنے اپنے حالات کا سامنا کرتی ہیں ان میں وہ عورت بھی جس کا میاں نامرد ہے اور وہ زندگی بھر شوہر کے ساتھ جنسی اختلاط کے تجربے سے محروم رہتی ہے ایک دوسری وہ ہے جس کی چھوٹی سی عمر میں شادی کر دی جاتی ہے اڈور کی اس فلم کی چاروں کہانیاں تھکادی سواشنکر پلئی نے لکھی ہیں ملیالم میں بنی کر ڈور کی فلم تو اپنی نامانوس تکنیک کی بناء پر ناظرین میں قبول کر لی گئی ہے مگر دس کہانیاں جیسی فلم کو شاید وقت سے پہلے بنالیا گیا کہ ابھی اس تکنیک میں فلم کو دیکھنا لوگوں کے لیے عجیب تجربہ ہے۔

گول

● عالمی کرکٹ کپ کے دنوں میں ایک ساتھ کئی فلمیں آئی تھی یہ سلسلہ فلم بینوں کا ذائقہ اور مذاق بدلنے کی غرض سے اب بھی جاری ہے شاہ رخ کی ہٹ فلم 'چک دے' نے تو دھوم ہی مچادی۔ دویک اگنی ہوتری کی فلم 'گول' اگر 'چک دے' سے پہلے ریلیز ہو جاتی تو

یہ ایک اچھی مقبول فلم کہی جا سکتی تھی فلم بڑی حد تک Sport فلم ہے اور فلم کا کھیل فٹ بال اس کے کھیلنے والے ملے جلے سانولے اور گورے ہیں لوکیشن لندن کی ہے جہاں فٹ بال بے حد مقبول گیم ہے گوشت کے تکے بنا کر انگریزوں کو کھلانے والے ارشد وارثی کا خواب ہے کہ کسی روز وہ اپنے ہم وطنوں کی ایک ٹیم بنائے اور مخالف گورا ٹیم کو شکست دے فلم اسی کشاکش کو کہیں کہیں خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے فلم میں اداکاروں کے لیے زیادہ گنجائش نہیں ہیں لیکن فٹ بال کے شائقین کے لئے فلم پھر بھی دلچسپ بن جاتی ہے۔

لاگا چُنری میں داغ

• پردیپ سرکار کی ہدایت میں بنی اس فلم کا مرکزی کردار بنارس کے ایک سادہ سے گھر میں پلی بڑھی ایک ایسی لڑکی کا ہے جو اسکرین پر کئی بار دکھائی گئی وہ اپنے گھر کی غربت کا چہرہ بدلنے کے لئے ممبئی کا رخ کرتی ہے۔ مرکزی کردار میں رانی کا کردار اور اس کا خاص خیال رکھنے والی اس کی بہن بنی کونکونا سین کا کردار بھی فلم بینوں کا دل جیت لیتا ہے سرکار کی اس فلم کی کہانی اب سے تین چار دہے پہلے بننے والی فلموں جیسی ہی تھی بلکہ بڑی حد تک ماضی میں بنی مقبول 'پرینتا' سے ملتی جلتی تھی یعنی ایک غریب گھر، باپ ناکارہ اور ماں اپنی دو بیٹیوں کی خاطر سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہے اور پھر لڑکیاں ایک دن یہ سوچتی ہیں کہ اچھی روٹی روزی کی تلاش میں ممبئی کا رخ کیا جائے بالآخر بڑی بہن عورتوں کے استحصال کا جال پھیلانے والوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر بدن بازار کا حصہ بن جاتی ہے۔ فلم یہیں سے مختلف ہوتی ہے اور لڑکیاں اپنے لیے ایک بہتر مستقبل کا تانا بانا بنتی ہیں 'لاگا چنری میں داغ' دھونے کے لیے فلم اپنی عصریت میں فلم بینوں پر اچھا اثر چھوڑتی ہے۔

رانی مکھرجی کو ایک مخصوص فریم میں کردار سازی کرنی پڑتی ہے اس کے باوجود اُس کے کامیاب کردار کے طور پر فلم دیکھنے والوں کے حافظے میں دیر تک گونجتی رہتی ہے۔
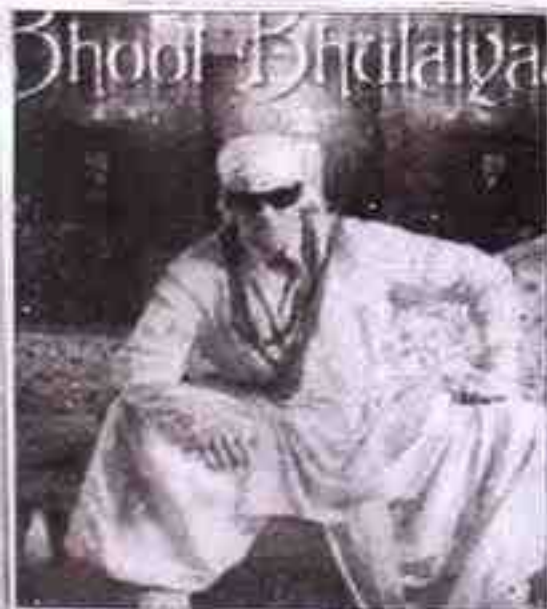
بھول بھلیاں

• ہدایت کار پریے درشی اگر ایک طرف فلم کے ذریعے ہنسی مذاق کے فوارے چھوڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو دوسری طرف ان کی دلچسپی خوف اور ڈر یوں کہیے کہ بھوت پریت کے تصور کو اسکرین پر دکھانے کی ہے اس فلم میں بھی انھوں نے ایک پرانی حویلی میں آکر بسنے والوں کو پراسرار انداز میں عجیب وغریب ان ہونیوں کا سامنا کرنا

پڑتا ہے اس نسل کی فلموں میں مدھوبالا۔اشوک کمار کی 'محل' اور وحیدہ رحمان کی فلم 'میرا سایہ' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی بھول بھلیاں میں فنی مذاق ہے مگر ایسا جو جلد ہی مرجھا جاتا ہے پریش راویل اور اسرانی کے پاس لطیفوں کے نئے پن کے علاوہ مزاح کا اپنا خزانہ ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے اسی طرح خوف اور ڈر بھی تھوپا ہوا لگتا ہے پھر بھی اس فلم کو بھی لوگوں نے 'لاگا چنری میں داغ' کے ساتھ ایک سیکنڈ چوائس کے طور پر دیکھ ہی لیا۔

● اس سہ ماہی میں شاہد کپور اور کرینا کپور کی فلم جب we met اور وکرم بھٹ کی فلم Speed بھی آئی مگر یہ دونوں ہی فلمیں فلم بینوں کو اوسط کی سطح پر اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں مذکورہ فلموں سے اندازہ ہوتا ہے ان دنوں نئے موضوع اور نئی حسیت کے دائرے میں قدم رکھنے والی فلمیں نہیں بن رہی ہیں یا تو فلم سپر اسٹار کے بل پر چل رہی ہے یا پھر ناچ گانوں اور مار دھاڑ اور تیزابی مکالمات کے سہارے چل رہی ہے۔

آرٹ اور غارت گری

● پینٹر ایم ایف حسین جو ان دنوں خلیج کے شہروں میں مجبوراً جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اپنے وطن میں اپنی پینٹنگس کے خلاف ظلمت پسند عناصر کی توڑ پھوڑ کے سلسلے کے جاری رہنے سے بے حد دکھی ہیں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیو سینا نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ مصوری کی دنیا میں ہندوستان کا سر بلند کرنے والے اس پینٹر کی کوئی نمائش نہیں ہونے دینگے اور نہ ہی اس پینٹر کو اپنے وطن میں سکون کا سانس لینے دینگے اس سلسلے کی تازہ کڑی یہ ہے کہ احمد آباد میں ایک پرائیویٹ چینل کے آفس میں اس لیے "ہندو سامراج سینا" کے نوجوانوں نے توڑ پھوڑ مچائی کہ چینل نے پینٹر حسین کو 'بھارت رتن' دیے جانے کے لئے اس کے حق میں فضا سازی کی تھی اس سے قبل نئی دلی میں ایک ممتاز ثقافتی سینٹر میں حسین کی پینٹنگس کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تو یہاں بھی ہندو دیوی دیوتاؤں کی اپنی تصویروں میں توہین کرنے کے گھسے پٹے الزام کے ساتھ نمائش نہ کرنے کی دھمکیاں اور بھارت نام کی تازہ پینٹنگس کو جلا دینے کی کوشش کی گئی تھی حسین کی خود اختیار کردہ اس جلاوطنی کو ختم کرنے کے لیے ہندوستان کے کئی ممتاز فنکاروں اور ادیبوں نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا مگر حسین کی باعزت واپسی کی کوئی سبیل ابھی تک نہیں نکلی۔ حسین کا کہنا ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے کسی مناسب گھڑی وطن لوٹ آئیں گے۔

حسین کے خلاف عرصے سے چلی آرہی آر ایس ایس کے ذیلی عسکری گروپوں کی مخالفت اور دشمنی کا زور کم کرنے کے لیے ملک کے دانشور اور کشادہ خیالی کے حامل ترقی پسند طبقوں میں حسین کے تئیں غیر معمولی

ہمدردی موجود ہے اس سلسلے میں پچھلے دنوں کئی ممتاز آرٹسٹوں نے ایک اجتماع میں یہ بتایا کہ کس طرح مذہبی کٹر پنتھی کا سہارا لے کران کی پینٹنگس کو بھی نشانہ بنایا گیا ہم یہاں کچھ آرٹسٹوں کے بیانات کا حوالہ دے رہے ہیں۔

ارپنا کور

آرٹ اور اقتدار کے درمیان ہمیشہ ہی بڑی اَن بن رہی ہے مائیکل اینجلو کی Sistime chapel والی پینٹنگ بھی تکتہ چینی کا نشانہ بنے بغیر نہ رہ سکی جب کہ سچ یہ ہے کہ اینجلو کی یہ تصویر کسی بھی زاویے سے Erotic کے زمرے میں نہیں آتی اس وقت ایک پادری نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ پینٹنگ قابل اعتراض نہیں ہے جب تک کسی آرٹ کے نمونے کا مقصد ہیجان خیزی اور Senrsational بنا نہیں ہے وہ ہمارے ہمدردانہ پہلو کا مستحق بنا رہتا ہے گورونانک کے سلسلے میں میں نے جو سیریز بنائی تھی اس میں رقص آمادہ گورونانک، والی پینٹنگ بھی تھی یہ پینٹنگ دراصل گرنتھ صاحب کی ایک نظم کا ترجمہ تھی جس میں گورونانک، بالا اور مردانہ کے حوالے سے زندگی کو ایک جلتے ہوئے دریا سے تشبیہ دی گئی تھی اس پینٹنگ کے بارے میں چند غیر معروف پنجابی آرٹسٹوں نے پنجابی کے ایک رسالے میں مجھ سے معافی مانگنے کی تھی مجھے اس بات سے بڑا دکھ ہوا تھا کیونکہ میرے دل میں گورونانک کے لئے بے حد احترام اور محبت ہے اور میں نے ہمیشہ انھیں مذہبی سرشاری کی حالت میں پینٹ کیا ہے۔

اکبر پدم سی

میں نے کبھی ایسی پینٹنگ نہیں بنائی جو اپنے مزاج میں تخریبی رہی ہو یہ الگ بات کہ ایسی پینٹنگ کو بعض دیکھنے والے تخریبی یا فحش اور عریانی کی حامل پینٹنگ قرار دے دیں میرا کام پینٹ کرنا ہے اور میں اپنی بنائی پینٹنگ کے دفاع کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہوں 1954 میں جہانگیر آرٹ گیلری میں میری ایک پینٹنگ Lovers کے عنوان سے آویزاں کی گئی تھی اس تصویر کو فحش اور عریاں کہہ کر ہنگامہ برپا کر دیا گیا اور مجھے فحاشی کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا اعتراض یہ تھا کہ پینٹنگ میں مرد عاشق کا ہاتھ محبوبہ کے پستانوں پر ہے اس پینٹنگ کے دفاع میں اور عدالت کو Convinc کرنے میں 8،9 مہینے لگے اور مجھے اس کا بڑا ملال رہا میں نے لینڈ اسکیپ بنانے شروع کر دیئے تھے مجھے Lovers والے موضوع کی طرف لوٹنے میں کوئی بیس برس لگے چنانچہ اب میں نے Pure Form کی Nudes میں کئی سیریز بنائی ہیں۔

جوگن چودھری

میرا کام نہ تو تخریبی ہوتا ہے اور نہ ہی Sensatonal میں تو اپنے اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہوں اور یہ بطور آرٹسٹ میں ہی نہیں ایک عام آدمی بھی اپنے ماحول پر اپنا رد عمل ظاہر کرتا ہے Wounded کے عنوان سے میری سیریز میرا بے حد طاقتور عمل ہے اس کے علاوہ

Abu Ghraib ،After math اور The Unborn Child اس تشدد کے خلاف میرا فنکارانہ اظہار ہے جو آج ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گیا ہے لوگ آرٹ میں فحاشی کی بات کرتے ہیں لیکن جس بے رحمی کے ساتھ اظہار خیال کی آزادی پر حملہ کیا جارہا ہے وہ میرے نزدیک بدترین قسم کی فحاشی ہے۔

طیب مہتہ

میرے بہت سے مصورانہ عمل کو تخریبی اور ہیجان خیزی کا حامل کہا گیا ہے لیکن میں نے کبھی Shock پہونچانے کے لئے کچھ بھی پینٹ نہیں کیا میرا کام اپنے زمانے کی زندگی کو پیش کرنا ہے اور اسی کے اعتبار سے رنگ، لائن اور Form کی جمالیات ابھر کے آتی ہے میں نے مغرب میں بے شمار پینٹنگیں دیکھی ہیں اسی طرح بھونیشور کے مندروں میں بھی میں نے پتھروں کی مورتیاں دیکھی ہیں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ سب Erotic کام ہے میرے خیال میں ہمیں آرٹ کے بارے میں اپنے تصور کی صورت گری کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ آرٹسٹ کا معاشرتی پس منظر کیا ہے یعنی وہ کس طبقے سے آیا ہے اور اس نے کس زمانے میں اپنی پینٹنگ بنائی ہے اور کن حالات اور لوگوں نے اسے ویسی پینٹنگ بنانے کی فضا دی یا تحریک دی کسی بھی آرٹ کے نمونے کو Isolation میں پرکھنے یا سمجھنے کی عادت ہمیں ترک کرنی ہوگی۔

عالمی فیسٹول آف انڈیا 2007

ہندوستان فلم سازی میں نمبر 1 پر

- قدرتی حسن وجمال سے مالامال سمندری ساحلوں سے گھری اور سیاحوں کی اولین پسند کی ہندوستانی ریاست گوا کو عالمی فلم فیسٹول کا مستقل مرکز بنادیا گیا ہے اس بار کے عالمی فیسٹول آف انڈیا برائے سال ۲۰۰۷ کا افتتاح ۲۳ نومبر کو بالی وڈ کے بادشاہ شاہ رخ نے کیا 38 ویں عالمی فیسٹول کی اختتامی تقریب کے خصوصی مہمان بنگالی فلم ساز بدھ دیپ داس گپتا تھے فیسٹول کے ختم پر بہترین فلم اور بہترین ڈائریکٹر کو ایک جیوری کے فیصلے کی روشنی میں اعزاز وانعام سے نوازا جاتا ہے اس بار فیسٹول کا سب سے بڑا ایوارڈ 'گولڈن پی کاک' Golden Peacock ایک تائیوانی فلم The wall کو دیا گیا ان چھ جو کی ہدایت میں بنی اس فلم کو دس لاکھ روپے نقد اور ایک توصیف نامہ بھی دیا گیا۔

اعزاز پانے والی اس تائیوانی فلم کی کہانی اس مشکل زمانے کا سلولائیڈ بیانیہ ہے جو 1950 کی دہائی میں White Terror کے نام سے جانی جانے والی سیاسی سرگرمی تھی جو دراصل حقیقی کمیونسٹوں یا مشکوک کمیونسٹوں کے خلاف ایک تشدد آمیز سرگرمی تھی۔

فسیٹول میں فلم بنانے والے 13 ملکوں سے 14 فلمیں 'گولڈن پی کاک' ایوارڈ کے لیے فیسٹول کے مقابلے والے حصے کے لیے موصول ہوئی تھیں سلور پی کاک بہترین جیوری ایوارڈ مشترکہ طور سے بنگلہ دیشی

فلم on the wings of Dreams (کہانی غلام ربانی بپلاب) اور More than anything in the world جو میکسیکن فلم تھی کو دیا گیا ایوارڈ کی رقم 2 لاکھ 50 ہزار روپے نقد اور ایک توصیف نامہ تھا سلور کا پی کاک ایوارڈ تھائی لینڈ کے نئے ہدایت کار Ping Pat waching funrong کو فلم My Myself پر دیا گیا اس ایوارڈ میں بہترین ہدایت کار کو 5 لاکھ روپے اور ایک توصیف نامہ دیا گیا۔

2006-07 میں ہی منتخب فلموں کے تعلق سے بدھ دیب داس گپتا نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اس بار فلموں کی اسکریننگ کوالٹی کافی بہتر تھی فیسٹول کے دوران اسکریننگ کا طریقہ کار خاصا معیاری اور خامیوں سے پاک تھا داس گپتا نے وضاحت کی کہ کسی فیسٹول کی کامیابی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ فلم دیکھنے والے شائقین کو کس طرح کی فلمیں دکھاتا ہے دوسرے فیسٹول میں لوگ فلموں کے مقبول Stars کو دیکھنے نہیں آتے وہ اس لیے آتے ہیں کہ فیسٹول میں جو فلمیں دیکھتے ہیں وہ اپنے ملک کے معاشرتی چہرے کی عکاسی کرتی ہیں لوگ تفریح کے طور پر فلموں کو دیکھتے ہیں لیکن وہ بھی جو نظر نہ آنے والے سماجی مسائل اور سماجی زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کی بازیافت کا عمل فلم میں دیکھنا چاہتے ہیں:

عالمی فیسٹول کے موقع پر ''سنیما اور تفریح'' کے موضوع پر ایک سی می نار بھی وزارت اطلاعات اور نشریات کی طرف سے منعقد کیا گیا اس موقع پر ہندوستانی فلمی صنعت کے بارے میں جو اعداد و شمار عوام کے علم میں لائے گئے وہ چونکا دینے والے بھی ہیں اور بے حد دلچسپ بھی

- ہندوستانی فلمی صنعت دنیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت ہے
- ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہر سال 800 فلمیں بنتی ہیں
- صنعت 25 لاکھ افراد کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرتی ہے
- ہندوستانی فلمی صنعت 10 ملین امریکی ڈالر کے برابر سرمایے کی حامل ہے
- اس سے 8 ملین افراد روزگار پاتے ہیں
- میڈیا اور انٹرٹیمنٹ سیکٹر میں سرمایے کی آمد 2006 میں 35 ملین امریکی ڈالر کے برابر تھی
- فلمی صنعت نے 1999 میں 100 ملین ڈاکر کا زرمبادلہ کمایا تھا
- 2010 کے آتے آتے یہ زرمبادلہ ایک بلین ڈالر کو پار کر جائے گا
- ہندوستانی فلمیں غیر ملکوں میں اپنے شائقین میں روز بروز اضافہ کر رہی ہیں
- گلوبلائزیشن سے ہندوستانی فلمی صنعت کو غیر ملکوں میں اپنی مارکٹ بنانے میں کافی مدد ملے گی۔

خدابخش لائبریری پٹنہ کی اہم مطبوعات

● عہد اسلامی کا بنگال/سید یحییٰ حسن ندوی، -/۲۵۰، ● نقوش حسن: انتخاب کلام حسن نعیم، -/۲۰۰ ● اصلاح النساء، (ناول)/ رشید النساء، -/۲۰۰ روپے، ● مولانا آزاد کی ادبی صحافت/ڈاکٹر انوار احمد، -/۲۴۰ روپے، مولانا آزاد کے سائنسی مضامین/ڈاکٹر وہاب قیصر، -/۱۵۰ روپے، ● مسدس حالی اور بھارت بھارتی: ایک تقابلی جائزہ/ڈاکٹر ارشد سراج ارشد، -۱۵۰ روپے، دیوان راسخ عظیم آبادی/شکیب ایاز، -/۲۵۰ روپے، ● پہلو نہ دیکھے گا: کلیم عاجز کے خطوط اور فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ/کلیم عاجز، -/۲۰۰ روپے، ● مجلس ادب/کلیم عاجز: عظیم آباد کی ادبی تہذیبی وسماجی تاریخ، -/۱۵۰ روپے، ● نقوش وخطوط: تحقیقی مقالات کا مجموعہ/پروفیسر عبدالباری، -/۱۳۲ روپے، ● غالب: ماضی: حال: مستقبل/پروفیسر محمد حسن، -/۱۵۰، مفتی اعظم ہند مولانا کفایت اللہ شاہجہانپوری، -/۲۲۰ روپے، ● ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری -/۲۰۰ روپے، قاموس المشاہیر جلد اول ودوئم/نظامی بدایونی: ۶۰۰۰ مشاہیر کے مختصر سوانحی حالات پر مشتمل بایوگرافیکل ڈکشنری -/۶۰۰ روپے، ● مثنوی احسن المطالب فی مناقب حضرت علی بن ابی طالب/جمیلہ خدابخش، -/۶۰ روپے، نغمۂ دل ریش جمیلہ درویش: ● دیوان جمیلہ خدابخش، جلد ۱-۲۰۰ روپے ● دیوان جمیلہ دوم/جمیلہ خدابخش، -/۳۵۰ روپے دیوان جمیلہ جلد سوم/جمیلہ خدابخش، -/۱۶۰ روپے دیوان جمیلہ جلد چہارم/جمیلہ خدابخش -۳۵۰ روپے ● نظرات: انجم مانپوری کے تاریخ ساز ماہنامہ ندیم کے اداریے -۲۵۰ روپے ● شذرات: ماہنامہ ندیم کے اداریے -/۱۰۰ روپے آل احمد سرور کے تبصرے، مرتبہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری -/۱۳۰ روپے ● مولوی خدابخش خاں حیات اور کارنامے -۲۵۰ روپے ● مولانا ابوالکلام آزاد ایک نابغہ روزگار شخصیت/اسحاق بھٹی -/۱۶۰ روپے ● فیض کی شاعری /عبدالمغنی -۴۰ روپے ● مولانا عبدالماجد دریابادی کا مشہور ● ہفتہ وار سچ کا توضیحی اشاریہ/عبدالعلیم قدوائی -۱۶۰ روپے ہفتہ وار صدق کا توضیحی اشاریہ -/عبدالعلیم قدوائی -/۴۰۰ ● تاریخ مگدھ/فصیح الدین بلخی: صوبہ بہار کی مکمل تاریخ -/۲۵۰ روپے ● مولانا مناظر احسن گیلانی: شخصیت اور سوانح/ابوسلمان شاہجہانپوری -/۶۰ روپے ناول کا فن اور نظریہ/ڈاکٹر محمد یسین -۱۰۰ روپے فیض نامہ/ڈاکٹر ایوب مرزا -۳۰۰ روپے ● اورنگزیب ایک نیاز اور نظریہ/اوم پرشاش پرشاد: اورنگزیب عالمگیر شخصیت الزامات کا مدلل اور مفصل جواب -/۲۰ روپے ● گیتا اور قرآن/پنڈت سندر لال -/۳۲۵ روپے قومی یکجہتی کی روایات/بی این پانڈے -/۱۰ روپے ● نقیب انقلاب مولانا برکت اللہ بھوپالی/شفقت رضوی -/۱۰۰ روپے ● مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری احوال وافکار سید ضمیر الدین -/۷۵ روپے ● مخزن فوائد: اردو مصطلحات، محاورات اور مثال کی ایک نادر لغت/نیاز علی بیگ نکہت -/۲۰۰ روپے ● کہاوتیں اور ان کے حکایتی وتلمیحی پس منظر/ڈاکٹر شریف احمد قریشی -/۲۲۵ روپے، ● علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ /ڈاکٹر الیاس الاعظمی -۵۰ روپے فارسی شاعری میں ہجانویسی/پروفیسر محمد شرف عالم -/۲۰۰ روپے ● داستان میری/ڈاکٹر اقبال حسین: بہار کے مسلمانوں کی پچھلے سو برسوں کی ادبی تہذیبی سماجی تاریخ -/۳۰۰ روپے ● دارالمصنفین کی تاریخی خدمات/ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی -/۲۰۰ روپے ● حسرت موہانی اور انقلاب آزادی/ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی -/۳۰۰ روپے ● تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ/تقی رحیم ۳۰۰ روپے ● فیضان ابوالکلام/ابوسلمان شاہجہانپوری -/۱۲۵ روپے ● اشفاق اللہ خاں شہید-حیات وافکار/ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری -/۱۳۵ روپے

ملنے کا پتہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

سنیما اور آپ بیتیاں

● ایک زمانہ تھا کہ ہندوستانی سنیما اور فلمی اداکاروں کی سوانحی کتابوں کی کمی کا احساس بری طرح کھٹکتا تھا لیکن ادھر کتابوں کی مارکٹ میں فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سنیما اور اس کے اداکاروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مواد اور احوال وکوائف کے پڑھنے کی مانگ بھی بڑھی ہے اس بارے میں ہم ذہن جدید کے صفحات پر ایسی کتابوں کے مواد سے اپنے قارئین کو متعارف کراتے رہے ہیں اس سہ ماہی میں جو خاص کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں امیتابھ بچن پر اور شاہ رخ خان پر نئی کتابوں کا سلسلہ جاری ہے۔

● کاویری بامزی کی تازہ کتاب Bollywood Today کا ان دنوں خاصا چرچا ہے کاویری نے یہ کتاب ان قارئین کے لیے لکھی ہے جو غیر ملکیوں میں ہندوستانی فلموں کو دیکھتے رہتے ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی فلمی صنعت کے بارے میں اس کے فلم ساز اور اداکاروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں کاویر کے خیال میں انڈسٹری پر اب بھی کچھ معروف فلمی خاندانوں کا قبضہ ہے لیکن نئے نام بھی سامنے آرہے ہیں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اب ایک لمبے عرصے تک بعض ناموں اور فلم سازوں کے منظر نامے پر رہنا ممکن نہیں رہا چونکہ بالی ووڈ میں زندگی کے عصری مسائل اور فوری نوعیت کے مسائل اور واقعات پر بھی فوری فلم بنانے کا رواج بڑھ گیا ہے اب فلم دو ہفتے بھی چل جائے تو اسے غنیمت سمجھا جاتا ہے۔

● اداکارہ نرگس نے مدر انڈیا میں اپنے بیٹے بننے والے برجو (سنیل دت) سے فلم کی نمائش کے بعد شادی کی تو بہت دنوں تک یہ واقعہ فلمی حلقوں میں موضوع گفتگو بنا رہا تھا اس کے بعد نرگس اور سنیل دت دونوں نے ہندوستانی فلمی اور سماجی زندگی میں اپنے عمل کی راہیں متعین کیں نرگس راجیہ سبھا میں اپنے شاندار کیریر کی بناء پر نامزد ہوئیں اور سنیل ایک سماجی خدمت گار کے طور پر کانگریس کے پلیٹ فارم پر ابھرے اور لوک سبھا کے ممبر بنے اس خاندان میں آج بھی عوامی نمائندگی کا یہ سلسلہ جاری ہے فلمی دنیا میں نرگس اور سنیل کا جوہر سنجے دت کے روپ میں دمک رہا ہے ۔نرگس، سنیل اور ان کے بچوں کا جیون کیا ہے ان کے ماں باپ ان کے لیے کیا تھے یہ سارا کچھ بے حد دلچسپ

انداز میں بیٹی نرمتا اور پریہ نے ''مسٹر اور مسز دت'' نامی کتاب میں لکھ دیا ہے یہ ایک طرح سے Told اور Feel آٹوبیا گرافی ہے۔

● اسی عرصے میں Donding-A Memoire کے نام سے وجنتی مالا کی سوانحی یادداشتیں بھی New Arrival کے شیلف میں رکھی ہوئی مل جاتی ہے ابھی کچھ دنوں پہلے اداکار دیو آنند کی Romance Wrilk life شائع ہوئی تھی جس میں دیو آنند نے اپنے Evergreen رہنے والے طلسم کی کنجی اپنے پرستاروں کے ہاتھ میں تھما دی تھی وجنتی مالا، ستارہ دیوی کے بعد فلم کی دوسری مقبول اداکارہ تھی جس کے پاس اپنی پسند کے ناچوں کتھک اور بھرت ناٹیم کی کلاسیکی تربیت موجود تھی تیسری مثال ہیما مالنی کی ہے تامل ناڈو کے آئینگر گھرانے کی یہ برہمن زادی فلموں میں دھماکہ بن کر آئی اور اپنے زمانے کے سب سے بڑے اداکار دلیپ کمار کے ساتھ 'مدھومتی' جیسی کامیاب فلم میں کام کرتے ہوئے ان کی ساتھ کئی فلموں کی ہیروئن بن گئی۔

وجنتی مالا نے اپنی اس سوانحی یادداشتوں میں اپنے خاندان، اپنی پسند کے رقص پر لکھتے ہوئے اپنی فلمی زندگی کا تفصیلی ذکر کیا ہے دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، کشور کمار، سنیل دت اور راجندر کمار کا ذکر خاصا دلچسپ اور ذاتی تجربات اور تعلق کی روشنی میں ہے اس کے بعد کچھ اوراق سیاسی زندگی اور پارلیمنٹ میں نمائندگی کو بھی دیے ہیں اس اعتبار سے یہ سوانحی نصف صدی سے زائد عرصے کے فلمی اور سیاسی اور ثقافتی منظر نامے کو بیان کرتی ہے۔

● ہندوستان کی تقسیم کے پہلے اور بعد کے دنوں میں ملکہ ترنم نور جہاں کے بارے میں یہ کہا گیا تھا The Finest embodiment of the composite culture of undivided India Noor Jahan The Melody Queen غیر منقسم ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے اسی تابناک مینارے کی یاد میں پاکستان کے فلم نقاد اعجاز گل نے یہ کتاب لکھی ہے کتاب اعجاز گل نے ذاتی مشاہدے کے بنا پر لکھی ہے اس کے ساتھ اس میں وہ واقعات جنھوں نے نور جہاں کو اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود سرحد پار کرنے پر اکسایا تھا تقسیم کے پہلے اور

بعد کے برسوں میں نور جہاں کی فلمی زندگی کا احاطہ کرنے والی عجاز گل کی یہ کتاب پڑھنے لائق ہے۔

خدا کے لیے

ایک پاکستانی فلم

● پچھلے دنوں گوا میں منعقد ہونے والے عالمی فیسٹول آف انڈیا 2007 میں اس بار Cinema of the world section میں پاکستانی فلم 'خدا کے لیے' کو شامل کیا گیا تھا پاکستانی ہدایت کار شعیب منصور کی اس فلم کو فیسٹول میں چار بار ناظرین کو دکھایا گیا اس کے بعد بھی عصری موضوع پر بننے والی اس Topical فلم کو دیکھنے کی پیاس پھر بھی فیسٹول میں آئے لوگوں میں باقی رہی لوگوں کو اس بات نے مایوس کیا کہ اس فلم کے ہدایت کار شعیب منصور اور ان کی ٹیم کا کوئی ممبر یہاں تک کہ فلم میں مہمان اداکار کے طور پر کام کرنے والے نصیر الدین شاہ بھی فلم کے اسکرین کیے جانے کے موقع پر موجود نہیں تھے دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے نام میں اسلامی نام جوڑ کر جو تنظیمیں دہشت گردی اور خود کش حملوں میں سرگرم ہیں یہ فلم ان کی مذمت کرتی ہے اور ایسی تمام تشدد اور دہشت بھری سرگرمیوں کی مزاحمت کرتی ہے جو انسان دشمنی کا بدترین نمونہ ہیں فلم کٹھ ملائیت اور اسلام کی انسان دوستی پر مبنی تعلیمات کو بدنام کرنے کا نوٹس لیتی ہے اور عالمی اخوت اور رواداری کے جذبے اور آدرش پر زور دیتی ہے کشادہ قلبی اور اسلام کی بنیادی روح کو اپنے عمل سے ظاہر کرنے پر بھی اصرار کرتی ہے عالمی فیسٹول آف انڈیا میں پہلی بار شریک ہونے والی اس پاکستانی فلم کو بڑی حد تک اس کے فلم ساز کا اسے ایک شخص احتجاج بھی کہا جا سکتا ہے۔

فلم پاکستان کے ایک پاپ سنگر جنید جمشید کے ایک انٹرویو سے شروع ہوتی ہے اس پاکستانی گلوکار نے پاپ سنگیت اس جواز کے ساتھ ترک کر دیا کہ یہ گائیکی اینٹی اسلام ہے اس طرح کی نوجوان سوچ کر رد کرتے ہوئے شعیب منصور نے کہا ہے کہ خدا نے انسان کو روح اور ذہن کی تازگی کے لیے سنگیت بھی عطا کیا اور مصوری بھی۔ اس لیے خدا اپنے عطا کردہ ایک عطیے کو کیوں ممنوع قرار دے گا شعیب کے خیال میں امریکہ میں ہوئے ۹/۱۱ کے واقعے کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے روشن پہلوؤں کو سامنے لایا جائے اور کٹھ ملائیت کے بجائے روشن خیالی، رواداری اور باہمی اخوت کو عام کیا جائے فلم اس سلسلے کے سارے مثبت پہلوؤں کے بڑے معقول دلائل اور قائل کر دینے والے مکالموں کے ذریعہ اپنا گہرا تاثر ناظر پر چھوڑتی ہے مثلاً نصیر الدین شاہ کا یہ ایک جملہ جو زباں زد ہوا کہ "دین میں داڑھی ہے داڑھی میں دین نہیں" یہ معقول

پسندی کی آواز کٹر ملائیت اور دہشت گردی کی حمایت کرنے والے مولانا طاہری کے دلائل کے جواب میں فلم میں بار بار اونچی ہوتی سنائی دیتی ہے۔ فلم اگر ایک طرف دہشت گردی اور خودکش دھماکوں کے ذریعے معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خون بہانے کے خلاف احتجاج کرتی ہے تو وہ ساتھ ہی ان باتوں پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو دنیا میں اس طرح کے خونی حادثوں کا سبب بنتے ہیں فلم اس سلسلہ میں برطانیہ، امریکہ اور خود پاکستان کے لوگوں سے یہ کہتی ہے کہ وہ مذہب کو اس غارت گری سے نہ جوڑیں کیونکہ کسی ایک گروہ کی غلط کاریوں کو اس عقیدے کے ماننے والی دنیا کے سر منڈھ دینا ایک غلط رویہ ہے۔ فلم اس سب کچھ کو اعتدال پسندی اور متوازن سوچ کے ساتھ ناظر کے قریب پہنچ کر اس سے مکالمہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ●●●

حضرت عیسیٰ کی زندگی پر

ایک ایرانی فلم
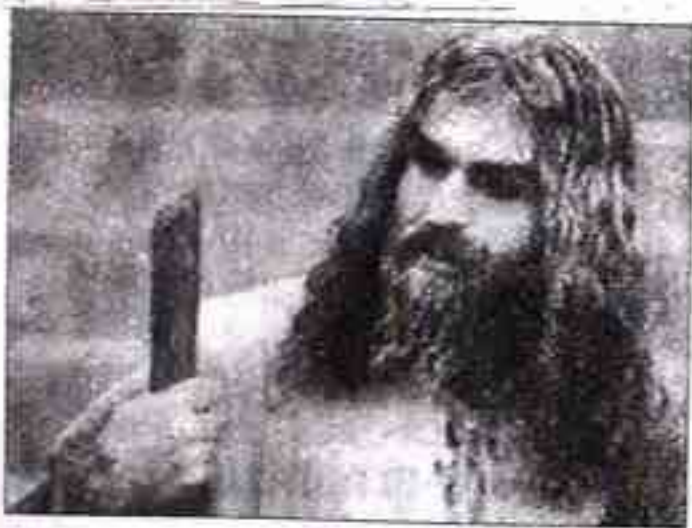
● ہالی ووڈ نے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر کئی طرح کی فلمیں بنائی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کے زندگی کے کئی حوالے ہالی ووڈ کی فلموں میں در آتے رہے ہیں لیکن یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کسی خالص اسلامی ملک نے حضرت عیسیٰ کی زندگی پر اپنے ہی نقطہ نظر سے کوئی فلم بنائی ہو ایرانی ہدایت کار نادر طالب زادے نے "Jesus the Spirti of God" کے نام سے فلم بناتے ہوئے ذہن میں یہ بات رکھی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیغمبرانہ زندگی اور ان کی پیدائش کے سلسلہ میں جو کہانی بائبل میں ملتی ہے اس کے بارے میں اسلام کا عقیدہ کیا ہے؟ اسلام اور عیسائیت کے درمیان عقیدے اور اس سے متعلق حکایات اور واقعات کا مصدقہ جو بیان بائبل اور قرآن میں ہمیں ملتا ہے فلم اس کو من وعن دونوں عقیدوں کے ماننے والوں کے سامنے سلولائیڈ کے پردے پر رکھ دیتی ہے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک زمانے سے حیات عیسیٰ، پر مذہبی نقطہ نظر سے اختلافی باتوں پر 'مناظرے' ہوتے رہے ہیں اور سچ اور صداقت کے حوالے سے جو سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں یہ فلم ان کا ایک جواب ہے نادر طالب زادہ 2004 میں بنی Mole Gibsan's کی مقبول فلم The Passion of the Christ کے معترف ہیں لیکن ان کے خیال میں اس میں سارا زور 'غلط' کو 'درست' ثابت کرنے پر ہے انھوں نے وضاحت کی کہ اسلام دنیا میں حضرت عیسیٰ کی پیغمبرانہ آمد کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ انھیں خدا کا بیٹا اور ان کے مصلوب کیے جانے کو نہیں مانتا طالب زادے نے انکشاف کیا کہ اس نے Milan جا کر Gibson سے ملنے اور اسے اپنی فلم دکھانے کی کوشش کی تھی لیکن انھیں اُسے ملے بغیر اس کی قیام گاہ سے فلم کا پرنٹ اور بروشر لے کر رخصت

کردیا گیا

ایران میں اس فلم کی پذیرائی توقع کے مطابق نہ ہو سکی کیونکہ اس فلم کو گذشتہ اکتوبر میں ریلیز کیا گیا تھا اور اُس وقت رمضان کا مہینہ چل رہا تھا اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ کی مالی مدد سے بننے والی اس فلم کو اب ایرانی ٹیلی ویژن پر 20 ایپی سوڈ میں ایک سیریل کے طور پر دکھایا جائے گا۔

ہدایت کار نے یہ اعتراف کیا کہ جہاں جہاں یہ فلم دکھائی گئی اسے اس زاویے سے عیسائی ناظرین نے پسند کیا کہ اس فلم کے ذریعے انھیں اس کا پہلی بار اندازہ ہوا کہ اسلام میں حضرت عیسیٰؑ کو کس قدر احترام سے ایک نبی کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور یہ کہ قرآن کریم میں تفصیل سے اس کرۂ ارض پر ایک نبی کے طور پر ان کی آمد اور ان کی پیغمبرانہ زندگی کا ذکر دوسرے نبیوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہے طالب زادے کے خیال میں فلم دنیا کے دو بڑے عقیدوں کے ماننے والوں، کے درمیان اختلاف کی خلیج کو کم کرنے کے مقصد میں ناکام نہیں رہی۔

●●●

روحانیت فیسٹول

● ادھر کے کئی سالوں سے ہماری ثقافتی زندگی میں صوفیانہ فکر اور سنگیت سے غیر معمولی دلچسپی ظاہر کی جارہی ہے ذہن جدید کے صفحات پر ہم نے اس نوعیت کی سرگرمیوں کو اچھی خاصی جگہ دی ہے کیونکہ ایسے زمانے میں جب کہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ''استعمال کرو اور پھینک دو'' Use and throw والا رجحان کافی بڑھ گیا ہے اور ہمیں اقدار پر مبنی معاشرے سے دور کرنے اور راتوں رات اوسط ذہانتوں کو سب کی نظروں کا مرکز بنانے کا عمل ہمارے میڈیا نے بڑے زور شور سے شروع کردیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صارف ٹھپے والے کلچر میں کسی سنجیدہ ذکر وفکر کی گنجائش نکلتی بھی نہیں اور ایسا معاشرہ زندگی کی مثبت قدروں کی پذیرائی اور ان کے چلن کو معاشرے کا حصہ بننے میں ہمیشہ رقیبانہ رول ادا کرتا ہے۔

اس سہ ماہی میں روحانیت کو موضوع بنا کر تصوف اور باطنیت کے مختلف پہلوؤں کو موسیقی کے وسیلے سے عام آدمی تک پہونچانے کا فیسٹول منعقد ہوا تو روحانیت سے لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوا فیسٹول کے آغاز سے ذرا پہلے نائب صدر جمہوریہ نے صوفیانہ کلام گانے والی گلوکارہ انیتا سنگھوی کے البم ''صدائے صوفی'' کا اجراء کیا یہ انیتا کا دوسرا البم تھا جس میں دس صوفیانہ گیت تھے انیتا کا کہنا تھا کہ صوفیانہ طرز فکر اور سنگیت دراصل خدا تک پہونچنے کا ایک زینہ ہے جب صوفیانہ خیالات اور باطنی ریاضت کا ذکر ہوتا ہے تو مولانا روم اور ان کی

مثنوی اوراُن کے خیالات کا ذکر ہونا قدرتی ہے کیونکہ مولانا رومی متصوفیانہ خیال اور پراسرار رموز باطنی کو ہم پر منکشف کرنے میں اولیت رکھتے ہیں فیسٹول کے موقع پر مولانا کی حکایات، مثنوی اوران کے خیالات کو ہندوستانی قارئین سے متعارف کرانے کے لیے انگریزی میں Greatest work of Rumi نامی کتاب منظر عام پر لائی گئی جس کا مقصد انگریزی کے حوالے سے مولانا رومی کے خیالات ترجمہ کر کے قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

روحانیت فیسٹول دلی اور ممبئی کے علاوہ اور بھی شہروں میں منعقد ہوا دلی اور ممبئی میں منعقد ہونیوالے فیسٹول میں عابدہ پروین کا ہونا تو صوفیانہ موسیقی کے اجتماعات کا ایک حسن بن گیا ہے اس بار عابدہ پروین نے اپنے ایک خاص عارفانہ موڈ میں دلی کے ایک روحانی جشن میں بے حد بے خود ہو کے گایا وہ گاتی بھی جاتی تھیں اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے پراثر جملوں میں وضاحت کرتی جاتی تھیں کہ خدا ہمارے اندر موجود ہے ہمارا کام اس کو تلاش کرنا ہے صوفیانہ کلام خدا سے ہم کلام ہو کر اس کی بارگاہ میں اپنا سب کچھ نذر کر دیتا ہے۔

پچھلے سات سال سے منعقد ہونے والے صوفیانہ فیسٹول کے روح رواں مہیش بابو اوران کی اہلیہ نندنی ہیں یہ دونوں پورے ملک کے ایسے گلوکاروں اور موسیقاروں کو مدعو کرتے ہیں جنھیں صوفیانہ کلام گانے سے شغف ہے فیسٹول میں اس بار بھی ترکی اور رایران سے آئے گروپوں نے صوفیانہ رقص کا مظاہرہ کر کے لوگوں کے دل جیت لئے یہ درویش گروپ اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو دماغ اس لیے عطا ہوا کہ وہ رواداری کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنالے دل اس لیے اسے عطا ہوا کہ وہ دنیا اور دنیا میں رہنے والوں سے محبت کرے درویشوں نے سماع کو صوفیانہ کلام اور سنگیت کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے 'حال' میں آجانے کو صوفیوں کا باطنی عمل قرار دیا اخباری رپورٹس کے مطابق دلی اور ممبئی میں 'روحانیت' فیسٹول کے سارے ہی سیشن بے حد کامیاب ہوئے اور لوگ بڑے ذوق وشوق سے فیسٹول میں شریک ہوئے ●●●

ردعمل

• تازہ شمارے (۴۷) میں اتنا کچھ قابل قدر مواد ہے کہ بشرط فرصت وقفے وقفے سے پڑھنے کے باوجود کچھ اور توجہ طلب چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ اس صورت حال کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ بعد کی پڑھی ہوئی نگارشات تو ذہن میں بچی رہتی ہیں لیکن پہلے کے نقوش مدھم پڑھنے لگتے ہیں۔

نظموں کے کچھ ٹکڑے اور چند غزلوں کے شعر جنہیں پڑھنے کے دوران میں نے نشان زد کیا تھا یہ ہیں:

خزاں کے زرد چہرے پر ہرے پتوں کی رجب ابٹن لگائی تھی......

ہم اپنی رائیگاں بیتی ہوئی اک عمر کا دفتر رفراموشی کے طاقوں میں کہیں رکھ دیں...... (زبیر رضوی)

وہ میرے جسم میں/رہتا ہے پر/مجھ سے نہیں ملتا/کہ ہم دونوں ہی/اپنی راہ کے تنہا مسافر ہیں (شاہد عزیز)

اسی سے کچھ توازن آج بھی قائم ہے مجھ میں — مرے اوپر جو اک بارِ گراں رکھا ہوا ہے
بس یہی سوچ کے افسردہ ہوا جاتا ہوں — اس خرابے سے کبھی لوٹ کے جانا بھی تو ہے
(ندیم احمد)

یوں تو ہر کاندھے پر اک چہرہ ہے لیکن — کس کے پاس ہے اپنا چہرہ کون لکھے گا
(ارشد کمال)

رونقیں شہر بسالیتی ہیں مجھ میں اپنا — آن کی آن میں سنسان بھی ہو جاتا ہوں
(شہپر رسول)

زاہدہ زیدی، شکیب ایاز، شاہد میر، یعقوب راہی، جمال اویسی، رحمان راہی نثار نیپالی، کرشن کمار طور، پروین شیر، اور راشد طراز کی تخلیقات کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

۱۸۵۷ء پر خاصا اچھا مواد آپ نے ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اور اسرار احمد آزاد کے مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں اور ان میں تجزیاتی گہرائی ہے۔ ساتھ ہی متعلقہ عصری منظومات کا انتخاب اس خاکے میں موزوں اور متناسب رنگ بھرتا ہے۔ تنقیدی مقالے سب کے سب (باقر مہدی، انیس ناگی، ابوبکر عباد، فاطمہ حسن، ندیم احمد اور اشعر نجمی) اچھے ہیں اگرچہ دو ایک میں چند اختلافی پہلو نکلتے ہیں۔ غالب پر انیس ناگی کی ایک مختصر لیکن مکمل تصنیف (غالب ایک شاعر اور ایک اداکار) بہت پہلے شائع ہوئی تھی۔ ربع صدی قبل پڑھی ہوئی کتاب کا محض ایک دھندلا سا نقش ذہن میں باقی رہ گیا ہے لیکن موجودہ مقالہ بھی ان کی سابقہ رائے سے کچھ مختلف نہیں۔ فاطمہ حسن کو فراق کی رباعیاں پسند نہیں کیونکہ ان کے بقول عورت سے فراق کی مغائرت اور نفرت کے سبب 'روپ' کی رباعیات میں تصنع کا عنصر داخل ہو گیا ہے۔ 'روح کائنات' میں بھی اٹھتر رباعیاں شامل ہیں۔ رباعی نمبر میں نیچے دیے ہوئے فراق کے نوٹ میں ان کی اپنی والدہ سے عقیدت کا بین السطور

اظہار فاطمہ حسن کی تعمیم پسندی کی نفی کرتا ہے۔ بفرضِ محال اگر ان کے دعویٰ کو تسلیم کرلیا جائے پھر بھی فراق کی رباعیات کی خوبیوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ماحول اور مزاج کے اعتبار سے یہ رباعیاں زمین سے ہم رشتہ ہیں۔ البتہ یہ طے شدہ امر ہے کہ فراق کے ہاں کہیں کہیں اصل خیالات سنسکرت یا کسی اور ادب سے مستعار لئے گئے ہیں۔ عالمی ادب میں ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ چراغ سے چراغ جلانے کا عمل نئی بات نہیں ہے۔ فراق کی غزل اور نظم میں بھی اس طرح کی بازگشت کے سراغ کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ مثلاً امروز کی ایک نظم دیکھیں (ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے کپڑے ڈھونڈتی ہے/ اور اپنی ٹوٹی ہوئی مالا چراغ پر دے مارتی ہے/ حجاب آمیز تبسم اور گھبراہٹ کے ساتھ/ وہ میری آنکھوں کو ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہے/ آہ وصال کے بعد وہ کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے) اور پھر فراق کی غزل کا یہ مشہور شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

یا پھر جیسے کہ فراق نے خود سوئنبرن (Swinburne) کے ایک مصرعے:

And blossom by blossom the spring arrives کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی نظم 'بے خبری' میں اسے یوں استعمال کیا ع: بہار غنچہ بہ غنچہ چمن میں آتی ہے۔ دونوں مثالیں ایک خلاقانہ ذہن کی صورت گری کا نمونہ ہیں اور اس تخلیقِ ثانیہ (Re-creation) سے فراق کی بڑائی کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ نیز عالمی ادب میں ہم جنس پرست ادیبوں اور شاعروں کی سیفو سے لے کر ڈبلیو ایچ آڈن تک ایک خاصی کھیپ موجود ہے لیکن صنفِ مخالف سے نفرت یا مغائرت کی بنا پر یا کسی اور فطری کمزوری کے سبب ان کا ادب مطعون نہیں قرار پاتا (ہمارے ہاں اردو میں پہلی بار افتخار نسیم کھل کر سامنے آئے ہیں اور ان کی تخلیقات جدید اردو ادب کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔) ہم انگریزی زبان کے قدآور شاعر آڈن اور کئی دوسروں (ای ایم فارسٹر، ایلز بتھ بشپ، ایڈرین رچ وغیرہ) کا مثبت انداز میں حوالہ دیتے ہوئے نہیں تھکتے۔ آخر بے چاری اردو زبان کا تخلیق کار گردن زدنی کیوں ہے؟ اگر شخصی کج رویوں کا ذکر کیا جائے تو بات بہت دور تک جائے گی۔ فراق کی شخصیت پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور وہ ایک الگ قصہ ہے۔ فاطمہ حسن بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ حالیہ چند برسوں میں انہوں نے کچھ بہت اچھے مقالے بھی قلمبند کئے ہیں۔ زیرِ نظر تحریر ان میں سے ایک ہے۔ البتہ اختلاف کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے کیونکہ اچھے ادب کا خاص فریضہ ذہن کو مہمیز کرنا ہوتا ہے قائل کرنا نہیں۔

افسانہ اب تک صرف ایک پڑھا ہے: نعیم کوثر کا 'نورنگی' اور مجھے پسند آیا۔ رتن سنگھ، طارق چھتاری، اور انیس رفیع معتبر نام ہیں۔ ان تینوں کی تحریریں ایک عرصے سے پڑھتا رہا ہوں۔

طاہر مسعود کے دونوں مصاحبے خوب ہیں۔ 'یہ صورت گر کچھ خوابوں کے' ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ان سے میری ملاقات مشفق خواجہ مرحوم۔ کے دولت کدے پر ہوئی تھی اور ان سے مل کر جی خوش ہوا تھا۔

ظ۔ انصاری مرحوم کی تحریر ہمیشہ کی طرح دلچسپ بھی ہے اور عالمانہ بھی۔ ان کی کئی تصنیفات، ادبی

تبصرے، اداریے (انتخاب: 'کانٹوں کی زبان')، اردو روسی لغت، امیر خسرو پر تیار کیئے ہوئے ان کے دوٹیپ، سب کے سب اعلیٰ درجے کی چیزیں ہیں۔ انہوں نے اردو کو اتنا کچھ دیا ہے کہ پس مرگ بھی ان کے کارناموں پر سیمنار منعقد ہونے چاہئیں۔

ذاکر حسین کو میں نے یہاں اپنے شہر آٹوا (کینیڈا) میں کئی بار قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔ طبلے پر ان کی انگلیوں کا اعجاز سحر زدہ کر دیتا ہے۔ موسیقی، مصوری، رقص، تھیٹر، اور سنیما کے متعلق 'ذہن جدید' میں تبصرہ نما خبریں پڑھتے ہوئے مجھے New Yorker کا سا مزہ آتا ہے۔ شاد باد۔ ● شاہین۔ کناڈا

● آپ کو منٹو کی یاد آئی کیسے۔ اس کے لئے پورا شمارہ وقف کر دیا مطلب یہ ہوا کہ، آج بھی لوگ منٹو کو پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی کہ آج اردو میں 'اچھے' افسانوں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اسی کمی کو لوگ منٹو کو دوبارہ پڑھ کر پوری کر لیں گے۔

منٹو پر اگر محمد خالد اختر کے مضامین مل جائیں تو ان کی اشاعت کا اہتمام کرنا۔ منٹو کے آخری دنوں میں وہ اس کے قریب تھے۔

بقول آپ کے "اپنی تخلیقی انا کو شمشیر برہنہ کی صورت میں زندہ و تابندہ رکھنے والا منٹو پاکستان میں بے حد محتاج زندگی جیتے ہوئے مرا۔" سعادت حسن منٹو سے متعلق تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔

● احمد عارف۔ بیجاپور

● منٹو کے بارے میں یہ ممکن ہے کہ ۸۰ کے بعد کے لوگوں نے اتنا کچھ نہیں پڑھا ہو جتنا کچھ 60 کے پہلے اور 60 کے بعد والوں نے پڑھا ہو۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ شمارہ نمبر ۴۸ بعد کے لوگوں کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے۔ اور یہ ایسی دستاویز ہے جو نہ صرف کسی بھی طالب علم کے کام کی چیز ہے بلکہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بھی بہت کام کی چیز ہے۔ منٹو کو سمجھنے کے لئے آپ نے اس کی تمام تر چیزیں یکجا کر دی ہیں۔

● شاہد عزیز۔ اودے پور

● قریب بائیس برس پہلے منٹو کا افسانوی ادب پڑھ لیا تھا ذہن جدید ملا تو منٹو کے ادب کی بازخوانی میں مزا آیا منٹو زندہ کہانیوں کا ادیب ہے اور اس کے کردار آج بھی ہمارے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں اور وہ آج بھی ہمارے لئے اپنی معنویت رکھتے ہیں میرے خیال میں منٹو کا ادب لافانی ان معنی میں ہے کہ جب تک علم وادب کا وجود ہے منٹو زندہ رہے گا۔ ● مراق مرزا، ممبئی

● ذہن جدید اس قدر سلیقے سے قند مکرر کے طور پر پچھلے ادب کو ہمیں پڑھنے کے لئے دیتا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے آپ کی بات میں وزن ہے۔۔ مگر چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ادبی کتابیں فروخت کرنے والا اب تو کوئی باقی ہی نہیں رہا ہاں رسالے اور اخبار کی نکاسی اب بھی ان چھوٹے علاقوں میں ممکن بنی ہوئی ہے منٹو پر جو کچھ آپ نے تازہ شمارے میں شائع کیا وہ ہمارے جیسے اردو ادب کے نئے پڑھنے والوں کے لئے بڑا انمول ہے بڑا قیمتی ہے۔ ● اجمل پاشا قادری شولاپور

الف

● اردو زبان و ادب کے بہت سے پریشان کن مسائل ایسے ہیں جن پر شاذ و نادر ہی وہ طبقہ لب کشائی کرتا ہے یا کھل کر اپنا ردعمل ظاہر کرنے کی ہمت کر پاتا ہے جس سے ہم سب ایسی توقع کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ کوئی بھی حق بیانی میں انگلیاں جلانا نہیں چاہتا سب کو یہ خوف خاموش رہنے پر مجبور رکھتا ہے کہ کہیں جلتے ہوئے مسئلے کی گرہ کشائی پر ان کا اصرار یا ردعمل انھیں ''استثنائی اور مراعاتی زون'' (Privilege Zone) سے باہر نہ پھکوا دے اس لئے وہ ایک لمبے عرصے تک اس 'عافیتی زون' کے اندر رہنے کے لئے جوڑ توڑ کرتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں وہ بھی کیا کریں کیونکہ جس نظام میں ہم سانس لے رہے ہیں اس میں فرد کا، معاشرے کا اور خود ملک کے لئے سنگین مسئلہ Survival کا ہی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ صرف اپنی ذات کے لیے جینے والے یہی وہ لوگ ہیں جو اردو والوں کی بے حسی کا ماتم کرنے والوں میں آگے آگے نظر آتے ہیں۔

ذہن جدید کے حوالے سے جتنے مسائل اور موضوعات پر لکھنے سے ہمیں سروکار بھی رہا ہے اور دلچسپی بھی اس وقت ہم اردو کے تعلق سے جس مسئلے کو تشویش اور فکر مندی کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں وہ مسئلہ سرکاری امداد پانے والے یا پھر اپنی ساکھ رکھنے والے اردو کے ان اداروں سے تعلق رکھتا ہے جو کُل یا پھر جزوی طور پر اردو کتابوں کی اشاعت کو بھی اپنی مجموعی سرگرمی اور کارکردگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔

اس مسئلے پر ہمارا ردعمل یہ ہے کہ ایسے اداروں کا بیشتر اشاعتی سلسلہ کسی بھی معیار، ضابطے، یا اصول سے بڑی حد تک عاری ہے ان اداروں کے بینر تلے کتابیں عموماً تین چار نام نہاد ماہرین یا پھر ادارے کے سربراہ کی 'قیمتی ہدایت' کی روشنی میں شائع ہوتی ہیں بعض اداروں کے سربراہ اپنی کتابوں کی اشاعت کو لازمی Mandatory بنا دیتے ہیں خواہ پڑھنے والوں کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو ایسا نہیں ہے کہ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ان اداروں کے معیار ضابطے اور مقاصد اور نشانے متعین یا مقرر نہیں ہیں وہ ہیں مگر ان کو نظر انداز کر کے کسی بھی اور کیسے ہی مواد کے حامل مسودے کو اشاعتی شیڈول کا حصہ بنا کر اہم کتابوں کے مواد کو یا کسی پرانی کتاب کی ضروری اشاعت کو التواء میں ڈال دیا جاتا ہے کیونکہ باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ورنہ کسی اکادمی کی طرف سے مسلسل دس سال انکار سننے کے بعد جب ایک ادیب اس اکادمی کا سربراہ بنتا ہے تو وہ محض اپنا سوانحی اشاریہ ۵،۶ صفحوں پر پھیلا کر ادیبوں اور کتب خانوں کے پرانے اور بدل جانے والے فرسودہ پتوں کی ڈائرکٹری کو بڑے اہتمام سے اپنے انتقامی جذبے کے تحت شائع کر دیتا ہے اردو کونسل ایک اوسط درجے کے فلم ساز کی کئی فلاپ فلموں کے اسکرپٹ کتابی صورت میں چھاپ دیتی ہے ایک قومی اکادمی کا سربراہ

اپنی امیج سازی میں اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ وہ سرکاری خرچ پر کیے جانے والے سی می ناروں میں پڑھے گئے مقالوں کو مرتب کر کے شائع کر دیتا ہے اس کا کریڈٹ خود بٹور لیتا ہے ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں ہم نے ان قومی اداروں کے گوداموں میں غیر ضروری اور ردی کے بھاؤ بکنے لائق کتابوں کے انبار لگے دیکھے ہیں ان گوداموں میں زیر حوالہ صورت حال کے لئے جو عوامل کارفرما رہے ہیں ان کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

یہ عوامل ہیں

- کتاب کی اشاعت کے فیصلے • کتاب کی نکاسی سے عدم دلچسپی • کتابوں کا غیر دلکش گٹ اپ اور طباعت
- کتب فروشوں کا دم توڑتا تجارتی ڈھانچہ • پڑھنے والوں کی ضرورت اور ان کا بدلا ہوا ذوقِ مطالعہ
- مارکٹنگ کا مستند سروے نہ ہونا • پبلشنگ کے شعبے میں معمولی اور روایتی سوجھ بوجھ رکھنے والا عملہ
- کتابوں کے میلے اور نمائشوں میں اسٹالوں پر محض ڈیوٹی نبھانے کا عمل

ایسے عوامل ہیں، جن کا جائزہ لینے اور ان کا تدارک کرنے کی فوری ضرورت ہے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں کتابی صنعت میں دوسرے نمبر کی شناخت رکھنے والے ہمارے ملک کے روشن چہرے سے اردو کی اشاعتی دنیا واقف ہی نہیں ہے کتاب کی صنعت میں ہندوستانی ناشر کے ہاتھوں پرنٹنگ کی ہر سطح پر جو انقلاب آیا ہے اس سے ہمارا ایک بھی ادارہ واقف ہوتا تو ہندوستانی پبلشنگ کے آج کے نقشے میں اردو کی اشاعتی سرگرمی محض ایک ناقابل ذکر سرگرمی بن کر نہ رہ جاتی۔ واقعہ یہ ہے کہ سرکاری ادارے یا پھر کسی قدر ساکھ رکھنے والے اردو کے اشاعتی گھر بھی پبلشنگ کے پیشہ ورانہ علم اور اس کی بھرپور جانکاری سے افسوس ناک حد تک خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک استثنا کے طور پر حکومت کے پبلی کیشن ڈویژن نے کسی قدر بیدار ذہن کے ساتھ اردو کی کارآمد کتابوں کو شائع کیا ہے کیونکہ یہاں کے کچھ بے لوث اور مخلص نوجوانوں نے اس ادارے کے مقاصد اور نشانوں کی تکمیل کے لئے خاصی عرق ریزی کی ہے ہمارے خیال میں اردو کی بے حد گدلی کر دی گئی گنگا جمنا کی آلودگی کو کنارے پر ڈھیر کر کے اسے صاف وشفاف رکھنے کی ذمہ داری ایسی ہی کمیٹڈ نسل کو سونپنی ہوگی۔

•••

عصری پینٹنگس کی نیلامی

● کچھ دن ہوئے نئی دلی کے ایک ہوٹل میں Emami Chisel Art کی طرف سے نئی پینٹنگس کی نیلامی میں آرٹ کے نمونوں کو جمع کرنے والوں کی غیر معمولی دلچسپی دیکھی گئی اس نیلامی کے لئے سب سے مہنگی پینٹنگ طیب مہتہ کی Kali III تھی طیب مہتہ کے علاوہ نیلامی میں ایم ایف حسین (صفدر ہاشمی) ایس ایچ رضا(Landscape) بھیکاس بھٹا چاریہ (Over the dark clouds)اور امرتا شیر گل والی پینٹنگس بھی رکھی گئی تھیں ان کے ساتھ ساتھ ستیش گجرال، سوزا، ہمت شاہ، گنیش پائی کی پینٹنگس بھی شامل تھیں جنھیں مختلف آرٹ گیلریوں، ذاتی ذخیروں سے حاصل کیا گیا تھا۔

نیلام کرنے والی ایجنسی نے پینٹنگس کے جینوئن اور اصلی ہونے کو یقینی بنانے کے لئے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ اس کا تصدیقی سارٹیفکٹ براہ راست آرٹسٹ سے حاصل کیا اس کی موت کی صورت میں تصویر کے اصلی ہونے کے لیے ایک بے حد مستند پینل بنایا گیا تھا تا کہ تصویر کے بارے میں بعد میں کسی اختلاف یا تنازع کی گنجائش باقی نہ رہے اس احتیاطی عمل کے علاوہ نیلام ہونے والی ہر پینٹنگ کے ساتھ ماہرین کی ایک ٹیم بھی وابستہ کردی گئی تھی تا کہ نیلامی میں بولی لگانے والوں اور تصویر کے حصول کے لئے فائنل بولی لگانے والے کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں مذکورہ ماہرین کا پینل معاونت کرے چونکہ نیلامی صرف پینٹنگس تک محدود نہ تھی اس میں مجسمے، ڈرائنگ، پرنٹس اور دوسرے عصری آرٹ کے نمونے بھی شامل تھے اس لئے اس نوعیت کے نیلام کے لئے بھی ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی تھیں Imami Chisel Art کے مطابق آنیوالے مہینوں میں کلکتہ میں آرٹ کے 89 مختلف نمونوں کا نیلام عمل میں آئے گا۔
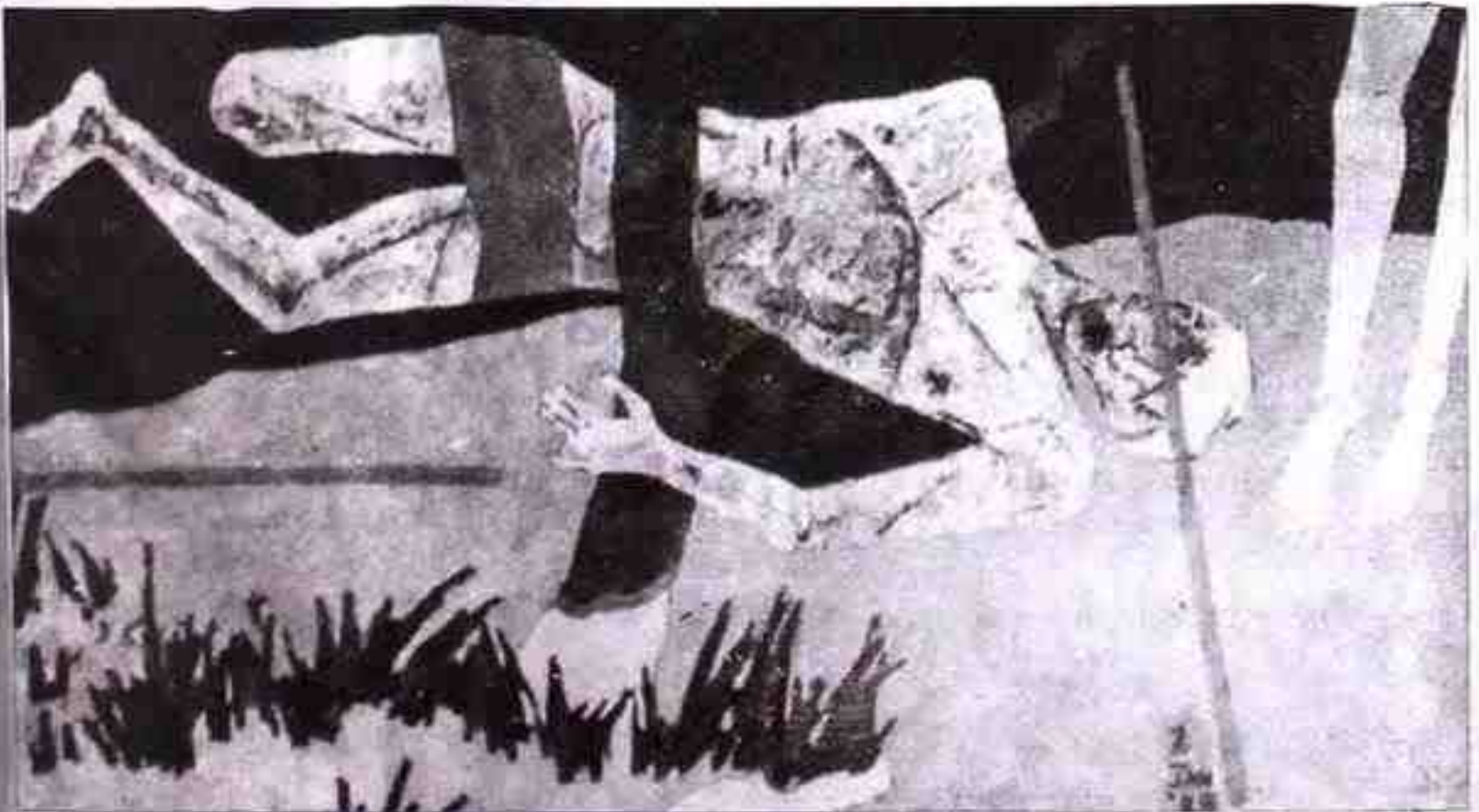
دستکاریوں کا میلہ

● دلی ایک تاریخی شہر ہے لیکن ادھر اُدھر دو دہائیوں سے اس قدیم اور تاریخی شہر کا ایک بے حد روشن اور پرکشش جو چہرہ سامنے آیا ہے وہ ہے یہاں سال بھر منعقد ہونے والے ثقافتی میلے ۔دلی کے سورج کنڈ علاقے میں تاریخی کھنڈرات کے آس پاس ہر سال جاتے جاڑوں کے موسم میں دستکاری اور دستکاروں کا میلہ لگتا ہے دلی والوں کو اس میلے کا سال بھر انتظار رہتا ہے اس بار سورج کنڈ میں پندرہ دن تک جاری رہنے والے میلے میں ملک کی مختلف ریاستوں کے 350 قومی انعام یافتہ دستکاروں نے اپنے ہنر اور شاہ کار دستکاری کے نمونوں کی نمائش کی دلی کے اس مشہور سورج کنڈ میلے میں ہر بار کسی ایک اسٹیٹ کو میلے کا مرکز نگاہ بنایا جاتا ہے اس بار مغربی بنگال کے دستکاروں کی تفصیلی نمائش کرنی تھی اس نمائش میں مغربی بنگال کی جن روایتی ہنر مندیوں کو نمایا کیا گیا تھا اس میں ڈھوکر آرٹ Horn (سینگ) آرٹ، جوٹ کی مصنوعات، صندل کی لکڑی پر نقش گری، سوتی ساڑیاں، کشیدہ کاری شامل تھیں اس کے علاوہ مغربی بنگال کے دیہی علاقوں کے جھونپڑی نما گھر کا نمونہ بھی تھا جسے پورے میلے میں خواہش مند ایک خاندان کو رہنے کے لیے دیا گیا تھا اس میلے میں دلی والے تو آتے ہی ہیں اور من پسند خریداریاں کرتے ہیں لیکن اس میلے کا بڑا مقصد اس موسم میں دنیا کے مختلف گوشوں سے ہندوستان کا رخ کرنے والے سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے آج دنیا کے مختلف بازاروں میں ہندوستانی دستکاریوں کی بڑی مانگ ہے سورج کنڈ میلے میں اپنی دستکاریوں کے بہترین نمونے لانے والے دستکار اس بات سے پوری طرح واقف ہیں اسی لیے وہ اپنے ساتھ سال بھر میں اسی میلے کے لیے تیار کی جانیوالی اشیاء کو کافی بڑی تعداد میں لاتے ہیں ایسی اشیاء میں پھلکاری، کانجی ورم، دھرماورم، اِنکت، جیسی مشہور ہنر مندیاں بھی خریداری کے لیے ملتی ہیں اس بار اہتمام یہ بھی ہے کہ برازیل، تھائی لینڈ، سری لنکا، افغانستان اور نیپال سے جو ہنر مند اور دستکار آئے انھیں ہندوستانی دستکاروں کے ساتھ مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کی فنی مہارتوں کو سمجھنے اور انھیں اپنانے کا پورا موقعہ فراہم کیا گیا●

آپ کی لائبریری کے لئے تازہ مطبوعات

شاعری

کتاب	مصنف	قیمت
● آفاق کی طرف	خلیل مامون	360.00
● بوسۂ نم	لطف الرحمٰن	200.00
● روزن سے کہکشاں	خمار قریشی	150.00
● عشق کی تقویم میں	حارث خلیق	250.00
● وابستہ	شاہین عباس	160.00
● مٹی کا مضمون	فرخ یار	150.00
● پھر وصال کیسے ہو	رخشندہ نوید	150.00
● ہیرے بھی پتھر ہیں	فاطمہ تاج	150.00
● شام ہوتے ہی	راشد انور راشد	150.00
● شہر گل شہر خوشاں	کرن کاشمیری	200.00
● منتشر لمحوں کا نور	کبیر اجمل	200.00

نثر

کتاب	مصنف	قیمت
● خیال کی مسافت	شمیم حنفی	300.00
● گزرگاہِ خیال	ساجدہ زیدی	100.00
● ادبی گفتگو	اسلم عمادی	200.00
● مراٹھی شاعری کے اردو تراجم	یعقوب راہی	120.00
● اردو دوہے۔ تنقیدی جائزہ	ظہیر غازی پوری	150.00
● افلاک — (گلبرگہ کے قلم کاروں کا انتخاب)	اکرم نقاش۔ انیس صدیقی	200.00
● خواب نامہ	نجیب محفوظ۔ ترجمہ آصف فرخی	120.00
● بے کنار (شاعری)	شمس رمزی	150.00
● سائنس سب کے لئے	ڈاکٹر عبید الرحمٰن	200.00
● سوچ آبشار (شاعری)	عبید الرحمٰن	150.00
● قریب رگ جاں (مضامین)	نفیسہ خاتون	300.00
● بزم ارباب نظر (سوانحی انشائیے)	قدیر زماں	150.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی تازہ ترین مطبوعات

فرقہ وارانہ مسئلہ مترجم: مرزا اے۔بی۔بیگ

مارچ 1931 کے کانپور فساد کی تحقیقات کے لیے انڈین نیشنل کانگریس (کراچی اجلاس 1931) کی نامزد تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کی 1933 میں اشاعت کا استقبال استعماری حکومت نے اس پر پابندی لگا کر کیا۔ یہ تلخیص اسی اہم دستاویز کی ہے۔

قیمت: 70.00 ISBN 81-237-4661-X

لندن کی ایک رات سجاد ظہیر

مذکورہ ناول ہمارے ملک کے ان اہم ناولوں میں ہے جنھوں نے نئے عہد کے تہذیبی منظر نامے کے ایک نہایت اہم پہلو پر پہلے پہل توجہ دی ہے۔ اور وہ ہے دنیا کے ایک خطے کے لوگوں کا اپنے علاقے سے نکل کر ایک اجنبی سرزمین پر بسنا اور وہاں سے مڑ مڑ کر اپنی تہذیب کو بھی نئے زاویے سے دیکھنا اور وہاں سے ایک بدلتی ہوئی عالمی صورت حال پر بھی نظر رکھنا۔

قیمت: 45.00 ISBN 81-237-4563-X

1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی مخمور سعیدی

یہ پیشکش دستنبو اور غالب کے خطوط کے حوالے سے 1857 کے حالات کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرے گی۔

قیمت 35.00 ISBN 978-81-237-5004-0

انقلاب 1857 مرتب پی۔سی۔جوشی

انقلاب 1857 جدید ہندوستان کی سیاسی تاریخ کی سب سے بڑی قومی تحریک تھی جسے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی بھی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ ہندوستانی ادب پر بھی مرتب ہوئے۔

قیمت 90.00 ISBN 978-81-237-4967-9

پھانسی لاہور کی مرتب: گرودیو سنگھ سدھو مترجم: راحت جبیں

'پھانسی لاہور کی' امر شہید بھگت سنگھ کی شہادت کو موضوع بنا کر لکھی گئی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو جنگ آزادی کے دوران لکھی گئیں۔

قیمت: 40.00 ISBN 978-81-237-4947-1

قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیاں (تیسری طباعت)

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا کینوس بے حد وسیع ہوتا ہے جس میں برصغیر کی تاریخ اور تہذیب کا پس منظر ہوتا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں شامل افسانے آپ کی فکر و فن کے نادر نمونے ہیں۔

قیمت: 55.00 ISBN 81-237-1247-2

اندرا گاندھی اندر ملہوترا مترجم: مرزا اے بی بیگ

ہندوستان کی عظیم ترین وزیر اعظم کی زندگی اور ان کے عہد پر ایک نہایت عمدہ پیشکش۔ ISBN 81-237-4854-X: 75.00

بازار حسن پریم چند

بازار حسن میں عورت کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں فحاشی، عیاری اور بے حیائی سے اجتناب کی دعوت فکر و عمل ہے۔

قیمت 110.00 ISBN 81-237-4337-1

چوگان ہستی پریم چند

ناول چوگان ہستی ہندوستان کی مکدر سیاسی صورت حال اور سعی و عمل کی ترجمانی کرتا ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ عدم تشدد واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ اس ناول کا اہم کردار سورداس فلسفہ عدم تشدد اور گاندھی جی کی طرح ہی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی علامت بن جاتا ہے۔

190.00 ISBN 81-237-4558-3

اردو ڈرامے کا سفر (آزادی کے بعد) مرتبہ: زبیر رضوی

اس انتھالوجی میں کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، محمد مجیب، حبیب تنویر، جاوید صدیقی، ساگر سرحدی، گیتانجلی شری اور سید محمد مہدی کے مقبول اسٹیج ڈرامے یکجا کر دیے گئے ہیں یہ انتھالوجی اس صنف میں اردو کی پیش رفت کا آئینہ ہے۔

قیمت 125.00 ISBN 978-81-237-5048-4

وادیٔ خیال (آزادی کے بعد اردو نظم و غزل) مرتبہ: مخمور سعیدی

یہ انتخاب اس لئے منفرد ہے کہ اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل ہیں وہ اردو کی تخلیقی شاعری کا بے حد روشن چہرہ ہمارے روبرو رکھتی ہیں۔

قیمت 100.00 ISBN 978-81-237-2

مزید جانکاری کے لیے لکھیں: منیجر (سیلز اینڈ مارکیٹنگ)
نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ اے۔5، گرین پارک، نئی دہلی۔110016
Phones: 26564020, 26568052, Telefax: 91-11-26512588

CONG.

S.P

Keshav-

بہ شکریہ ہندو

PERSONS WITHOUT A BHARAT RATNA
OR A NOBEL STILL INSPIRE US.

Keshav-